آئینہ نما

۹

قرۃ العین

معروشا (ماس کمیونیکیشن کی طالبہ) کشمیر ٹائمز کا شمیم احمد شمیم ایوارڈ لیتے ہوئے

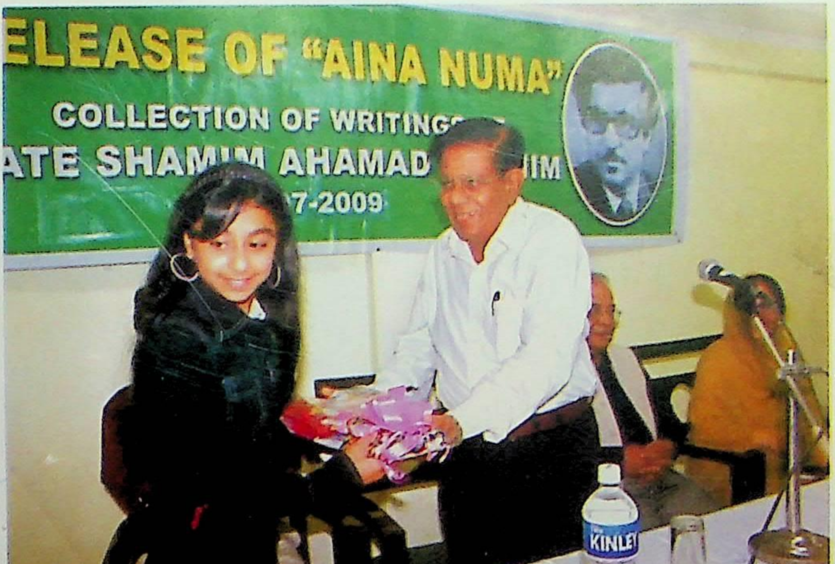

آئینہ نما (۸) کے شمارے کی رسم اجراء کی چند جھلکیاں

آئینہ نما

(۹)

مرتب

قرۃ العین

جُملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب: آئینہ نما

مرتب/ ناشر: قرۃ العین

پتہ: باغات برزلہ، نزدیک بون اینڈ جوئنٹ
ہسپتال برزلہ سرینگر
فون: 9419015745/2433795

کمپیوٹر کمپوزر: محمد شفیع
فون: 9797101561

سرورق: جی احمد

سال اشاعت: ۲۰۱۱ء

قیمت: عام ایڈیشن =/300
لائبریری ایڈیشن =/400

فہرست

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
۱/	اپنی بات	۷
۲/	پیغامات	۱۱
۳/	مسئلہ کشمیر- چراغ بیگ کی نظر میں	۱۷
۴/	مفادِ خصوصی	۲۳
۵/	رشوت کی اقسام	۲۸
۶/	بدعنوانیوں کا عنوان	۳۴
۷/	چور اور شہری آزادی	۴۰
۸/	وشوامتر سے ڈاکو مان سنگھ تک	۴۵
۹/	کمنٹری کے دیوانے، کرکٹ سے بیگانے	۵۰
۱۰/	ڈی پی صاحب روٹھ نہ جائیے	۵۵
۱۱/	"شیر کشمیر نمبر" بد سلیقگی کا شاہکار	۶۱

۱۲/	خصم ہے نگوڑا کہ دل کا زخم	۶۷
۱۳/	ہم سب کام چور ہیں	۷۳
۱۴/	شیخ صاحب سے شفیع سمنانی تک	۸۱
۱۵/	ووٹ کتروں سے خبردار رہیے	۸۷
۱۶/	مداخلت کاروں کا بادشاہ	۹۴
۱۷/	اپنے منہ میاں مٹھو	۹۸
۱۸/	اسمبلی میں تعلیم بالغاں	۱۰۴
۱۹/	تیرے در پر آیا سوالی خیرات دے دینا	۱۰۹
۲۰/	گولوالکر اور محاذ کی ساجھے داری	۱۱۶
۲۱/	چور کا بھائی گرہ کٹ	۱۱۹
۲۲/	کشمیری نیشنلزم	۱۲۵
۲۳/	رنگ ساز......قِرمزی باز اور ستار نواز	۱۳۱
۲۴/	چالیس لاکھ ضرب چار	۱۳۷
۲۵/	چراغ بیگ کا خط	۱۴۴
۲۶/	چھوٹی چھوٹی باتیں	۱۵۰
۲۷/	کشمیر کو بچاؤ	۱۵۵
۲۸/	نیشنل کانفرنس کا کچا چِٹھا	۱۶۱
۲۹/	کشمیری کلچر کے ٹھکیدار	۱۶۷

۳۰/	سرینگر کی لڑائی	۱۷۴
۳۱/	اُردو کا قاعدہ	۲۶۳
۳۲/	(۲)	۲۶۹
۳۳/	پارلیمنٹ-ایک تعارف	۲۷۳
۳۴/	پارلیمنٹ (۲)	۲۸۳
۳۵/	پارلیمنٹ (۳)	۲۹۱
۳۶/	اگر	۲۹۹

☆

''فرقہ پرستی ہر حال میں لعنت ہے چاہے وہ
ہندو فرقہ پرستی ہو یا مسلم فرقہ پرستی۔ لیکن کشمیر میں
ہندو فرقہ پرستی کا کوئی منطقی، اخلاقی اور نفسیاتی جواز ہی
موجود نہیں۔ مسلم فرقہ پرستی تاریخی حادثات اور سیاسی
تضادات کا پیدا کردہ روگ ہے۔ اس کا علاج کیا
جاسکتا ہے۔ لیکن ہندو فرقہ پرستی ایک ایسا ناسور ہے
جو مسلم فرقہ پرستی کو بھی لاعلاج بنادے گا۔ کشمیری
پنڈت بھائیوں کو اس مسئلے پر سوچنا چاہیے''۔

☆

اپنی بات

آئینہ کے اس شمارے کے لیے بھی مواد کے انتخاب میں مجھے خاصی مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ اس لیے کہ اب تک کے شماروں کے منظر عام پر آنے کے طفیل ایک اہم اور قابلِ ذکر بات یہ ہوئی ہے کہ بہت سے کرم فرماؤں اور بہی خواہوں نے اپنی تحویل میں رکھی آئینہ کی بیشتر تحریریں میرے حوالے کر دیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ان تحریروں کا بہترین مصرف یہی ہے کہ انہیں آئینہ نما کی زینت بنایا جائے۔ یوں میرے پاس موجود آئینہ کے مواد میں اچھا خاصا اضافہ ہوا ہے۔ اس ضمن میں قابل ذکر مواد وہ ہے جو کشمیر یونیورسٹی کے چیف لائبریرین جناب ریاض رفاعی نے فراہم کیا ہے اس کے لیے میں ان کی بہت مشکور ہوں۔ اس میں کچھ اہم شخصیات ،ادب پارے اور تیسرا صفحہ بقلم چراغ بیگ شامل ہے۔

آئینہ کے ابتدائی ایام میں ہی چراغ بیگ کا کالم تیسرا صفحہ، ایک مخصوص اور منفرد مقام بنا چکا تھا اور اس کی مقبولیت کو مدِ نظر رکھ کر اسے چراغ بیگ نے روزنامے میں بھی جاری رکھا۔ تیسرا صفحہ عوامی عدالت کا روپ تھا، جہاں زندگی

سے وابستہ تمام شعبوں کے مسائل کو زیر بحث لایا جاتا۔ ادنیٰ سے اعلا سرکاری آفیسر، عوامی رہنما اور ارباب اقتدار کی زیادتیوں، لاپرواہیوں، لغزشوں اور غفلت شکاری کو بے نقاب کر کے ان پر فرد جرم عائد کی جاتی۔ آج بھی جب کہیں آئینہ کا ذکر ہوتا ہے تو سب سے پہلے تیسرے صفحہ، کو ہی یاد کیا جاتا ہے۔

آئینہ نما، کا پہلا شمارہ بحیثیت مجموعی تیسرے صفحہ، پر ہی مشتمل تھا، مگر اب بھی یہ مواد خاصی تعداد میں موجود ہے اور اس لیے اسے ایک بار پھر اس شمارے میں جگہ دی جارہی ہے اس کے علاوہ اس شمارے میں اس معرکہ خیز اور ہنگامہ پرور پارلیمانی الیکشن کی داستان ہے جسے شمیم صاحب نے سرینگر کی لڑائی کا عنوان دیا ہے۔ یہ داستان کشمیر کی تاریخ میں ایک ایسے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے جس نے کشمیر کی تاریخ کا رخ بدل دیا۔ ابتدا سے لے کر آخر تک یہ کہانی زبان وبیاں، حالات وحقایق کے اعتبار سے ایک شاہکار تو ہے ہی لیکن اس لڑائی نے اس عام تاثر کو بھی زبردست تقویت بخشی ہے کہ مسئلہ کشمیر کے تیئں ہندوستانی قیادت کا رویہ ہمیشہ سے غیر سنجیدہ، نامعقول، نامناسب اور قابلِ اعتراض رہا ہے۔ اٹوٹ انگ اور ناقابل تنسیخ قرار دیے جانے کے باوجود ہندوستانی جمہوریت، سیکولرازم، اور آئین میں دی گئی ضمانتوں کا اطلاق کشمیر پر ضروری نہیں سمجھا گیا۔ الحاق کے آئینی اور قانونی پہلوؤں کو مضبوط سے مضبوط بنانے کی کوششوں میں کشمیریوں کے جذبات، خواہشات امنگوں اور خدشات کو قطعی نظر انداز کیا گیا۔ اور یہ سلسلہ نہ صرف ابھی تک جاری ہے بلکہ اس میں شدت لائی جارہی ہے۔

پارلیمانی انتخابی معرکے کے دوران شمیم صاحب کو بے پناہ مصائب اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ابتدائی مرحلے سے لے کر آخری دم تک بھرپور عوامی حمایت کے باوجود سرکاری سطح پر مزاحمت اور دھاندلیوں نے قدم قدم پر ان کی راہ میں روڑے اٹکائے۔ ان کے سیاسی کارکنوں کو بلاوجہ گرفتار کیا گیا۔ جلسے جلوس میں شامل لوگوں کو ہراساں کیا گیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سرکاری مشینری پر سے ان کا اعتماد متزلزل ہوگیا اور انہیں اس تلخ حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا کہ ریاست جموں و کشمیر میں نتائج کا آخری اعلان ہونے تک کوئی بات آخری اور قطعی نہیں سمجھی جاسکتی۔ گزشتہ سولہ سترہ برسوں میں ایک نہیں کئی بار کامیاب امیدواروں کو ناکام اور ناکام امیدواروں کا کامیاب قرار دینے کی روایت موجود ہے۔ ریاست میں کالے قوانین کی موجودگی کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ گزشتہ دو دہائیوں میں ان میں اضافہ ہوگیا ہے اور آج ساری ریاست میں ان قوانین کے خلاف شدید عوامی مزاحمت جاری ہے۔ آج سے چالیس برس قبل شمیم صاحب نے ان قوانین کی زد میں آکر ان کے خلاف زبردست احتجاج کرتے ہوئے اس بات کا انکشاف کیا تھا کہ ریاست جموں و کشمیر ملک کی واحد ریاست ہے جہاں کالے قوانین کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ انہیں گننا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ صورت حال آج بھی جوں کی توں ہے اور کشمیر کی گتھی روز بہ روز الجھتی ہی جارہی ہے اور اس کی تمام تر ذمہ داری بلاشک وشبہ ہندوستان کی سیاسی قیادت پر عائد ہوتی ہے۔

"پارلیمنٹ کا تعارف" ایک مختصر مگر اہم سیاسی اور تاریخی دستاویز ہے جس میں اس دور کی اہم پارلیمانی شخصیات، ان کے سیاسی عقائد، طرزِ عمل اور قومی سطح پر ان کے مقام کی مکمل اور جامع تصویر کشی ہے۔ سیاست اور تاریخ کے طالب علموں کے لیے یہ پارلیمانی موازنے کا ایک موثر اور مفید وسیلہ ہے۔

"چھوٹی چھوٹی باتیں" کے عنوان کے تحت بظاہر چھوٹی باتوں کا ذکر ہے مگر یہ متن موضوع کے لحاظ سے زبردست اہمیت کا حامل ہے۔ باتیں چھوٹی ہیں مگر ان میں بڑے مقاصد اور انسانی فطرت اور عظمت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

مفادِ خصوصی میں اس تکلیف دہ حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ہندو پاک کے درمیان جب بھی تعلقات بہتر ہونے کی صورت نظر آتی ہے تو دونوں ملکوں کا ایک خاص طبقہ، سراسیمہ ہوکر ان کوششوں کے خلاف صف آرا ہو جاتا ہے۔ یہ روایت آج بھی برقرار ہے اور آج جب بھی ایسی صورتِ حال پیدا ہوتی ہے یہ طبقہ پوری طرح لیس ہوکر سرگرم ہو جاتا ہے۔

"مخصوص پوزیشن" ریاست کی دفعہ ۳۷۰ کی بگڑی ہیئت پر بڑا لطیف مگر گہرا طنز ہے۔ آئینہ نما کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا آپ کی رائے کی منتظر رہوں گی۔

فقط

قرۃ العین

☆

پیغامات

''آئینہ'' کی تیسری سالگرہ کے موقع پر ریاست کے اربابِ حکومت اور اہلِ سیاست نے ادارے میں مندرجہ ذیل پیغامات بھیجے ہیں یہ پیغام بھیجنے والوں میں سے کسی نے اپنے پیغام پر اپنے دستخط ثبت نہیں کیے ہیں جس سے یہ شک کرنے کی گنجائش باقی رہتی ہے کہ نقل مطابق اصل نہیں ہے۔ پھر بھی ہر پیغام میں بھیجنے والے کی شخصیت کا ایک ہلکا سا عکس ضرور نظر آتا ہے۔

سید میر قاسم صدر پردیش نیشنل کانگریس:۔

''آئینہ'' اپنی زندگی کے تین سال مکمل کر کے اب چوتھی منزل میں قدم رکھ رہا ہے۔ اس سے زیادہ منحوس خبر پچھلے کئی دنوں سے سننے میں نہیں آئی تھی۔ سالگرہ کے موقع پر نیک دعائیں دینے کی رسم ہے۔ سو میں اس موقع پر اپنی نیک خواہشات بھیج رہا ہوں۔ لیکن دل ہی دل میں یہ دُعا کر رہا ہوں۔ کہ ''آئینہ'' اور صاحب ''آئینہ'' کو یا تو کانگریسی بنا دے یا پھر اس دنیا سے اٹھا دے۔

بخشی غلام محمد صدر نیشنل کانفرنس:۔

''آئینہ'' اپنی تیسری سالگرہ منا رہا ہے۔ اس سے بڑھ کر میرے لیے خوشی کی کیا بات ہوسکتی ہے۔ ایک ہی تو اخبار ہے جو ان دنوں میرے کلیجے کو

ٹھنڈک پہنچاتا ہے (اگرچہ کمبخت اخبار نے میرا کلیجہ جلایا بھی ہے) اس اخبار میں صرف ایک بُرائی ہے کہ یہ ضرورت سے زیادہ انڈی پینڈنٹ ہے۔ اِس لیے کبھی کبھی ارباب حکومت کے خلاف لکھتے ہوئے مجھ پر بھی وار کر جاتا ہے جو کسی اعتبار سے مستحسن قرار نہیں دیا جاسکتا "آئینہ" آج کل میرا امن پسند اخبار ہے۔ لیکن اگر مجھے کبھی اِقتدار نصیب ہو، تو میں سب سے پہلے اِس کا گلا گھونٹ دوں گا۔ وجہ سب کو معلوم ہے۔ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

درگا پرشاد در وزیر خزانہ:۔

"آئینہ" بہت دنوں سے مجھ سے "بے توجہی" برت رہا ہے۔ وجہ سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ غالباً پھر بھرپور حملے کی تیاری کر رہا ہے۔ تیسری سالگرہ کے موقع پر کیا پیغام دوں۔ سچی بات کہنا نہیں چاہتا۔ (کئی سال سے سچ بولنے کی عادت بھی چھوٹ گئی ہے) جھوٹی بات کہہ کر شرمندہ نہیں ہونا چاہتا۔ کرسٹوفر کاڈویل نے کہا ہے کہ وزیر خزانہ کو کبھی سچ بولنے کی حماقت نہیں کرنا چاہیے۔ اِس لیے بھی مجھے سچ کہنے سے پرہیز کرنا پڑے گا۔ "آئینہ" کو میں ایک اخبار نہیں ایک فتنہ سمجھتا ہوں۔ ہوم منسٹر کی حیثیت سے میں نے کئی بار اِس فتنے کا سر کچلنا چاہا تھا، لیکن صادق صاحب کو یہ سانپ عزیز ہے۔ اب تو صاحب آئینہ ممبر اسمبلی بھی ہو گئے ہیں۔ یہ قاسم صاحب کی حماقت ہے میں ہوتا تو قیامت تک اُسے کامیاب نہ ہونے دیتا۔

خواجہ شمس الدین نائب صدر پردیش کانگریس:۔

ہم "آئینہ" کی موت کے طلب گار تھے، کہ "آئینہ" کی تیسری سالگرہ

کا دعوت نامہ موصول ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب ہماری دعاؤں میں اجابت نہیں رہی۔ تیسری سالگرہ کے موقعہ پر پیغام دینے سے پہلے قاسم صاحب سے پوچھنا پڑے گا۔ اخبار اچھا ہے، خاص طور پر اِس کی زبان بہت اچھی ہوتی ہے لیکن خیالات بہت گھٹیا اور سطحی ہوتے ہیں۔ اِس اخبار کو نہ بزرگوں کا پاس ہے اور نہ ذی عزت لوگوں کا لحاظ بہتر ہوتا اگر اسے بند ہی کر دیا جاتا۔

پیر غیاث الدین وزیر صنعت وحرفت:۔

"آئینہ" اخبار نہیں بکواس ہے اِس کا کام شریفوں کی پگڑی اُچھالنے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اسے میرے خلاف کون اِستعمال کر رہا ہے میں ان بورژوا عناصر کی پرواہ نہیں کرتا۔ کارل مارکس نے کہا ہے کہ مارکسزم کے ماننے والوں کو اخبار نہیں پڑھنا چاہیے۔ اِسی لیے میں نے پچھلے دس برسوں سے اخبار کی شکل بھی نہیں دیکھی، اب رہی "آئینہ" کی بات وہ میں اِس لیے پڑھتا ہوں کہ میں اسے ایک اخبار نہیں ایک چیتھڑا سمجھتا ہوں اور چیتھڑے کے بارے میں کارل مارکس خاموش ہے۔

علی محمد طارق ممبر راجیہ سبھا:۔

"آئینہ" ایک اچھا اخبار ہے۔ لیکن اس میں اور اچھا ہونے کی صلاحیت موجود ہے۔ میرے نزدیک اِس اخبار کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اِس میں میری تقریریں شائع نہیں ہوتیں۔ حالاں کہ میری تقریریں امریکہ کے ٹائم میگزین میں بھی شائع ہوتی ہیں۔ میں خود بھی بہت بڑا جرنلسٹ رہا ہوں۔ اس لیے دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ "آئینہ" جبھی

کامیاب رہ سکتا ہے جب یہ بڑے آدمیوں کی تقریریں چھاپے'' آئینہ'' کا گٹ اپ مجھے پسند نہیں ۔ میں اگر چہ اِس اخبار کو باقاعدگی سے پڑھتا ہوں ۔لیکن ابھی تک چندہ عطا کرنے کی توفیق نہیں ہوئی ہے۔تیسری سالگرہ کے موقع پر میں اپنی وہ تقریر بھیج رہا ہوں ، جو میں نے ابھی حال ہی میں راجیہ سبھا میں اِرشاد فرمائی ہے۔

پریم ناتھ ڈوگرہ پردھان جن سنگھ :۔

اخبار'' آئینہ'' پڑھتا ہوں ۔اخبار اچھا ہے۔لیکن اِس کی پالیسی مجھے پسند نہیں ۔اخبار میں ظاہر کیے گئے خیالات بھی صحت مند معلوم نہیں ہوتے۔ ایسا لگتا ہے کہ اخبار کے ایڈیٹر صاحب کو جن سنگھ سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ جس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اخبار دراصل اندر سے پاکستانی ہے۔اخبار جموں و کشمیر کو اندرونی خود مختاری دینے کے حق میں بھی ہے۔جس سے ثابت ہوتا ہے کہ بنیادی طور پر شیخ عبداللہ کا حامی ہے۔تیسری سالگرہ کے موقع پر اپنی نیک خواہشات بھیجتا ہوں اور پرماتما سے پرارتھنا کرتا ہوں کہ'' آئینہ'' بھی آرگنائزر کی راہ پر چل کر بھارت ماتا کی سیوا کرے۔

غلام قادر میر صدر آل جموں و کشمیر محاذ رائے شماری:۔

اخبار'' آئینہ'' اپنی تیسری سالگرہ منا رہا ہے۔بہت اچھی بات ہے۔ میں اپنی طرف سے اور اپنی جماعت کی طرف سے اِس موقع پر بہترین دُعاؤں اور نیک خواہشات کا پیغام بھیجتا ہوں ۔آپ کو معلوم ہے کہ کشمیری عوام آج عرصہ بیس سال سے حق خود ارادیت کی لڑائی لڑ رہے ہیں اور ہمارے

محبوب رہنما جناب شیر کشمیر فخر کشمیر سالہا سال سے جیل کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں..........وغیرہ وغیرہ پیغام بہت طویل ہے باقی آیندہ)

نام نا معلوم صدر عوامی ایکشن کمیٹی:-

اگرچہ اخبار "آئینہ" نے کبھی ہماری تنظیم کی کاروائی شائع نہیں کی ہے۔ تاہم تیسری سالگرہ کے موقع پر میں اپنے رفقاء کی طرف سے مبارکباد بھیجتا ہوں۔ اس بات کا افسوس ہے کہ آپ نے جہاں کئی مرتبہ شیخ صاحب کی رہائی کا مطالبہ کیا ہے وہاں میر واعظ کشمیر مولوی محمد فاروق صاحب کے بارے میں آپ نے کچھ نہ لکھا جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ میر واعظ کشمیر جناب مولوی فاروق صاحب کشمیری عوام کو حق خودارادیت......وغیرہ وغیرہ (پیغام بہت طویل ہے، باقی آئندہ)

سکندر نیوز ایجنٹ امیراکدل:-

"آئینہ" اپنا تیسرا جنم دن منا رہا ہے۔ مدیر "آئینہ" کو بہت بہت مبارک۔ آئینہ کی کامیابی سے اپنی کامیابی بھی وابستہ ہے۔ میں بھی چار پیسے کما لیتا ہوں۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ کچھ عرصہ سے منیجر صاحب نے ہمیں اخبار دینا بند کر دیا ہے۔ ان کو شکایت ہے کہ ہم نے پچھلی رقم ادا نہیں کی ہے۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اس چھوٹی سی بات کے لیے ہمیں اخبار بند کر دیا جائے۔ آخر اِس ملک میں کون ہے جو پچھلی رقم اُدا کرتا ہے۔ ہم ہی نے کیا قصور کیا ہے۔ امید ہے کہ پچھلی رقم کے مخمصے میں پڑے بغیر آپ ہم کو باقاعدگی سے اخبار بھیجتے رہیں گے۔

غلام حسن نحوی میونسپل مجسٹریٹ سرینگر :-

''آئینہ'' اپنی تیسری سالگرہ منا رہا ہے اور میں اپنی قسمت کو رو رہا ہوں۔ پچھلے چار ماہ سے خدائے ذوالجلال سے گڑگڑا کر دعائیں مانگ رہا ہوں کہ مدیر ''آئینہ'' پر بجلی گر پڑے اس کا ہاتھ ٹوٹ جائے۔ اس کی نگاہوں کی بینائی چھن جائے۔ لیکن اِن دعاؤں کا اثر یہ ہوا کہ ''آئینہ'' اپنی تیسری سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منا رہا ہے سوچتا ہوں کہ میری دعاؤں میں وہ پہلی سی اجابت کیوں نہیں رہی۔ مدیر ''آئینہ'' میری بے پناہ ایمانداری کے باوجود ممبر اسمبلی بن گئے۔ اِس کا تا قیامت افسوس رہے گا۔ ''آئینہ'' کا یہ احسان میں زندگی بھر نہ بھولوں گا کہ اِس نے مجھے لافانی بنا دیا۔ اگلی نسلیں میرے بارے میں جان کر عبرت حاصل کریں گی۔

رائے دہندگان شوپیان :-

ہم سے بہت بڑی غلطی سرزد ہوگئی کہ شمیم احمد شمیم کو ووٹ دے کر ممبر بنا دیا۔ اب نہ ''آئینہ'' دیکھتے ہیں اور نہ صاحب ''آئینہ'' کہیں نظر آتے ہیں۔ انتخاب سے پہلے کہتے تھے کہ یہیں مروں گا اور یہیں جیوں گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جئیں گے تو سرینگر میں اور دفن ہونے کے لیے یہاں آئیں گے۔ ''آئینہ'' جولائی میں اپنی سالگرہ منا رہا ہے۔ ہم فروری میں اپنی حماقت کی سالگرہ منائیں گے۔

☆

جون ۱۹۶۴ء

مسئلہ کشمیر...... چراغ بیگ کی نظر میں

چراغ بیگ کا مذہب کیا ہے؟ اس کی سیاست کیا ہے؟ وہ کس سیاسی جماعت کا رُکن ہے اور کس مکتب فکر سے تعلق رکھتا ہے؟ وہ ہندوستانی ہے یا پاکستانی؟ کانگریسی ہے یا محاذی؟ قوم پرست ہے یا فرقہ پرست یا کمیونسٹ؟ اس کا لیڈر کون ہے؟ اس کی صحافت کا مقصد کیا ہے؟ اس کا خطاب کس سے ہے؟ اس کے وجود کی غایت کیا ہے اور اس کا مسلک کیا ہے؟ یہ اور اسی نوعیت کے کئی سوالات پچھلے ایک سال میں بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہوگئے ہیں۔ بعض لوگوں نے اپنی تسکین کے لیے چراغ بیگ سے بھی رجوع کیا لیکن اکثر لوگوں نے ''آئینہ'' میں چراغ بیگ کی نگارشات کو بُنیاد مان کر فتوے صادر کیے ہیں۔ فرقہ پرستوں نے اسے لادینی جمہوریت کا نقیب قرار دیا۔ قوم پرستوں نے اسے کمیونسٹ ہونے کا طعنہ دیا۔ محاذ رائے شماری نے اسے سرکاری ایجنٹ قرار دیا۔ نیشنل کانفرسیوں نے کانگریسی اور کانگریسیوں نے نیشنل کانفرنسی۔ ''آئینہ'' کی پچھلی اشاعت ۱۵رمئی میں چراغ بیگ نے کچھ ایسی کڑوی کسیلی باتیں کہیں کہ بہت سے ترقی پسند دوست اس سے مایوس

ہو گئے۔ اور سرکاری ایوانوں میں اس کی ''خطرناکی'' کا چرچا ہونے لگا۔ ایک غیر مصدقہ اطلاع کے مطابق وزیر ڈی آئی آر نے چراغ بیگ کو پاکستانی ایجنٹ ثابت کرنے کے لیے اپنی تمام تر صلاحیتیں داؤ پر لگا دی ہیں اور عجب نہیں کہ کسی دِن ''چشمِ یار'' کی شہ پا کر مُلک کا قانون سکیولرازم کے سب سے بڑے علم بردار چراغ بیگ کو پاکستانی ہونے کے جُرم میں گرفتار کرلے (ایک بار وزیر موصوف کے حکم سے ایک ''پاکستانی'' کو جن سنگھی ہونے کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا تھا)۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا ، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

ریاست کی سیاسی جماعتیں اور لیڈر چراغ بیگ کے بارے میں کیا سوچتے ہیں، اس کی چراغ بیگ کو قطعاً کوئی پروا نہیں۔ نیشنل کانفرنس اور ریاست کے حکمران اس کی نسبت کیا رائے رکھتے ہیں اس کو وہ خاطر میں نہیں لاتا۔ لیکن ''آئینہ'' کا ہر وہ قاری جو اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی میں سے ہر ہفتے ۲۰ پیسے صرف کر کے اخبار خریدتا ہے، یہ جاننے کا حق رکھتا ہے کہ میری سیاست کیا ہے؟ میری صحافت کا مقصد کیا ہے؟ ''آئینہ'' کی پالیسی کیا ہے؟ اور میرا مخاطب کون ہے؟ اسی لیے میں نے آج اپنے بارے میں بات کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اپنے بارے میں بات کرنا بظاہر بہت آسان ہے لیکن در حقیقت بڑا ہی مُشکل کام ہے۔ چراغ بیگ کو اپنے قلم کی صداقت پر اعتماد ہے، اس لیے وہ اس مُشکل کو بھی حل کردے گا!

چراغ بیگ سیاست دان تو نہیں لیکن سیاست کا طالب علم ضرور ہے۔ دُنیا کے ہر مسئلے پر اس کی اپنی ایک رائے ہے۔ وہ کسی لیڈر، کسی مرشد یا کسی ذہنی قائد کے خیالات اور نظریات دہرانے پر یقین نہیں رکھتا۔ اس کا ذہنی نشو ونما اس ماحول میں ہوا ہے جہاں صرف ''تشکیک'' کی راہوں سے گزر کر رہی ''ایقان'' کی منزل تک پہنچا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نظریات اور مسلمات کو اس لیے قبول نہیں کرتا کہ وہ کسی بہت بڑے لیڈر کے فرمان ہیں یا کسی سیاسی جماعت کے منشور میں شامل ہیں۔ وہ جب تک خود نظریات کی صحت پر ایمان نہ لائے انہیں اپنا جُزوِ ایمان نہیں بناتا۔ وہ اپنے لیے سوچنے کا فریضہ کسی مذہبی رہنما، کسی سیاسی قائد یا کسی وزیر کے سُپرد نہیں کرتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کے اندازِ فکر (انداز کی بات کر رہا ہوں فکر کی نہیں) میں انفرادیت کی آن اور بغاوت کی شان ہے۔ اس میں اتفاق کی ہمّت بھی ہے اور اختلاف کا حوصلہ بھی!

یہ اندازِ فکر، یہ انفرادیت اور یہ ذوقِ بغاوت بظاہر ذہنی سہل انگاری اور فکری بے راہ روی کی نشانیاں ہیں۔ یہ راستہ بظاہر بڑا ہی ہموار اور صاف ہے، اس میں کسی قسم کے ذہنی ڈسپلن کی ضرورت نہیں۔ بعض کٹر قسم کے مُلاّ اسے ابلیس کی ''آزادیٔ افکار'' سے تعبیر کریں گے اور کچھ ترقی پسند اسے بورژوا ذہنیت کے عنوان سے پُکاریں گے لیکن یہ سفر اتنا آسان نہیں جتنا بادی النظر میں دکھائی دیتا ہے۔ جماعتوں اور تنظیموں کے ممبر ایک واضح اور معین ڈگر پر چلتے ہیں۔ سیاسی رہنماؤں کے عقیدت مندوں کے لیے کوئی مُشکل نہیں۔

ان کے ذہن میں کبھی کوئی اُلجھن پیدا نہیں ہوتی۔ وہ اپنی ساری قوّتِ فیصلہ اپنے رہبر کے حوالے کر دیتے ہیں۔ وہی ان کے لیے سوچتا ہے اور فیصلے کرتا ہے اسی طرح سیاسی جماعتیں اپنے اراکین کے لیے نظریات اور اعتقادات تراشتی ہیں اور ''معزز اراکین'' فکر اور سوچ کی زحمت سے بچ جاتے ہیں۔ ان کے ذہن میں جب کبھی کوئی سوال یا اُلجھن پیدا ہوتی ہے تو تنظیم کے سربراہ اس کے علاج کے لیے نسخہ اور ترکیب استعمال لکھ دیتے ہیں، ان کے لیے حق و صداقت کے معیار کوئی اور مقرر کرتا ہے۔ وہ ہر نئے مسئلے کا حل کسی پُرانی کتاب میں تلاش کر کے اپنے فرائض سے سبکدوش ہوتے ہیں۔ وہ زندگی کو نظریات اور مفروضات کا تابع بنا کر اس کی لامحدود وُسعتوں کو محدود کر دیتے ہیں۔ وہ بنے بنائے نظریات کے سانچوں میں ڈھل کر محفوظ ہو جاتے ہیں۔ لیکن چراغ بیگ کو ہر اُلجھن اور ہر سوال کا جواب دینے کے لیے فکر کی اذیت ناک بھٹی میں پگھلنا پڑتا ہے پُر پیچ راہوں سے بغیر کسی رہنما کا سہارا لیے گزرنا پڑتا ہے۔ یہاں قدم قدم پر ٹھوکر کھا کر گرنے کا احتمال رہتا ہے۔ اور بعض اوقات مسافر زخمی ہو کر گر پڑتا ہے۔ حقیقت کی ایک پرچھائیں پانے کے لیے زہر کے کتنے ہی کڑوے گھونٹ پینا پڑتے ہیں چراغ بیگ کے سیاسی نظریات کی بُنیاد عقلیت، سائنس اور انسان دوستی پر ہے۔ وہ دُنیا میں دو چیزوں سے بے پناہ نفرت کرتا ہے۔ فرقہ پرستی اور افلاس (ذہنی اور مادی)...... افلاس کو تو وہ شاید چند مصلحتوں کی بنا پر گوارا کر بھی لے لیکن فرقہ پرستی سے اس کا نباہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں ہو سکتا۔ وہ ہر اُس

سیاست کو انسانیت کے لیے زہر ہلاہل سمجھتا ہے جس کی بُنیاد مذہب پر رکھی گئی ہو جس کا مقصد مذہبی جذبات اُبھار کر سیاسی مقاصد کی تکمیل ہو۔ جس میں ایک فرقے کے لوگوں کو دوسرے فرقے کے ماننے والوں پر ترجیح دی جائے۔ چراغ بیگ فرقہ پرست سیاست کے اماموں کو انسانیت اور تہذیب کا دُشمن سمجھتا ہے۔ ان کے خلاف جنگ کرنا ہر ذی شعور انسان کا پیدائشی فرض ہے لیکن اس جنگ میں ہندو فرقہ پرستی اور مسلم فرقہ پرستی میں فرق کرنا بد دیانتی ہی نہیں صریح بے ایمانی ہے اور پچھلے چند ماہ سے چراغ بیگ کو یہ محسوس ہوا ہے کہ جب وہ مسلم فرقہ پرستی کے خلاف آواز بلند کرتا ہے تو اسے ترقی پسند کہا جاتا ہے اور جب ہندو فرقہ پرستی کی مذمت کرتا ہے تو اسے خود فرقہ پرست قرار دیا جاتا ہے۔ چراغ بیگ نتائج کی پروا کیے بغیر واضح الفاظ میں یہ کہنا چاہتا ہے کہ فرقہ پرستی ہر حال میں لعنت ہے۔ چاہے وہ ہندو فرقہ پرستی ہو یا مسلم فرقہ پرستی، لیکن کشمیر میں ہندو فرقہ پرستی کا کوئی منطقی، اخلاقی اور نفسیاتی جواز ہی موجود نہیں۔ مُسلم فرقہ پرستی تاریخی حادثات اور سیاسی تضادات کا پیدا کردہ روگ ہے۔ اس کا علاج کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہندو فرقہ پرستی ایک ایسا ناسور ہے جو مُسلم فرقہ پرستی کو بھی لاعلاج بنا دے گا۔ کشمیری پنڈت بھائیوں کو اس مسئلے پر سوچنا چاہیے!

چراغ بیگ نے ہندوستان کی تقسیم کو ذہنی طور پر قبول نہیں کیا ہے۔ اس کی نگاہوں میں پاکستان، ہندوستان کے ہندو فرقہ پرست اور مسلم فرقہ پرستوں کی سازش کا شکار ہے اور جب تک پاکستان میں ہندوؤں کو بھی وہی

حقوق حاصل نہ ہوں جو وہاں مسلمانوں کو حاصل ہیں۔ چراغ بیگ پاکستان کے خلاف اپنی نظریاتی جنگ جاری رکھے گا اور جب بھی ہندوستان کے ہندو فرقہ پرست یہاں کے مُسلمانوں کو اپنے جائز حقوق سے محروم کرنے کی کوشش کریں گے تو آپ چراغ بیگ کو ان کے خلاف برسرِ پیکار پائیں گے!

سوال کیا جائے گا کہ کشمیر کے مسئلے پر چراغ بیگ کی کیا رائے ہے اور وہ شیخ محمد عبداللہ اور غلام محمد صادق دونوں میں سے کس سے اتفاق کرتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ چراغ بیگ کی نگاہوں میں ان میں سے سولہ آنے صحیح بات کوئی نہیں کہتا۔ واقعہ یہ ہے کہ کشمیر کے مسئلے کے متعلق کوئی لیڈر مکمل حقیقت کو پیش کرنے کی ہمت ہی نہیں رکھتا۔ پاکستان کو تو چھوڑ دیجیے۔ اس کے دعویٰ کی بنیاد چوں کہ صرف مذہب پر ہے اس لیے میں اس پر غور کرنے کے لیے بھی تیار نہیں لیکن شیخ صاحب کے دعویٰ کو لیجیے ان کا کہنا ہے کہ کشمیری عوام نے ابھی تک اپنے مستقبل کا فیصلہ نہیں کیا ہے اور انہیں اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کا حق ملنا چاہیے۔!

☆

جنوری ۱۹۶۶ء

مفادِ خصوصی

یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ جب بھی کبھی ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات بہتر ہوجانے کی کوئی صورت نکل آتی ہے دونوں ملکوں میں ایک خاص طبقہ سراسیمہ اور پریشان ہوکر کوئی ایسی صورت حال پیدا کرنے کی تاک میں لگ جاتا ہے جس سے امن و دوستی اور صلح و آشتی کی کوششوں پر پانی پھیرا جائے۔ اس طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے لیے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان مستقل کھچاؤ مفادِ خصوصی کی حیثیت رکھتا ہے ان کا خیال ہے کہ اگر یہ دونوں ممالک ایک دوسرے کے قریب آگئے تو ان کا مفاد خطرے میں پڑ جائے گا اور ان کے وجود کی اہمیت ختم ہوجائے گی۔ معاہدہ تاشقند دونوں ملکوں کے درمیان مفاہمت، مصالحت، امن اور آشتی کی وہ عظیم دستاویز ہے، جسے ہندوستان کے وزیر اعظم لال بہادر شاستری نے اپنی زندگی کا خراج دے کر مقدس اور مستحکم بنادیا لیکن جہاں ایک طرف معاہدے پر بڑے خلوص اور نیک نیتی سے عمل ہونا شروع ہوگیا ہے۔ دوسری طرف دونوں ملکوں میں مفادِ خصوصی سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے ہنگامہ برپا کرنا شروع کردیا ہے۔ ہندوستان میں بھارتیہ جن سنگھ کو معاہدہ تاشقند کی کامیابی

سے اپنا وجود خطرے میں نظر آرہا ہے۔ عام انتخابات میں اب چوں کہ صرف ایک سال رہ گیا ہے۔ اسے اپنی کامیابی کے امکانات تاریک سے تاریک تر دکھائی دے رہے ہیں۔ اس لیے جن سنگھی لیڈروں نے معاہدہ تاشقند کے متعلق غلط فہمیاں پھیلا کر اپنے مفاد خصوصی کو محفوظ رکھنے کا پروگرام بنایا ہے پاکستان میں شکست خوردہ سیاست دان صدر ایوب سے اپنی محرومیوں کا انتقام لینے کے لیے معاہدے کے خلاف برسر پیکار ہو گئے ہیں۔ ان سیاست دانوں نے پچھلے اٹھارہ برسوں میں ہندوستان کے خلاف نفرت کے سہارے اپنے وجود کو زندہ رکھا ہے امن و دوستی کی نئی فضا میں انہیں بھی اپنا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ اس لیے یہ معاہدے کو "تارپیڈو" کرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کی طرف سے معاہدہ تاشقند پر دستخط کے فوراً بعد سے پاکستان کے خلاف پروپیگنڈہ بند کر دیا گیا ہے۔ ریڈیو پاکستان کے لہجے میں بھی ایک خوشگوار تبدیلی نمایاں ہے۔ لیکن "آزاد کشمیر" ریڈیو جو شرافت، اخلاق اور تہذیب کے ہر بندھن سے آزاد ہے بدستور یاوہ گوئی اور ہرزہ سرائی میں مصروف ہے کیوں کہ آزاد کشمیر ریڈیو اور آزاد کشمیر حکومت دونوں کا تعلق اس مفادِ خصوصی سے ہے جنہیں ہند پاک دوستی کی وجہ سے اپنا وجود خطرے میں نظر آتا ہے۔ ہمارے یہاں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو دونوں ملکوں کی دوستی کے تصور سے بھی ہراساں ہو جاتے ہیں۔

عوام کی واپسی:-

معاہدہ تاشقند کا ایک سب سے پریشان کن (مگر دلچسپ) پہلو یہ

ہے کہ معاہدے کی رو سے ہمیں حاجی پیر کا علاقہ بھی پاکستان کو واپس کرنا ہوگا۔ چراغ بیگ کو پریشانی اس لیے نہیں ہے کہ ہم نے حاجی پیر کبھی واپس نہ دینے کا اعلان کیا تھا بلکہ اس لیے کہ ان پانچ ہزار سے زائد لوگوں کا اب کیا بنے گا جنہوں نے وزیر مملکت غلام رسول کار کی خدمت میں استقبالیہ ایڈریس پیش کیے تھے۔ ہند فوج زندہ باد کے نعرے بلند کیے تھے اور اپنے سابقہ حکمرانوں کی بے رحمی، لاپروائی اور سفا کی کے افسانے سنائے تھے۔ حاجی پیر کا علاقہ آزاد ہونے کے بعد چراغ بیگ کو بھی وزیر مملکت کے ساتھ اس علاقے میں جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس علاقے کی فضا جب ''ہند فوج زندہ باد اور صادق حکومت زندہ باد کے نعروں سے گونجنے لگی تو چراغ بیگ نے اپنے ایک ساتھی سے کہا تھا کہ اگر ان لوگوں کو کبھی واپس پاکستان جانے کا موقع ملا۔ تو پھر ان کا طرز عمل، ان کی نفسیات اور ان کا کردار مطالعہ کے لیے بڑا ہی دلچسپ موضوع ہوسکتا ہے اب جب کہ مستقبل قریب میں ان لوگوں کو دوبارہ ''آزاد کشمیر'' کے تسلط میں دیا جائے گا تو ہمیں ''آزاد کشمیر'' ریڈیو سے ہر قسم کی خرافات سننے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے!۔ وہی لوگ جنہوں نے ہمیں آزاد کشمیر کے حکام کے ظلم و ستم کی داستانیں سنائی تھیں ، ہمارے خلاف زہر اگلیں گے اور طرح طرح کے مظالم ہم سے منسوب کریں گے۔ پچھلے چھ ماہ میں ہم نے حاجی پیر میں رہنے والے لوگوں کے لیے وہ کچھ کیا، جو ''آزاد کشمیر'' نے پچھلے اٹھارہ سال میں بھی نہیں کیا تھا لیکن اس کے باوجود ''آزاد کشمیر ریڈیو'' سے ہمارے مظالم کی فرضی داستانیں نشر

ہوں گی۔(جنہوں نے آج سے چند ماہ پہلے کارصاحب زندہ باد۔اور صادق صاحب زندہ باد کے نعرے لگائے تھے)۔اگرچہ حاجی پیر کی فتح کا سہرا ہماری فوجوں کے سر ہے۔لیکن کارصاحب نے حاجی پیر کے ہیرو کی حیثیت سے ملک بھر میں نام پیدا کر لیا ہے۔اس لیے کارصاحب کو حاجی پیر کے عوام سے گہری دلچسپی ہے۔کارصاحب کی خدمت میں عرض یہ ہے کہ چوں کہ سب سے زیادہ گرم جوشانہ استقبال ان ہی کے حصے میں آیا تھا۔اس لیے اب سب سے زیادہ صلواتیں بھی ان ہی کو سننا پڑیں گی۔پیشتر اس کے کہ حاجی پیر کا علاقہ پاکستان کو واپس کر دیا جائے کہ حاجی پیر کے عوام سے وہ نمک اور شکر واپس لی جانی چاہیے جو پچھلے پانچ ماہ سے ہم انہیں دیتے آئے ہیں۔ تاکہ مستقبل میں انہیں نمک حرامی اور شکر حرامی کا موقع نہ ملے۔ہماری یہ بھی گزارش ہے کہ خواجہ بانڈے کے محمد یوسف نامی اس واحد تعلیم یافتہ نوجوان کو واپس نہ بھیجا جائے جس نے کارصاحب کی خدمت میں خطبہ استقبالیہ پڑھا تھا اور جو پچھلے پانچ چھ ماہ میں اس علاقے کے لوگوں کا ترجمان بن گیا تھا۔ہمیں اندیشہ ہے کہ آزاد کشمیر کے ارباب اقتدار اپنی بے عزتی کا تمام تر انتقام اسی غریب سے لیں گے۔

نظر کا دھوکہ:۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آج سے چند سال پہلے جب سرینگر میں پہلوانوں کے ایک دنگل کا اہتمام ہوا تھا تو اس میں اسرائیل کے ایک خوب رو پہلوان وادی ایوب بھی شامل تھے۔شہر کے بوالہوسوں اور ستم ظریفوں

نے اس یہودی نوجوان کو عرب کا ستارہ سمجھ کر اپنی عقیدت اور محبت کا مرکز بنا دیا تھا۔ وہ جہاں سے بھی گزرتا ہزاروں لوگ اس کے پیچھے دوڑتے اور اسلام زندہ باد کے نعرے لگاتے۔ وادی ایوب کے یہاں سے چلے جانے کے بہت دیر بعد لوگوں کو معلوم ہوا کہ وہ حضرت یہودی تھے۔ ان دنوں شہر کے ایک سینما ہال میں ''مغل اعظم'' دکھائی جا رہی ہے۔ اس میں ایک مقام پر مدھوبالا فال نکالنے کے لیے دیوانِ حافظ کھولتی ہے سامعین فوراً تالیاں بجا بجا کر اپنی عقیدت اور مسرت کا اظہار شروع کر دیتے ہیں۔ سادہ لوح عوام کو یہ کون بتائے کہ یہ ان کی نظر کا دھوکہ ہے۔ جس کتاب کو وہ نعوذ باللہ قرآن شریف سمجھتے ہیں وہ دیوانِ حافظ ہے۔

☆

جون ۱۹۶۴ء

رشوت کی اقسام

چراغ بیگ نے قارئین سے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ شمارے میں بدعنوانیوں اور رشوت ستانی کی قسمیں بتائی جائیں گی۔ وعدہ کرنے کو تو کرلیا لیکن آپ ہی بتائیے کہ ایک ہفتے کے قلیل عرصے میں ایک اکیلا چراغ بیگ بے چارہ اتنے بڑے موضوع پر کیسے چھان بین کرے اور چھان بین کرے بھی تو نتائج آپ کے حوالے کیوں کرے۔ ان نتائج کو سلیقے سے مُرتب کر کے ریاست کی معیشت پر ایک مقالہ کیوں نہ لکھے کہ کسی یونیورسٹی کے شعبۂ اقتصادیات سے ڈاکٹریٹ حاصل کرے۔ چراغ بیگ آپ سے بڑے ادب کے ساتھ گزارش کرنا چاہتا ہے کہ آپ کو ادب سے شغف ہے (اور بے ادبی سے بھی) لیکن اقتصادیات کا میدان آپ کے کام و ذہن کے لیے کوئی کشش نہیں رکھتا۔ اس لیے آپ شاید چراغ بیگ کی اس بات سے اتفاق نہ کریں کہ پچھلے دس گیارہ سال سے ریاست کی معیشت کی بُنیاد نہ تو سیاحت پر تھی اور نہ صنعت وحرفت پر نہ ہی دست کاریوں اور تجارت پر۔ یہاں کی معیشت کا دارومدار رشوت اور بدعنوانیوں پر رہا۔ بلکہ یہ کہنا کچھ ایسا

غلط نہ ہوگا کہ رشوت (اور بدعنوانی) ہی یہاں کی معیشت تھی۔ میں اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ دو وجہوں سے...... نمبر ایک: آپ ماہر اقتصادیات نہیں ہیں اس لیے آپ کو اُلجھن ہوگی۔ نمبر دو: ایک خاندان اور اس کے حواریوں کو چھوڑ کر ریاست کے باقی سب لوگ (جن میں آپ بھی شامل ہیں) اس بات کو اپنے مشاہدے سے جانتے ہیں۔

آپ جانتے ہیں کہ چراغ بیگ کوئی کام ادھورا یا بکھرا نہیں کرتا۔ اس لیے رشوت کی چند قسمیں گنا کر وہ ڈیماگاگ سیاسی ''لیڈروں'' کی طرح لوگوں کو دھوکا دینا نہیں چاہتا۔ بدتمیزی کی کتنی قسمیں ہیں؟ اَن گنت، بے ہودگیوں کی کتنی قسمیں ہیں؟ اَن گنت۔ اسی طرح رشوت اور بدعنوانیوں کی بھی اَن گنت قسمیں ہیں۔ ہاں دو چار موٹی موٹی قسمیں جو کشمیر میں بہت رائج (بقول کسے چالو) ہیں تحریر کی جا رہی ہیں۔ پہلی قسم ہے ''تحائفی رشوت'' یہ رشوت دینے کا بڑا ہی مہذب اور معزز طریقہ ہے اور اس دور میں خاصا مقبول خاص و عام ہے۔

لڑکی کی شادی ہو یا لڑکے کی۔ افسر لوگ ٹھیکیدار دوستوں اور ماتحتوں سے تحفے قبول کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔ ایک ایک شادی پر ڈیڑھ دو لاکھ کے تحفے آنے کا شاہد تو آپ کا یہ نامہ نگار چراغ بیگ بھی ہے۔ چراغ بیگ کے ایک دوست تھے جن کی شادی بڑے گھر میں ہوئی۔ شادی سے پہلے یہ دوست صرف سائیکل پر بیٹھا کرتے تھے (سُنا ہے دوستوں کی طرح وہ سائیکل چلانا بھول گئے ہیں) شادی کے تحفے کے طور پر ان کی بیوی کو ایک

ٹھیکیدار صاحب نے صرف ایک چابی پیش کی اور ساتھ میں اُس نئی کار کی رسید، جس کی یہ چابی تھی۔ شادی کے بعد بچے ہوتے ہیں اور ظاہر ہے ان بچوں کی سالگرہ بھی ہوتی ہے اور سالگرہ پر تحفے بھی دیے جاتے ہیں۔ صرف سالگرہ کے تحفوں کی لالچ میں ذی اثر لوگ ضبط تولید نہیں کرتے۔ چراغ بیگ کے یہ دوست ماشاء اللہ کثیر العیال ہیں۔ اور ہر اولاد کو صرف سالگرہ میں تحفے کے طور پر اتنا زرِ نقد مِلا ہے کہ ان کی بھی اولادوں کی سات پیڑھیاں بڑے عیش سے زندگی گزاریں گی۔ چاہے سو روپے کی قوّت خرید گرِ کر ایک پیسہ ہی کیوں نہ رہ جائے۔

رشوت کی دوسری قسم ہے، انگریزی رشوت، اس رشوت میں غلط انگریزی بولی جاتی ہے۔ اور صحیح انگریزی شراب پی جاتی ہے اور پینے والے کو عالم مدہوشی میں اِس بات کا احساس نہیں رہتا کہ بِل کس نے ادا کیا۔ ہمارے زیادہ افسر دُرست انگریزی نہیں بول سکتے۔ لیکن پیتے ہیں صرف انگریزی شراب جب ہوٹلوں میں یہ شغل ہوتا ہے تو پینے اور کھانے' دونوں کا بِل ازراہِ دوستی ٹھکیدار اور درخواست دہندگان ادا کرتے ہیں۔

رشوت کی تیسری قسم ہے 'رشوت نقل و حمل'۔ یعنی افسر کی کار میں پیٹرول کوئی اور صاحب ڈال دیتے ہیں۔

دو ڈھائی سَو روپے پانے والے کتنے افسر ہیں جن کے پاس نئے ماڈل کی نئی کاریں ہیں۔ شاید صدا چار سمتی (یا سدا لاچار سمتی) کے ممبروں کو چھوڑ کر باقی سارا کشمیر جانتا ہے۔ ان کاروں کی قیمت یقیناً ان افسروں یا ان

کے رشتے داروں نے نہیں دی ہے۔ اِن کاروں کے ڈرائیور تو خُود ان کے مالک ہیں لیکن کلینز وہ ہیں جو پہلی تاریخ کو تنخواہ لینے دفتر جاتے ہیں۔ اِن کاروں پر پیٹرول کا خرچ ''صاحب'' کی تنخواہ کے برابر ہوتا ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھیے گا کہ 'صاحب' تنخواہ لا کر پیٹرول والے کے حوالے کر دیتے ہیں جی نہیں۔ یہ بل تو ٹھیکیدار اور 'درخواست دہندہ' دوست ادا کرتے ہیں۔

رشوت کی چوتھی قسم ہے 'جمالیاتی رشوت' یعنی صاحب کے ذوق جمال کی تسکین۔ خوبصورت گلدستوں سے لے کر خُوبصورت جسموں تک رشوت کی یہ قسم مقبول خاص ہے مقبول عام نہیں۔ پچھلے دور میں اس رشوت نے بڑا رواج پایا۔ معلوم ہوا ہے کہ اب بھی کچھ افسران اس روایت کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

نام لکھنے کی ضرورت نہیں۔ آپ اور آپ ہی کیا، کشمیر کے تمام لوگ رشوت خور افسروں کے اس سنڈیکیٹ سے بخوبی واقف ہیں۔ جنہوں نے رشوت کے کاروبار کو ٹریڈ یونین کی طرح منظّم کیا تھا۔ (ریاست میں صرف یہی ایک ٹریڈ یُونین ہے) اس سنڈیکیٹ کے چیرمین اور مینجنگ ڈائریکٹر اگرچہ زبردستی نکال دیے گئے ہیں، لیکن سنڈیکیٹ اب بھی باقی ہے۔ سنڈیکیٹ کے ممبر صرف اعلیٰ افسر تھے۔ ان کے پاس اتنی منقولہ جائداد ہو گئی کہ ان کی دلچسپیاں روپے پیسے سے ہٹ کر ''جمالیات'' کی طرف گئی اور انہوں نے اس سلسلے میں ہر طرح کے تجربے کیے۔ اس طرح سدا چار سمتی ایک منظّم سازش کا شکار ہو کر سدا کے لیے لاچار ہو کر رہ جائے گی۔ اور پھر کبھی

کوئی ستم ظریف سمتی کے بورڈ پر سدا چار کی بجائے سدا لاچار لکھ کر اس سازش کو ہمیشہ کے لیے کپڑے پہنائے گا جس کو ننگا کرنے کا مطالبہ وزیر داخلہ ننده سے لے کر بے بی ننده اور چراغ بیگ سبھی کر رہے ہیں۔

آج کشمیر میں رشوت اس طرح منظّم ہے کہ دُنیا کی بہترین حکومت کی کوئی وزارت بھی منظّم نہیں ہوگی۔ کشمیر میں اب رشوت صرف ناجائز فائدہ حاصل کرنے ہی کے لیے، بالکل جائز اور قانونی کام کے لیے، فائل ایک میز سے دوسری میز اور اس طرح آخری میز تک پہنچوانے کے لیے (اور اس طرح فائل کے واپسی کے سفر) کے لیے۔ اور پھر احکامات جاری کرنے کے لیے دی اور لی جاتی ہے۔

چراغ بیگ کا خیال ہے کہ وہ روز دُور نہیں جب سدا چار سمتی تک اپنی شکایت پہنچانے کے لیے لوگوں کو کئی مرحلوں پر رشوت دینا ہوگی۔

سوال یہ ہے کہ اس سازش کو ننگا کیا جائے یا اسے کپڑے پہنا کر عوام کے سامنے پیش کیا جائے۔ اس سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ رشوت ستانی اور بے ایمانی کی سازش کو بے نقاب یا عُریاں کرنے والوں کے دامن بے داغ ہیں یا نہیں؟ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ ایک سازش کو بے نقاب کرنے کے لیے ایک اور سازش منظّم ہو جاتی ہے اور اس طرح سازشوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ مثلاً یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ سمتی کے ایک رُکن مولانا محمد سعید مسعودی کو پہلے سمتی کا ممبر بنایا گیا اور بعد میں انہیں اس کی اطلاع دی گئی۔ کیا یہ بدعنوانی نہیں؟ کیا یہ رشوت ستانی کی ایک قسم

نہیں؟ حیرت ہے کہ اس نئی رشوت ستانی کا افتتاح خودسمتی کے افتتاح کے ساتھ ہی ہوا۔

'چو کُفر از کعبہ برخیزد کُجا ماند مُسلمانی' بہتر یہی ہے کہ سازش کو بے نقاب کرنے کی بجائے اسے کپڑے پہنائے جائیں۔

☆

ستمبر ۱۹۶۴ء

بدعنوانیوں کا عنوان

پچھلے دس بارہ سال سے کشمیر کی روایت تھی کہ وزیر اعظم سے لے کر نائب تحصیل دار تک کا کام وزیر اعظم کرتا تھا۔ ٹھیکوں کی الاٹمنٹ سے لے کر چپراسیوں کی تقرری تک وزیر اعظم کی مرضی سے ہوتی تھی۔ صرف محکمہ تعلیم میں اساتذہ اور اُستانیاں، ناظم تعلیمات لگاتے تھے اور وہ بھی ایک ہاتھ کی اُنگلیاں کھول کر، اور کبھی دونوں ہاتھوں کی اُنگلیاں کھول کر۔ ٹھیکے چوں کہ گھر میں تقسیم ہوتے تھے یا ان لوگوں کو ملتے تھے جن کے ساتھ برادران عزیز کی دوستی ہوتی تھی۔ اِس لیے نجی کام بھی سرکاری کام ہو جاتا تھا۔ اور سرکاری مشینری نجی مفاد کے لیے کھلم کھلا استعمال ہوتی تھی۔ جب نظام ایسا ہو جس کی بنیادیں بدعنوانی پر ہوں تو بدعنوانی کا نام کون لے، لیکن صادق صاحب کے وزیر اعظم ہونے کے بعد یہ اُمید ہوگئی تھی بلکہ یقین ہو چلا تھا کہ اب ساری بدعنوانیوں کا قلع قمع ہو جائے گا۔ پھر جب صادق صاحب نے اپنی حکومت کی پالیسی کا اعلان کیا اور بار بار اس بات کی وضاحت کی کہ بدعنوانیاں بالکل ختم کردی جائیں گی اور سیاستدانوں کے اعمال کا بھی جائزہ لیا جائے گا اور ان کی جائیدادوں کی جانچ پڑتال کی جائے گی۔ تو ایک مخصوص گروہ کو

چھوڑ کر باقی سارے کشمیریوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ظاہر ہے اُن میں چراغ بیگ نے سب سے گہری سانس لی۔ لیکن آج عالم یہ ہے کہ صادق کابینہ کے ایک وزیر نے وہ دھاندلی مچا رکھی ہے کہ لوگ حیران ہیں کہ اس شخص پر بخشی غلام محمد کی نظرِ انتخاب کیوں نہیں پڑی۔ کیوں کہ اس میں وہ سارے اوصاف موجود ہیں جن کے لیے بخشی غلام محمد کا دورِ بربریت اہلِ کشمیر مدتوں تک یاد رکھیں گے۔ ان حضرات کے یُوں تو بڑے کارنامے ہیں جو انہوں نے چھوٹی سی مدت وزارت میں اپنے ہر محکمہ میں سرانجام دیے ہیں لیکن سب کو پیش کرنے کے لیے تو ایک دفتر درکار ہے اور آپ سے جو لوگ چراغ بیگ کی تحریروں کے عادی ہیں وہ جانتے ہیں کہ چراغ بیگ کو دفتری کارروائی سے بڑی چڑ ہے۔ کیوں کہ دفتر کے ساتھ سُرخ فیتہ لگا ہوا ہے اور جو چیز دفتر میں پہنچتی ہے وہ داخلِ دفتر ہو جاتی ہے۔ بالکل اس طرح جیسے وزیرِاعظم کے سیکرٹریٹ سے آئے ہوئے ضروری کاغذات وزیرِ صحت کے دفتر میں کھو جاتے ہیں اور وزیرِاعظم اور چیف سیکرٹری کی یاددہانی کی چٹھیاں بھی فائل ہو جاتی ہیں اور جب فائل بہت موٹی ہو جاتی ہے تو غائب ہو جاتی ہے اور بالکل اُسی طرح، جیسے عقل موٹی ہونے کے بعد غائب ہو جاتی ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ جانکار حلقوں نے اطلاع دی ہے کہ میڈیکل کالج کے پرنسپل ڈاکٹر گوجرال نے استعفیٰ دے دیا ہے۔ وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ وزیرِ صحت نے ان کا ناک میں دم کر دیا ہے اور کالج کے ایڈمنسٹریشن کو بالکل مفلوج کر کے رکھ دیا ہے۔ میڈیکل کالج کے ایک سینئر

پروفیسر نے چراغ بیگ کو بتایا ہے کہ اگر وزیر صحت کا بس چلے تو جموں کے کمپونڈروں کو پرنسپل اور پروفیسروں کی رُخصت منظور کرنے اور ان کے بلوں پر تصدیق کرنے کے بھی اختیارات دے دیں۔

ڈاکٹر گوجرال کے استعفیٰ کی دو وجہیں بتائی جاتی ہیں (۱) میڈیکل کالج میں میرٹ کے حساب سے داخلوں کا علان کر دیا گیا تو اس کے بعد وزیر صحت کو اپنے ایک سفارشی کو بھرتی کرانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کشمیر کے ایک ذہین طالب علم کا داخلہ منسوخ کرنے کے لیے پرنسپل کو ہدایت کی گئی، حالاں کہ اس کی فیس بھی وصول کی جا چکی تھی۔ پرنسپل کے احتجاج کے باوجود اس کا داخلہ منسوخ کرنے کی چھٹی لکھوائی گئی۔ صادق صاحب کے دور میں عدالت سے انصاف حاصل کرنے سے کسی کو نہیں روکا جا سکتا۔ کیوں کہ ''پیس بر گیڈ'' اللہ کو پیاری ہو چکی ہے چناں چہ اس طالب علم نے ''رٹ'' دائر کر دی۔ اس کے جواب میں جُھوٹا حلفیہ بیان داخل کرایا گیا کہ منشی کی غلطی سے اس کے داخلے کا اعلان کیا گیا تھا۔ عدالت نے داخلے کے کاغذات طلب کیے تو جلدی جلدی اصل ریکارڈ ضائع کر کے جعلی ریکاڈ تیار کیا گیا۔ لیکن اس سے کام نہیں چلا۔ بالآخر جھک مار کے اس طالب علم کو داخل کرنا پڑا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وزیر صحت مستعفی ہوتے۔ لیکن یہ کام ڈاکٹر گوجرال کے حصے میں آیا کیوں کہ وہ غیرت مند ہیں۔

ڈاکٹر گوجرال کے استعفیٰ کی ایک وجہ اور بھی بتائی جاتی ہے۔ وزیر صحت کالج کے کاموں میں اس حد تک مداخلت کرتے ہیں کہ پرنسپل کی

حیثیت ہیڈ کلرک کی ہو کر رہ گئی ہے۔ میڈیکل کالج سے ملحق صدر ہسپتال کے عملے میں ہر سطح پر، پرنسپل سے مشورہ کیے بغیر تبدیلیاں کی جاتی ہیں۔ وزیر صحت ایسا معلوم ہوتا ہے خود کو اہل جموں کے مفادات کا نگہبان نہیں بلکہ کابینہ میں اہل جموں کا دلال سمجھتے ہیں۔ چناں چہ وہی ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں جو کمیشن ایجنٹ استعمال کرتے ہیں۔ صدر ہسپتال کے کمپونڈر اور دوسرے ملازموں کو تبدیل کر کے گاؤں کی ڈسپنسری میں بھیجا گیا اور اُن کی جگہ جموں سے نئی بھرتی کی گئی اور ان نئے آنے والوں کو پرانے تجربہ کار لوگوں سے سینئر قرار دے دیا گیا۔ اس دھاندلی کی وجہ سے محکمہ صحت میں سخت بے چینی پائی جاتی ہے۔

اور پھر ڈاکٹر اوتار کرشن کا وہ مشہور کیس بھی ہے جس کی وجہ سے وزارت صحت کے سیکرٹری کی رات کی نیندیں حرام ہیں کیوں کہ ایک سرکاری فائل غائب کرادی گئی ہے۔ وزیر اعظم اس کیس پر چیف سیکرٹری سے رپوٹ طلب کرتے ہیں چیف سیکرٹری، وزارت صحت کے سیکرٹری کو نوٹ پر نوٹ لکھتے ہیں۔ لیکن یہ نوٹ وزیر صحت اس طرح احتیاط سے رکھ لیتے ہیں، گویا نوٹ نہیں بلکہ پرونوٹ ہیں۔

کہتے ہیں کہ جموں میں ایک ڈنٹسٹ تھے۔ ڈاکٹر چودھری۔ ایک سال ان کو تربیت کے لیے حکومت نے جرمنی بھیجا۔ وہاں آپ کا دِل لگ گیا۔ حکومت نے بار بار ان کو لکھا کہ واپس آؤ۔ لیکن انہوں نے حکومت کی نوٹسوں کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ حکومت نے مجبور ہو کر اُن کو ملازمت سے بر

طرف کر دیا اور ان کی جگہ ایک اور ڈاکٹر کی تقرری کر دی۔ آپ نے وہیں گھر آباد کیا اور بُود و باش اختیار کر لی۔ پھر نہ جانے ان کے جی میں کیا آیا۔ تین سال بعد بیوی اور بچوں کو لے کر جرمنی سے جموں واپس آ گئے۔ یہاں آ کر آپ نے دوبارہ نوکری کے لیے دوڑ دھوپ شروع کی۔ لیکن سابق حکومت جو تقرریوں میں دھاندلیوں اور بدعنوانیوں کے سلسلے میں خود ہی اپنی نظیر تھی۔ برطرف ملازم کو دوبارہ ملازم رکھنے کی جُرات نہ کر سکی۔ جناب شمس الدین پر ڈاکٹر چودھری کا وہ جادو چل گیا جو سر پر نہیں دِل پر چڑھ کر بولتا ہے۔ وزیر اعظم نما شمس الدین صاحب نے دِل کے ہاتھوں مجبور ہو کر جموں کے ڈینٹل سرجن کو برطرف کر دیا اور ڈکٹر چودھری کی تقرری کر دی۔ اس سرجن نے ''رٹ'' کرنے کا نوٹس دیا تو حکومت کے دانتوں میں درد ہونے لگا۔ جلدی جلدی ڈاکٹر چودھری کو پھر برطرف کیا گیا اور ڈینٹل سرجن سے معافی مانگ کر بحال کیا گیا۔

افواہ ہے کہ اس درمیان میں موجودہ وزیر صحت کو جو اُس زمانے میں ایک عام بیوپاری تھے اپنے دانت بنوانے کی ضرورت پڑی۔ اُس کے لیے وہ ڈاکٹر چودھری کے پاس گئے۔ ڈاکٹر چودھری نے ان کو دانتوں کے دو سیٹ بنا کر دیے۔ ایک کھانے کے اور دوسرے دکھانے کے۔ دکھانے کے سیٹ لگا کر وہ جمہوریت پسند ہو جاتے ہیں اور کھانے والے دانتوں کا سیٹ ان کو ڈکٹیٹر بنا دیتا ہے۔ یہ سارا قصور دانتوں کے سیٹوں کا ہے۔ اب ہوا یہ کہ قسمت کی خوبی سے جب آپ وزیر صحت بنے تو اپنے اقتدار کو چند روزہ سمجھ

کر بہتی گنگا میں ہاتھ دھونا شروع کر دیے۔ ڈاکٹر چودھری اور اُن کے کنبہ نے ضد شروع کی کہ ہم کو میڈیکل کالج میں پروفیسر، ڈاکٹر لگا دو۔ وزیر صحت نے کہا: ابھی لو! حکم جاری ہوا کہ سرکار نے میڈیکل کالج کے شریک پروفیسر ڈاکٹر اکبر کی جگہ ڈاکٹر چودھری کو لگایا اور ڈاکٹر اکبر کو ایک ڈسپنسری میں تبدیل کیا۔ ڈاکٹر اکبر نے چارج دینے سے انکار کر دیا۔ وزیر صحت کو اس کی خبر پہنچی تو انہوں نے حکومت کے دفاتر جموں میں بند ہو کر سرینگر منتقل ہونے سے ایک روز پہلے دوسرا حکم جاری کیا۔ جموں کے ہسپتال میں ایک نئی جگہ بنا کر میڈیکل کالج کے ڈسپنسری کے شعبے کے انچارج شریک پروفیسر کو اس نئی جگہ تبدیل کیا اور ان کی جگہ ڈاکٹر چودھری کو مقرر کیا۔

☆

ستمبر ۱۹۶۴ء

چور اور شہری آزادی

پرانے زمانے کے منصب داروں اور مہاراجوں کی آن بان کا مظاہرہ چند خاص لوازمات کے بغیر نامکمل رہتا تھا۔ ڈیوڑھیوں پر ہاتھی کا جھومنا اور دیوان خانے میں بٹیر بازوں کا شور و غل اور شاعروں کا ٹرانا سبھی آدابِ شاہانہ میں شامل تھے۔ جس دیوان خانے میں جتنے زیادہ شاعر اپنی مُرادوں کی جھولی پھیلائے ہوئے نظر آتے، اُتنا ہی اُس کی شان میں اضافہ ہوتا۔ کوئی بگڑے مزاج کے نواب صاحب اس رسم کو ذرا اور آگے لے کر بازارِ حُسن کے مکینوں کو اشرفیوں کی چھنک پر اپنے سامنے تگنی کا ناچ نچواتے اور جب اُن کے ہاتھوں میں اشرفی کی تھیلی ہوتی اور رقاصہ مچل مچل کر اُن کی دل بہلائی کے لیے عشوؤں اور اداؤں کی بجلیاں گراتی تو وہ جوش میں آ کر اُس پر زر کی بارش کرتے تھے۔ آج کے زمانے میں یہ محفلیں خواب و خیال ہوگئی ہیں۔ لیکن پچھلے ہفتے ٹرانسپورٹ کنونشن کی عنایت سے اُن گداگروں کی صورتیں دکھائی دیں جو اب بھی فن کا کاسہ ہاتھ میں لے لے کر اہلِ کرم سے مُرادوں کی بھیک مانگے جا رہے ہیں۔ ٹرانسپورٹر صاحبان کا یہ کنونشن جن "نیک مقاصد کے لیے منعقد کیا گیا تھا اُن میں سے "مُشتے نمونہ از خروارے" یہ ہیں:

(۱) جموں وکشمیر میں کرایہ کی شرح کم ہے۔ اُسے بڑھا دیا جائے۔

(۲) ٹرانسپورٹ پر چند نفع خور مالکوں کی اجارہ داری بدستور قائم رہنے دی جائے۔

(۳) ٹرانسپورٹ کو باقی ملک کی سطح پر لانے کے لیے کوئی اقدام کرنے کی مطلق ضرورت نہیں۔

ان عوام پرور مطالبات کا ڈھنڈورہ پیٹنے کے لیے ٹرانسپورٹر صاحبان کو پرانے نوابوں کی طرح دربارِ حُسن کی لچکتی ہوئی حسیناؤں کی خدمات حاصل نہ ہو سکتی تھیں لیکن جاگیردارانہ دیوان خانوں میں لپکتے ہوئے شعراء اشرفی کی کھنک پر اس جگہ بھی پہنچ گئے۔ اور جھوم جھوم کے منافع بازوں کے قصیدے گانے لگے۔ اُسی انہماک اور دلجوئی سے، جیسے وہ صبح انقلاب کا منظر بیان کر رہے ہوں یا ''لیلائے آزادی'' کی زُلفوں کے خم کھول رہے ہوں۔ چراغ بیگ کو یہ منظر اُس وقت تو بالکل ہی طلسم ہوش رُبا کا ایک باب معلوم ہوا جب ایک شاعر ٹرانسپورٹ کے شیشے میں عروس غزل کو اُتار رہے تھے۔ تو اتنے میں ایک صاحب اسٹیج پر نمودار ہو کر مستانہ وار ناچنے لگے اور شاعر صاحب پر سکوّں کی بارش کرنے لگے تو شاعر صاحب کی اُونچی تعلیمی سند تو اُن کی نکٹائی کے پیچھے جا چھپی لیکن اُن کا ترقی پسند شعور اُن کے چہرے پر عرقِ خجالت بن کر نمودار ہو گیا اور بے چاری فن کی نازنین اپنی بے آبروئی کے خوف سے تھر تھر کانپتی ہوئی چراغ بیگ کے پہلو میں پناہ کی طالب ہوئی۔ عروسِ غزل کو اُس سنِ رسیدہ شاعر کے ریش سفید پر بھی اعتماد نہ رہا جو اسٹیج پر اُونگھ رہے تھے

اور عروسی جوڑا پہنے ہوئے بے چارے چراغ بیگ کی ہی دامن گیر ہوئی۔

چراغ بیگ کی ایک اطلاع کے مطابق اب ترقی پسند فلاحی ریاست کے لیے انقلاب برپا کرنے والے ان شعرا حضرات کی خدمات بلیک مارکٹیئے اور ملاوٹ کرنے والی فرمیں بھی حاصل کر رہی ہیں تا کہ یہ فن کے جادو سے اُن کے کارناموں کی سیاہی پر سفیدی کا روغن پھیر دیں۔ کیوں کہ ان شاعروں نے ایک اشتہار میں کہا ہے کہ وہ جُھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنانے کا کام خاص اُجرت پر تسلی بخش طور پر کر سکتے ہیں۔ بگڑا ہوا شاعر اب مرثیہ گو کے بجائے سماج دشمن عنصر بن گیا ہے۔ ضمیر اور خودداری کے مسئلے پر جب چراغ بیگ صاحب نے ایک شاعر کی رائے جاننے کی جسارت کی تو جواب ملا۔ ''ارے بھائی اب جمہوریت کا زمانہ ہے۔ ضمیر اور خودداری کو بھی تو رخصت لازمی اور رخصت رعایتی کی سہولت حاصل ہونی چاہیے اور انہی مناسب موقعوں پر چھٹی دینے کے اس حق پر اعتراض کر کے آپ بنیادی شہری حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کی مذموم سعی کر رہے ہیں۔''

مجبوری، حقوق اور فرائض کی بات ہی ہے تو چراغ بیگ کو زندگی کا ایک اور روشن باب یاد آ گیا ہے۔ آج شہر میں دھڑا دھڑ نقب لگ رہے ہیں۔ چوریاں ہو رہی ہیں اور ڈاکے ڈالے جا رہے ہیں۔ یہ عمل اب رات کی تاریکیوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ دِن کے اُجالوں میں بھی چور آرام اور عافیت سے پولیس سیکٹر کے پڑوس کے مکان کا تالا توڑ کر اپنا کام کرتے ہیں۔ جب ایک پولیس افیسر سے چراغ بیگ کی مڈبھیڑ ہوئی اور چراغ بیگ

نے اِس سے اِس بارے میں دریافت کیا تو پولیس افیسر نے نہایت اطمینان سے جواب دیا کہ اوّل تو چور کی شناخت بڑی مشکل ہوگئی ہے۔ کیوں کہ پچھلے زمانے میں اُس کی داڑھی میں تنکا ہوا کرتا تھا لیکن اب اُس کا چہرہ بالکل کلین شیو ہوتا ہے تنکا کیسے نظر آئے۔ دوسری بات جب سبھی لوگوں کو شہری آزادی مِل گئی ہے تو بے چارے چوروں نے کون سی چوری کی ہے کہ انہیں اپنے پیشے کے حقوق سے محروم کر دیا جائے دراصل چراغ بیگ جیسے کم فہم لوگ جمہوریت کی صحیح سپرٹ نہیں سمجھتے۔ ورنہ ایسا مہمل سوال ہی نہیں کرتے۔ جب چراغ بیگ اِس افسر کی جمہوریت دانی پر بوکھلا کر اُن سے پوچھنے لگے کہ آپ نے جمہوریت کا یہ شعور اور ادراک کس تربیت گاہ سے حاصل کیا ہے تو اُنہوں نے جھٹ سے جواب دیا کہ ہماری موجودہ زندگی تو ایک چلتی پھرتی تربیت گاہ ہے، بیکاروں کو آزادی ہے، بیروزگاروں کو آزادی ہے، ملاوٹ کرنے والے دندنا رہے ہیں، اغوا کرنے والے کاروں میں پھر رہے ہیں۔ ذخیرہ اندوز دونوں ہاتھوں سے مالِ غنیمت سمیٹ رہے ہیں۔ مزدور آزاد ہیں کہ اب اُن کو مزدوری کی زحمت سے چھٹکارا مِل گیا۔ بے چارہ چور اپنے پیشے کے آداب نبھاتا ہے تو کیا بُرا کرتا ہے؟ تھانیدار صاحب اپنی رو میں موتی بکھیر رہے تھے اور چراغ بیگ کے وجود کے اندر سے آوز اُبھرتی رہی تھی۔ ''ہم سب چور ہیں'' ...... سیاست اور نجوم کا کچھ واسطہ ہے یا نہیں' یہ بڑی متنازعہ بحث ہے۔ جواہر لال نہرو نے ایک مرتبہ اس مفروضے کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا تھا کہ اب جب کہ انسان نے کائنات میں کچھ اور مصنوعی

ستاروں کا اضافہ کر دیا ہے تو نجومی کیسے حساب کر پائیں گے۔ اُن کا سارا نقشہ ہی تو گڑبڑ ہو گیا۔ مگر بقولِ کسے ''تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں''، نجوم کے کرشموں پر اعتماد رکھنے والے خوش اعتقادوں کی کمی نہیں ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ چراغ بیگ نے ہمیشہ اُن ہی لوگوں کو نجوم پر بھروسہ کرتے دیکھا ہے، جنہیں اپنی دیانت یا اپنی قابلیت پر بھروسہ نہیں ہوتا۔ آج کل بخشی صاحب کے بعض احباب اُن کا زائچہ اور نقشِ دست لیے ہوئے پھرتے ہیں اور بڑے چہکتے ہوئے لہجے میں نشان دہی کرتے ہیں کہ اُن کے سِتاروں کی گردش کا وقت ختم ہو رہا ہے اور اب پھر اُن پر اقتدار کا ستارہ چمکنے کو ہے۔ حالاتِ حاضرہ کو یہ استقلال اپنی رفتار موڑنے پر مجبور کرے یا نہ کرے مگر اس سے یہ اندازہ تو ہو ہی جاتا ہے کہ انسان کی اُمید کیسی سخت جان نامراد شے ہے۔ ڈوب ڈوب کے اُبھرتی اور گر گر کے اُٹھتی ہے۔ چراغ بیگ کو ان زائچوں سے اگر کوئی دلچسپی ہے تو یہ کہ کم سے کم کچھ بندگان خدا کا وقت تو اسی بہانے نکل جاتا ہے۔ اگر انہیں یہ افیم بھی نہ ملتی تو بے رحم دنیا کے تھپیڑے کھا کھا کر ان کا کیا حال ہو جاتا۔ باہر کی دنیا کے دروازے بند ہوتے ہیں تو اندر کی روشنی جاگ اُٹھتی ہے۔ ان مچھندروں نے روٹی پانی کا گیارہ برس کے دوران اچھا خاصا بندوبست کر رکھا ہے، رہا گزر اوقات کا مشغلہ...... سو نجوم نے حل کر دیا...... کون جیتا اور کون ہارا؟

☆

فروری ۱۹۶۵ء

وشوامتر سے ڈاکومان سنگھ تک

اہل جموں وکشمیر ولداخ کی طرح چراغ بیگ نے بھی اس اعلان کا خیر مقدم کیا کہ سابق وزیراعظم بخشی غلام محمد، ان کے بھائیوں، بیٹی، بیٹے، بیوی (جونیر) سالوں، سالی اوراس کے شوہر عبدالرشید خان (المعروف رشید بخشی) ان کے صاحبزادے، صاحبزادی اوران کے شوہر وغیرہ نے ناجائز طریقے سے جو جائدادیں کھڑی کی ہیں اُن کی جانچ پڑتال ہوگی اور سپریم کورٹ کے ایک سابق جج انکوائری کمیشن کے سربراہ ہوں گے۔ سرکاری زمینوں پر کس طرح قبضہ کیا گیا اور کس طرح سرکاری خزانے کو مالِ غنیمت کی طرح لوٹا گیا۔ لوگوں کو کس کس طرح جائدادوں سے محروم کر کے اپنی جائدادیں کھڑی کی گئیں۔ ان باتوں کی کچھ جھلک اس پریس نوٹ میں ملتی ہے جو سرکار نے جاری کیا تھا۔ لیکن ساری تفصیل اس میں بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ صرف چند بدعنوانیوں کو ہی تحقیقاتی کمیشن کے سُپرد کیا جا رہا ہے۔ چند بدعنوانیاں کُل بدعنوانیوں کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہیں۔ پھر بھی کمیشن کے قیام کے اعلان سے کمیشن ایجنٹس میں کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ حقائق کا بازار گرم ہونے والا ہے۔

چراغ بیگ کو حکومت سے یہ شکایت ہے کہ ایک عرصے تک کمیشن کے

قیام کو لیت و لعل میں ڈالا گیا (یہ بات بہت عیاں ہے) اب جب کہ کمیشن کے قیام کا اعلان کیا گیا تو فردِ جرم میں پانچ فیصدی جرائم بھی شامل نہیں ہیں۔ وزیراعظم جناب غلام محمد صادق نے نہ جانے کیوں اپنا یہ خیال بدل دیا کہ کمیشن ایسے شخص پر مشتمل ہو جو ریاست کی سرکاری زبان اردو پر دسترس رکھتا ہوتا کہ اُسے مترجموں کا سہارا نہ لینا پڑتا۔ تحقیقاتی کمیشن کی غیر جانبداری اور ایمان داری پر کسی کو شک نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہی بات مترجموں کے بارے میں کہنا اتنا آسان نہیں بہر حال اب تو کمیشن کے قیام کا اعلان ہو چکا ہے۔ اُمید ہے کہ مترجموں کے انتخاب میں بڑی احتیاط برتی جائے گی۔

معلوم نہیں اس بات میں کہاں تک صداقت ہے لیکن بظاہر کوئی ایسی غلط بات نہیں معلوم ہوتی ہے۔ پنڈت شونرائن فوطیدار کے قریبی حلقے سے تعلق رکھنے والے ایک صاحب کا کہنا ہے کہ کسی زمانے میں فوطیدار صاحب نے کشمیر اور اہل کشمیر کے بارے میں اپنے تجربے کی بناء پر جو باتیں پنڈت نہرو کو بتائیں اُن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ حکومت ہند "وشوامتر" کو بھی کسی سرکاری کام سے کشمیر بھیجے تو ۲۴ر گھنٹے کے اندر وہ کرپٹ ہو جائیں گے۔ فوطیدار صاحب ایسے خوش گفتار اور بذلہ سنج کے لیے یہ بات کہنا کوئی تعجب کی بات نہیں (چراغ بیگ اس ملاقات کے وقت موجود نہیں تھا، اس لیے اس مکالمے کی صحت کے بارے میں ضمانت نہیں دے سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بات خود فوطیدار صاحب نے کسی کو بتائی ہو۔ کیوں کہ پنڈت نہرو نے اس کا حوالہ دیا ہے۔ یہ بات قرین قیاس نہیں ہاں فوطیدار صاحب اس بات کی تردید یا

تائید کرنا پسند نہ کریں۔ ان کی خاموشی کو آپ تائید سمجھ لیجیے گا۔

چراغ بیگ نے فوطیدار صاحب کی بات کا حوالہ آپ کا جی خوش کرنے کے لیے نہیں دیا۔ کہنا یہ ہے کہ چراغ بیگ کی طرح انہوں نے بھی حکومت کی مشینری کو اندر سے دیکھا ہے اور اس کے پرزوں سے بخوبی واقف ہیں۔ اگر فوطیدار صاحب اس لطیف بات کے کہنے سے اِنکار کریں تو اسے کسی گم نام دانش ور اور دانش مند کا قول سمجھ لیجیے۔ بات بدعنوانی کی ہو رہی تھی۔ بدعنوانی صرف یہی نہیں ہے کہ سرکاری پوزیشن کا ناجائز استعمال کرکے دولت اور جائداد اکٹھا کی جائے۔ اگر اقتدار سنبھالنے کے بعد مصلحتوں کی بناء پر بے ایمانوں کی بے ایمانیوں کی طرف سے چشم پوشی کی جائے اور ان کو عدالت کے کمرے میں نہ لایا جائے تو یہ بھی بدعنوانی ہے۔ چراغ بیگ ہی نہیں بلکہ سارا کشمیر جانتا ہے کہ بڈشاہ اوّل (جو کتابت کی غلطی سے بڈشاہ ثانی ہو گئے تھے) کے عہد میں کن کن افسروں نے خزانہ عامرہ کو دونوں ہاتھوں سے لُوٹا تھا۔ یہ لوگ جس طرح بڈشاہِ اوّل کی ناک کا بال تھے، اسی طرح سنا جاتا ہے کہ آج بھی ارباب اقتدار کے ضمیروں کے نگہبان بنے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں انٹی کرپشن ٹری بیونل کے صدر مسٹر انصاری کے استعفیٰ اور پھر ان کو واپس لے لینے کی بات خاصی عبرت انگیز ہے۔ حکومت کے لیے مسٹر انصاری کے لیے اور ریاست کے عوام کے لیے، بات یہ ہوئی کہ ایک بڑے افسر کو ٹری بیونل نے بدعنوانیوں کا مجرم گردانا تھا۔ دروغ برگردنِ راوی اس افسر نے اقبال جرم بھی کرلیا تھا۔ لیکن چوں کہ اس نے اپنے سابق ولی نعمت کے خلاف کیس مرتب

کرنے میں بیش قیمت اطلاعات فراہم کیں، اس لیے ٹری بیونل کی سفارشات کو یہ کہہ کر رد کر دیا گیا کہ سفارشوں کا دور ختم ہو گیا ہے۔ اب کسی کی سفارش بھی نہیں مانی جائے گی۔ ٹری بیونل کے صدر نے اس پر احتجاج کیا اور استعفےٰ دے دیا۔ لیکن وہ اپنے فیصلے پر قائم نہیں رہ سکے۔ اُنہوں نے دوبارہ انہی شرائط پر کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس سانحہ کے بعد ٹری بیونل کی ساکھ ختم ہو گئی۔ اچھا ہوتا کہ ساکھ ختم کرنے سے پہلے ہی ٹری بیونل کو ختم کیا جاتا! لیکن یہ کشمیر ہے، یہاں سرکاری سطح پر نیک نامی اور ساکھ فضول باتیں سمجھی جاتی ہیں۔ اسی لیے فوطیدار صاحب نے جو اپنے ریاست کے لوگوں کے رگ وریشہ سے واقف ہیں، پنڈت نہرو سے وِشوامتر والی بات کہی تھی۔ بخشی غلام محمد کے سلسلے میں جو تحقیقاتی کمیشن قائم ہوا ہے۔ وہ بھی شاید عدالتی نہیں، سفارشی ہوگا یعنی جولائی تک اپنی رپورٹ حکومت کو پیش کرے گا۔ خیال ہے کہ اس رپورٹ کا عام کرنا حکومت کے اختیار کی بات ہوگی یا صیغہ راز میں رکھنا۔ اس کا قبول کرنا یا رد کرنا حکومت کے اختیار کی بات ہوگی اور یہ بڑا نازک مسئلہ ہے وہ حکومت جو دس بارہ سال میں بھکاری سے کروڑ پتی بننے والے افسروں کو اپنا معتمد بنائے ہوئے ہے۔ وہ کابینہ جس نے لیجسلیچر میں اکثریت کی تائید خریدنے کے لیے خود کو وڑدار کی توند کی طرح پھیلا لیا ہے۔ وہ حکومت گراں فروشی کی کھلی چھوٹ دیے ہوئے ہے اس کی مجبوریوں کو سمجھا جا سکتا ہے۔ بخشی غلام محمد کے خلاف فرد الزامات چراغ بیگ کی نظر سے بھی گزری۔ اس میں جو بہت سی باتیں نہیں ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہے۔

''کہتے ہیں کہ سرحدی سڑکوں کی تنظیم ''بیکن'' نے جب بانہال، پٹھان کوٹ اور سرینگر لہہ کی سڑکوں پر کام کرنا شروع کیا تو ان کا ایک دفتر سرینگر میں بھی قائم ہوا۔ ''نسان'' قسم کی جو دو جیپیں پہلی کھیپ میں آئیں اُن میں سے ایک تو کرنل صاحب نے اپنے پاس رکھی اور ایک اُس وقت کے وزیر اعظم بخشی غلام محمد کو پیش کی۔ اس کے عوض بخشی غلام محمد نے بلیوارڈ پر واقع ''بیکن'' کے افسروں کے میس کو ریاستی حکومت کی طرف سے عالی شان قالین پیش کیے۔ یہ جیپ بخشی غلام محمد کو وزیر اعظم کی حیثیت سے دی گئی تھی۔ یہ جیپ سرکاری تحویل میں ہونی چاہیے کیا حکومت یا اس کا کوئی نام نہاد ترجمان یہ بتائے گا کہ یہ نسان، جیپ کہاں ہے''۔

چراغ بیگ کی ڈائری سے:۔

(۱) شیام لال جی صراف کو بخشی صاحب نے یقین دلایا ہے کہ وہ اُنہیں کشمیر کا وزیر اعظم بنا کے ہی دم لیں گے۔

(۲) راجپوری صاحب ابھی سے بیمار ہونے کی تشہیر کر رہے ہیں تا کہ اسمبلی کے بجٹ اجلاس میں اُن کی جان خطرے سے بچ جائے۔

(۳) شیخ صاحب کے جاتے ہی تحریک ترکِ موالات، نے بھی دم توڑ دیا ہے اور اس کی اطلاع اُنہیں بحری تار کے ذریعہ دے دی گئی ہے۔

☆

۲۳/اکتوبر۱۹۶۴ء

کمنٹری کے دیوانے کرکٹ سے بیگانے

برناڈ شا نے کہا ہے (خدا جانے کہا بھی ہے یا نہیں) کہ احمق لوگ کرکٹ کھیلتے ہیں اور اس سے زیادہ احمق لوگ اس سے لُطف اندوز ہوتے ہیں۔ اپنے ہاں کرکٹ کھیلنے والے زیادہ نہیں لیکن کرکٹ سے لُطف اندوز ہونے والے لوگ بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔ ان دنوں چوں کہ کرکٹ کا سیزن شروع ہو چکا ہے اس لیے جگہ جگہ کرکٹ سے لُطف اندوز ہونے والے شائقین دکانوں پر، ہوٹلوں میں، سڑکوں کے کنارے کرکٹ نہیں بلکہ کمنٹری کا لُطف اُٹھا رہے ہیں۔ معلوم نہیں کہ کمنٹری سے لُطف اندوز ہونے والوں کے بارے میں برناڈ شا کا کیا خیال تھا۔ لیکن چراغ بیگ ان کمنٹری بازوں کے بارے میں بہت اچھی رائے رکھتا ہے۔ کرکٹ کھیلنا تو میری سمجھ میں آتا ہے، کرکٹ کے کھیل کا مشاہدہ بھی کسی حد تک سمجھ میں آسکتا ہے، لیکن ہزاروں میل دور کھیلے جانے والے کھیل کا آنکھوں دیکھا حال سُن کر اس سے لُطف اندوز ہونا میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا ہے۔ یہ کمنٹری باز شائقین بڑی دلچسپ مخلوق ہیں۔ ان میں سے اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جنہوں نے زندگی بھر کوئی کرکٹ میچ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا ہے انہیں یہ

بھی معلوم نہیں یہ کھیل لاٹھیوں سے کھیلا جاتا ہے یا رسیّوں سے۔ لیکن انہیں کمنٹری سُننے کا اس قدر چسکا ہے کہ ریڈیو کے ساتھ گوند کی طرح چپک جاتے ہیں۔ انہیں کرکٹ کی سبھی تکنیکی اصطلاحیں ازبر یاد ہیں۔ گوگلی، بونڈری، چوکا،، بمپر، ایل، بی، ڈبلیو، رن آؤٹ، کیچ آؤٹ، ناٹ آؤٹ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن خدا گواہ ہے کہ انہیں یہ معلوم نہیں ہے کہ گوگلی اور بمپر میں کیا فرق ہے۔ انہیں یہ بھی ٹھیک سے معلوم نہیں کہ باؤلنگ اور بیٹنگ میں کیا فرق ہے لیکن جہاں کمنٹیٹر نے جوش میں آکر کہا کہ He is out تو وہ یوں اُچھل پڑتے ہیں کہ جیسے ان ہی کی گیند سے کوئی کھلاڑی آؤٹ ہو گیا ہو۔ پھر جب کمنٹیٹر نے کبھی غصے میں آکر کہا Oh,he has dropped the catch تو ان کے چہرے پر غصے کی ایک لکیر دوڑ جاتی ہے اور وہ ہزاروں میل دور بیٹھ کر یہ فیصلہ دیتے ہیں کہ کھلاڑی کو ایک قدم آگے آکر ''کیچ'' کرنا چاہیے تھا۔ بعض اوقات بلکہ اکثر اوقات وہ کپتان کی صلاحیتوں پر شُبہ کرنے لگتے ہیں کہ اسے فلاں کھلاڑی کی جگہ فلاں کھلاڑی کو رکھنا چاہیے تھا وغیرہ وغیرہ۔ میرے ایک بہت ہی عزیز دوست تھے۔ ۱۹۵۸ء میں انہیں پہلی مرتبہ کرکٹ کا نہیں، کرکٹ کمنٹری کا عارضہ لگ گیا۔ جب سے ان کی حالت روز بروز بگڑتی جارہی ہے، جہاں کہیں کرکٹ کا میچ شروع ہوا، وہ ریڈیو کے ساتھ چپک گئے۔ لگے تالیاں بجانے، مُنہ بنانے اور بعض اوقات چھاتی پیٹنے، کرکٹ کمنٹری سُنتے سُنتے ان کے چہرے پر ایک رنگ آتا ہے، ایک رنگ جاتا ہے۔ اخبار میں وہ سب سے پہلے سپورٹس کا صفحہ دیکھیں گے۔ ہر کھلاڑی کا نام، اس کی صفات، مختلف میچوں میں اس کے بنائے ہوئے رنوں کی اوسط،

گُل سنیچریاں وغیرہ وغیرہ۔ سب اُسے زبانی یاد ہیں۔ لیکن انہوں نے اپنی زندگی میں ایک مرتبہ بھی کرکٹ میچ نہیں دیکھا ہے۔ کرکٹ کمنٹری سُننا تو اب اپنے ہاں فیشن میں داخل ہو گیا ہے اور جب کبھی میچ ہو رہا ہو تو دِن میں آپ جہاں بھی جایئے ہر جگہ آپ سے یہی سوال ہو گا کہ کہیئے کیا سکور ہے؟ اس لیے اس سوال کا جواب دینے کے لیے آپ کو ہر وقت تازہ ترین سکور سے اپنے آپ کو لیس رکھنا ضروری ہے۔ پھر مصیبت کا خاتمہ یہیں نہیں ہوتا۔ اس کے بعد آپ سے پوچھا جائے گا کہ کون کون آؤٹ ہوا ہے، کس حالت میں آؤٹ ہوا؟ ہر کھلاڑی کے کھیل پر الگ الگ تبصرہ ہو گا مثلاً یہ کہ پٹودی تو اچھا کھیلا، لیکن جیسا پچھلے سال کھیلا تھا، اس سال نہیں کھیلا۔ دُرانی فارم میں نہیں ہے۔ ہماری ٹیم کو اتنا Desperate کھیل نہیں کھیلنا چاہئے تھا۔ نڈکرنی نے لاج رکھ لی، نہیں تو ہم یہ میچ بھی ہار گئے ہوتے! پٹودی کو اس مرحلے پر Offensive کھیل شروع کرنا چاہیے تھا وغیرہ وغیرہ۔ اب آپ ہی بتایئے کہ جن لوگوں نے کبھی زندگی بھر اپنے ہاتھ میں کرکٹ کا بیٹ یا بال نہ لیا ہو، وہ اس قطعیت کے ساتھ فیصلے دینے لگیں تو چراغ بیگ پر کیا گزرے گی اور پچھلے کئی دنوں سے جب سے کہ آسٹریلیا اور ہندوستان کے درمیان ٹیسٹ میچ شروع ہو گئے ہیں، میری تو جان پر بن آئی ہے مُجھ کو نہ اس کھیل سے دلچسپی ہے اور نہ اس کے آنکھوں دیکھے حال سے۔ لیکن میرے اردگرد کی ساری دنیا دیوانی ہو گئی ہے۔ لاری، ہمسپن کوپُر، بوتھ، پٹودی، بنونت، دُرانی یہ نام سُنتے سُنتے میرے کان پک گئے ہیں۔ جہاں جایئے ریڈیو کے اردگرد کمنٹری بازوں کا ایک اژدہام ہے۔ اس ہنگامے سے دور بھاگنے کی کوشش

کیجیے تو کوئی ٹرانسسٹر آپ کا پیچھا کرے گا۔ اور جہاں ٹرانسسٹر سے بھی قرار نصیب ہوا وہاں کوئی اجنبی یہ کہہ کر پریشان کرے گا: Excuse me, what is the latest score آپ نے بتا دیا تو پھر آپ کو اس کی تنقید میں شریک ہونا پڑے گا۔ نہیں بتایا تو اس سے آپ کے مہذب ہونے پر شک ہوگا۔ مجھے کرکٹ کے کھیل سے نفرت نہیں یہ ضرور کوئی دلچسپ کھیل ہوگا، نہیں تو انگریز قوم اس کے لیے دیوانی نہ ہو جاتی! مجھے کمنٹری سُننے پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔ کیوں کہ ہوسکتا ہے کہ کرکٹ کھیلنے والوں یا کرکٹ پسند کرنے والوں کو کمنٹری سُننا بھی اچھا لگتا ہو۔ لیکن مجھے خدارا یہ بتائیے کہ وہ لوگ جنہیں اس کھیل کے مبادیات سے بھی واقفیت نہیں وہ کمنٹری سُن سُن کر اپنا وقت ضائع کیوں کرتے ہیں؟ وہ کسی کے کیچ آؤٹ ہونے پر خوش کیوں ہوتے ہیں؟ وہ کسی کھلاڑی کے ایل۔ بی۔ ڈبلیو ہونے پر اُداس کیوں ہوتے ہیں؟ اور پھر وہ کپتان کی صلاحیتوں اور اس کے فیصلوں پر تنقید کرنے کی جرأت بے جا کیوں کرتے ہیں؟

پچھلے کئی دِنوں سے کرکٹ کی بڑی گرم بازاری ہے۔ عالمی سیاست میں بھی دلچسپ کھیل جاری ہے۔ پچھلے ہفتے روس میں نکیتا کروشچیف رن آؤٹ ہوگئے وہ پچھلے کئی سال سے بڑے فارم میں تھے اور کافی رَن بنا چکے تھے بلکہ ان کے حساب میں کئی سینچریاں بھی جمع تھیں۔ لیکن پچھلے ہفتے مخالفین نے کچھ اس زور کی فیلڈنگ کی کہ وہ رن آؤٹ ہو ہی گئے۔ ان کی جگہ مسٹر کوسی جن نے لی ہے چراغ بیگ کا خیال ہے کہ اب مسٹر کروشچیف کو دوسری اننگس کھیلنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ انہیں ہمیشہ کے لیے آؤٹ کر دیا گیا ہے۔

چین نے بھی ایک زبردست بمپر مارا ہے ۔ اس قسم کے کھیل کو Offensive کہتے ہیں ۔ سوال یہ ہے کہ اب کون سا مُلک باؤلنگ کے لیے منتخب ہوگا ۔ ایٹم بم کی گوگلی نے اچھے کھلاڑیوں کے اوسان خطا کردئے ہوں گے ۔ چراغ بیگ کو اُمید ہے کہ چین حسب دستور فاؤل کھیلے گا ۔ کیونکہ چینیوں کے لیے گیم کے قواعد وضوابط کا احترام کرنا اتنا ہی مُشکل ہے جتنا انگریز کیلیے ان کی خلاف ورزی ! برطانیہ میں تیرہ سال بعد لیبر پارٹی نے ٹاس جیتا ہے لیکن ان کی ٹیم کنسرویٹو کے مقابلے میں خاصی کمزور ہے ۔ دیکھئے کپتان وِلسن کنسرویٹو پارٹی کی باؤلنگ کے سامنے ٹِک جاتے ہیں یا نہیں ؟ امریکہ میں اگرچہ میچ ابھی شروع نہیں ہوا ہے لیکن اندازہ ہے کہ وہاں بھی دونوں ٹیموں میں مقابلہ سخت ہوگا ! ری پبلکن ٹیم کے کپتان گولڈ واٹر فاسٹ باؤلنگ میں اپنا جواب نہیں رکھتا ۔ اس کے مقابلے میں پریذیڈنٹ جانسن لیگ بریک باؤلر ہے دیکھنا یہ ہے کہ بیٹنگ کس سائڈ کی اچھی ہے !

اپنے ہاں کشمیر میں بھی پچھلے ایک سال سے ایک دلچسپ میچ جاری ہے ۔ بخشی غلام محمد اگست ۱۹۶۳ء میں کامراج کی باؤلنگ سے ایل ، بی ، ڈبلیو ہوگئے تھے ۔ لیکن وہ آؤٹ ہونے کے بعد بھی میدان سے باہر نہیں آئے ۔ ایمپائروں نے کئی بار تنبیہ کی کہ کھیل کے میدان سے باہر آیئے ۔ چراغ بیگ نے بھی ہاتھ جوڑے کہ سرکار آپ اب آؤٹ ہوگئے تو کھیل کے میدان سے تشریف لے جایئے ۔ لیکن وہ نہ مانے ۔ وہ برابر بمپر اور چوکے مارتے گئے اور ابھی حال ہی میں ایک بونڈری لگانے والے تھے کہ عین وقت سے کچھ دیر پہلے زبردستی آؤٹ بلکہ ناک آؤٹ کردیا گیا ۔

نومبر ۱۹۶۴ء

ڈی پی صاحب روٹھ نہ جائیے

چراغ بیگ کو یہ سُن کر بڑی کوفت ہوئی ہے کہ مملکتِ کشمیر کے وزیر باتدبیر شری درگا پرشاد در کا جی آج کل دنیا سے اُچاٹ ہوگیا ہے۔ چراغ بیگ قسم کھا کر کہتا ہے کہ اُس کا نام بڑا ہی غیر رومانی ہے لیکن اُس کا دِل بڑا رومان پسند ہے۔ اُسے معشوق کا بسورتا چہرہ ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ ڈی پی صاحب میں لاکھ عیب سہی (نعوذ باللہ) لیکن اس بات سے تو اُن کے دُشمن بھی انکار نہیں کریں گے (جس میں چراغ بیگ کو شامل ہونے کا فخر حاصل نہیں) کہ جب وہ مُسکراتے ہیں تو سارا ماحول مُسکرا اُٹھتا ہے اور جب اُن کے چہرے پر خشم کی لکیریں اُبھر آتی ہیں تو آسمانِ سیاست میں طوفان کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔ اب ڈی پی صاحب کی شخصی رعنائیوں میں اقتدار کبیر نائیاں بھی شامل ہوگئی ہیں۔ اس لیے اُن کے ماتھے پر پڑنے والی ہر شکن کے ساتھ کشمیر کی تقدیر کی گرہ وابستہ ہے۔ کون ہے وہ جو اپنی تقدیر کو تبسم ریز نہیں دیکھنا چاہے گا لیکن چاہنے والوں کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ اصل معاملہ تو کرم فرما کے مُوڈ اور مزاج پر منحصر ہوتا ہے اور اقتدار حاصل کرنے کے بعد مُوڈ اور مزاج تیزی سے طوفان آلود ہو جانے کی طرف مائل

ہو جاتے ہیں۔ چراغ بیگ کے بس میں ہوتا تو وہ ڈی پی صاحب کے چہرے سے ملال کی گرد دھو کر اُن کے منہ سے پھر قہقہے سُننے کے لیے سب کچھ داؤ پر لگا دیتا۔ مگر سُنا ہے کہ ڈی پی صاحب نے اپنی ''خوش مزاجی'' کی شرائط بڑی کٹھن رکھی ہیں۔ اُن کا کہنا یہ ہے کہ کشمیر میں عوام اور اخبار نویس دونوں گستاخ اور بد تمیز بن گئے ہیں۔ گھڑی گھڑی سرکاری ایڈمنسٹریشن میں سُدھار کی رٹ لگاتے رہتے ہیں۔ جہاں کہیں تھوڑی سی چوک ہوئی تو آسمان سر پر اُٹھا لیتے ہیں۔ ڈی پی صاحب کا خیال ہے کہ عوام کو یہ نکتہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ جس انتظامیہ کے ساتھ اُن کا تعلق ہو اُس میں کسی قسم کی خامی نہیں ہو سکتی اور اگر بالفرض محال کہیں بھولے سے نظر آ بھی جائے تو اُس کی طرف اشارہ کرنا ایک دم مُلکی مفاد سے غداری کے برابر ہے۔ جب کسی سِتم ظریف نے ڈی پی صاحب کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرائی کہ وہ آج سے کئی سال پہلے خود بھی حکومت کی ان خامیوں کے بڑے نکتہ چین رہے ہیں تو ڈی پی صاحب جھٹ سے بول اُٹھے کہ عوام کا سب سے بڑا مطالبہ تو یہی تھا کہ مجھے وزیر داخلہ بنا دیا جائے۔ کیا اس کی تکمیل کے بعد اُن کا کوئی اور مطالبہ بھی باقی رہ گیا ہے؟ ایڈمنسٹریشن میں سب سے بڑی خامی یہی تو تھی کہ اقتدار میرے ہاتھ میں نہیں تھا۔ یہ بُنیادی خامی دور ہو گئی ہے تو باقی بھی ہوتا رہے گا۔ ڈی پی صاحب کی ایک اور شکایت یہ ہے کہ کشمیر کے لوگ کھل کر بات نہیں کرتے بلکہ رمز و کنایہ کے سہارے اُن پر طنز کے تیر برساتے رہتے ہیں۔ مثلاً جب کہیں یہ بات کہی جاتی ہے کہ ابھی حکومت میں

"بخشی ذہنیت" کے آثار نمایاں ہیں۔ تو اشارہ میری ہی طرف ہوتا ہے۔ اسی طرح سے ڈی پی صاحب بے ضابطگی، عوام، آزادی اور فرعون مزاجی کی اصطلاحوں سے بھی بہت چڑتے ہیں۔ چراغ بیگ اُن کی خدمت میں بڑے ادب سے عرض کرتا ہے کہ حضور روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ۔ آپ خواہ مخواہ حسّاس بنتے ہیں۔ چھوڑیے ان معاملوں کو آپ کا یہ بسورتا منہ آپ کے چاہنے والوں کو بڑا پریشان کرتا ہے۔ آپ کے چہرۂ زیبا پر تو میٹھی مُسکان ہی اچھی لگتی ہے اور پھر آپ تو اقتدار کی مسند پر اپنے سب سے اچھے موڈ میں ہوتے ہیں۔ باقی رہا اصطلاحوں میں معنی ڈھونڈنے کا مسئلہ یہ دور کی کوڑیاں ہیں۔ آپ اپنا سر کیوں کھپاتے ہیں۔ آپ نے جی زیادہ خراب کیا تو یار لوگوں کو خواہ مخواہ "چور کی داڑھی میں تنکا" کی مثل یاد آئے گی۔ جہاں تک گستاخی کا تعلق ہے ہم تو آپ کے تابع دار ہیں۔ آپ کو پیار پر خواہ مخواہ غصہ آتا ہے، حالاں کہ ہمیں آپ کے غصے پر بے ساختہ پیار آتا ہے۔ غصہ تھوک لیجیے۔ گُستاخی کا کوٹا مقرر کر دیجیے۔ آپ کی خاطر ہم آپ کی بارگاہ ہی میں اپنا راشن کارڈ لے کر حاضر ہو جائیں گے۔ یا آپ نکتہ چینی کا بلیٹن وزارت داخلہ سے ہی شائع کیا کریں۔ لیکن محفلوں سے روٹھ نہ جایئے۔ آپ کو کیسے یقین دِلاؤں کہ آپ کی پیاری پیاری صورت دیکھے بغیر چراغ بیگ کو ہر محفل سونی سونی لگتی ہے۔ دُنیا اُجاڑ معلوم ہونے لگتی ہے۔ صادق صاحب کی متانت اور اُن کی طبیعت کی سنجیدگی اس قدر پختہ ہے کہ اُنہیں دور سے دیکھنے والا اُن کے سامنے زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے بھی گھبراتا ہے۔ اس میں صادق

صاحب کی خشک مزاجی کا نہیں بلکہ اُن کی شخصیت کی تہذیب اور شائستگی کا زیادہ حصہ ہے۔ سیاسیات کے ساتھ ساتھ وہ فنونِ لطیفہ میں اپنے شغف کے معاملے میں بھی بے حد اعتدال پسند اور بے حد مہذب ہیں۔ لیکن کبھی کبھی موقع محل کی مناسبت سے اُن کے اس پُر وقار ضبط کے بند ٹوٹ جاتے ہیں اور اُس وقت اُن کی دِل فریب شخصیت نگاہوں کے سامنے پوری رعنائی کے ساتھ آتی ہے۔ پچھلے دِنوں جموں و کشمیر پولیس کی سالانہ تقریب میں وہ نادر موقعہ آیا جب صادق صاحب تقریب کی دلچسپیوں میں کھو گئے پولیس کانسٹبلوں کی ''چھکری'' پارٹی جھومتی جھامتی آئی اور اُنہوں نے ''ٹُنبک ناری'' کی گت پر یہ بول چھیڑ دیے۔

صادق صاٗب چھُے ایمان دار
صادق صاٗب چھُے ایمان دار
کٗشیرِ سوزِو تومِلہٕ اَنبار
صادق صاٗب چھُے ایمان دار

چھکری کی دُھن میں مستی آتی گئی۔ محفل گرم ہوتی رہی اور صادق صاحب بھی اس فضا سے الگ نہ رہ سکے۔ اسی عالم میں ایک ہیڈ کانسٹبل نے آواز لگائی۔

مےٗ بناوِ نا حوالدار
صادق صاٗب چھُے ایمان دار

صادق صاحب نے اُسی وقت اس کانسٹبل کو بُلایا اور اُس کے ہیڈ

کانسٹبل بنائے جانے کا حکم دے دیا۔ چراغ بیگ کہیں کونے میں چھپا ہوا تھا۔ اُسے صرف یہی حسرت تھی کہ وہ کیوں چھکری میں شامل نہیں ہے۔ کیوں کہ صادق صاحب اُس وقت شعر ونغمہ کے جادو سے اُس عالم میں پہنچ گئے تھے جہاں وہ کوئی بھی فرمائش پوری کرنے پر آمادہ تھے۔ چراغ بیگ چھکری میں شامل ہوتا تو یوں پُکارتا ؎

ما صأب بوز سأئی زار
أسی گر ڈی پی صأبن خار
کڈِتھ ژھینٛ تن از دربار
صادق صأب چُھے ایمان دار

مگر افسوس وہ تو مائل بہ کرم تھے لیکن سائل بے چارہ خاموش تھا۔

پہلی کشمیری فیچر فلم ''مأنزِ راتھ'' کا مہورت اسی ہفتے صادق صاحب نے انجام دیا۔ مگر یہ مہورت بھی اپنی قسم کا نرالا مہورت تھا۔ فلم تقریباً پوری کی پوری تیار ہے۔ لیکن صادق صاحب کو بتایا گیا تھا کہ مہورت کا پہلا شاٹ اُن ہی کے ہاتھوں سے انجام دیا جانا لازمی ہے۔ صادق صاحب نے تقریر میں تو کہہ دیا کہ وہ مہورت وغیرہ کے قائل نہیں ہیں لیکن فلم سازوں کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ وہ غلط بیانی سے دامن بچاتے اور وزیر اعظم کے ساتھ مذاق کی جسارت نہ کرتے چراغ بیگ کو معلوم ہوا ہے کہ یہ فلم گو کشمیری زبان میں بنائی جارہی ہے اوراس میں کشمیری اداکار کام کر رہے ہیں لیکن اس کی کہانی میں وہ سب خامیاں موجود ہیں جنہیں غیر کشمیری ادیبوں کی کہانیوں میں دیکھ کر

کشمیری ادیب آسمان سر پر اُٹھاتے رہے ہیں اور جب یہ فلم بن کر تیار ہو جائے گی تو کشمیری معاشرت کا ایک بڑا ہی بھونڈا رُخ پیش کرے گی جس کا اصلیت سے کوئی تعلق نہیں۔ جب چراغ بیگ نے اس معاملے کی طرف فلم سے وابستہ ایک کشمیری دوست کی توجہ دلائی تو وہ جھٹ سے بول اُٹھا کہ آپ نے وہ مثل نہیں سُنی ہے کہ ایک غیر مُسلم مغرب کی طرف بیٹھ کر پیشاب کر رہا تھا، ایک خان آیا اور اُسے دھتکارا کہ بھئی نہیں دیکھتے کہ اس طرف قبلہ ہے۔ بے چارہ غیر مسلم شرمندہ ہوا اور اس نے معافی مانگی۔ لیکن دوسرے روز جب خان صاحب مغرب کی طرف مُنہ کر کے وہی فعل دہرا رہے تھے غیر مسلم نے اُسے پوچھا ''حضرت یہ کیا؟'' خان صاحب نے غراتے ہوئے جواب دیا۔ اپنا قبلہ ہے، جو چاہے گا کرے گا۔ تم کون ہوتا ہے؟ اسی طرح کوئی غیر کشمیری ناواقفیت کی بنا پر ہمارے کلچر، ہماری تاریخ اور ہماری معاشرت کی غلط تصویر کشی کرتا ہے تو وہ قابلِ گردن زدنی ہے۔ لیکن جب ہم کشمیریوں کا اشتراک اُسے حاصل ہو تو پھر سب ٹھیک ہے۔ چراغ بیگ کشمیری زبان کی فلم کا دِل سے خیر مقدم کرتا ہے۔ لیکن اُس کی خواہش یہ ضرور ہے کہ جس طرح اداکاری، مکالمہ نگاری اور دوسری چیزوں کے لیے کشمیری فن کاروں کو چُنا گیا تھا اُسی طرح کشمیر کے ہی کسی افسانہ نگار کو کہانی لکھنے کا بھی موقع دیا جاتا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم کشمیری زبان میں لکھے گئے مکالمے سُننے کے شوق میں خود اپنی ہی ماں بہنوں کو گالی نہ دے دیں۔ پھر تو بمبئی کے فلم ساز ہمارے سر پر سوار ہو جائیں گے جنہیں آج تک ہم نے ڈرایا دھمکایا ہے۔

دسمبر ۱۹٦۴ء

'شیر کشمیر نمبر' بد سلیقگی کا شاہکار

اگلے وقتوں کی بات ہے دہلی میں ایک شاعر رہا کرتے تھے خان آرزو۔ ان ہی حضرت کا قول ہے کہ ناموزوں دعا سے موزوں گالی زیادہ اچھی لگتی ہے۔ چراغ بیگ بزرگوں کے کہنے کا یوں تو احترام کرتا ہے لیکن صرف اُن کا کہا ہونے کی وجہ سے وہ ہر ایک کلمۂ کُفر کو اپنی گرہ میں نہیں باندھتا۔ مگر دیکھیے کیا لگتی ہوئی بات کہی ہے خانِ آرزو نے واللہ طبیعت پھڑک اُٹھی ہے اور اگر آپ کو اس کی صداقت کا باور نہیں تو مبلغ دو روپے ضرب ڈبل خرچ کر کے ''شیر کشمیر نمبر'' خریدیے (اگر دو روپے جیب میں نہیں ہیں تو روگناتھ ویشنوی صاحب کے پاس جایئے۔ وہ آپ کو اپنا مضمون پڑھنے کی اُجرت ایک عدد چائے فوراً ادا کر دیں گے) نمبر دیکھیے۔ اور پھر یاد کیجیے کہ موزوں گالی اس ناموزوں دُعا سے کس قدر دلچسپ ہو سکتی تھی۔ اور جب کارِ نجار بدستِ گلکار کیا جاتا ہے تو شیخ صاحب جیسے مجسمۂ جلال و جمال کو بھی کسی فقیر کا خرقہ پہنا دیا جاتا ہے۔ شیخ صاحب کا کوئی سلیقے کا مخالف اگر اُن کی مخالفت میں اس سے دس حصے کم سرمایے پر نمبر نکالے تو اُس میں بھی شیخ صاحب کی درخشاں شخصیت کی کرنیں چھن چھن کر باہر آئیں

گی۔ لیکن اس نمبر کے مُرتبین کے پنواڑی پنے کی داد دیجیے کہ اُنہوں نے شیخ صاحب کی جلیل القدر شخصیت پر تو ہم پرستی، سطحی جذباتیت اور سستی نعرے بازی کا خول پڑھا دیا ہے۔ جس شخص کے لیے کشمیر کے لوک سنگیت میں ہزاروں نامعلوم گیت تخلیق کیے گئے ہیں اُس کی تعریف میں فرضی قصائد کے لیے شعرا کا کلام تک بے ہنگم انداز سے تجویز کیا گیا ہے۔ جیسے 'ابن حسن' 'شاعر' وغیرہ۔

اس نمبر کے بحر بیکراں میں غلطیوں کا شمار ممکن نہیں ہے۔ کیوں کہ 'اُونٹ رے اُونٹ تیری کون سی کل سیدھی' کے مطابق آپ یہ دیکھیے کہ اس میں کون سی چیز غلط نہیں ہے۔ ساتویں صفحے پر شیخ صاحب کی ایک تصویر ہے۔ اچھی بھلی تصویر۔ شیخ صاحب نکٹائی پہنے ہوئے ہیں اور چہرے پر ریش ہے لیکن ایڈیٹر صاحب نے نیچے یہ شعر چپکا دیا ہے۔

جہاں میں اہل ایمان صورت خورشید جیتے ہیں
ادھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے ادھر نکلے

چراغ بیگ کو اس شعر اور تصویر میں کوئی ربط تو نظر نہیں آیا۔ لیکن شاید مطلب یہ ہو کہ ریش اُن کے چہرے سے غائب ہو کر ''مولوی صاحب'' کے چہرے میں ''صورتِ خورشید'' پھر نمودار ہو گئی ہے۔ دسویں صفحے پر ایک اور تصویر ہے شیخ صاحب مُنہ کھولے ہوئے ہیں اور اُن کے دانت دکھائی دے رہے ہیں۔ دونوں ہاتھ حرکت میں ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی نکتے پر شدومد سے گفتگو کر رہے ہیں لیکن ایڈیٹر صاحب نے یہ جُملہ چپکا دیا ہے۔

''کسی گہرے غور وفکر میں''۔ اگر شیخ صاحب کی غور وفکر کے وقت یہ حالت ہو جاتی ہے تو پھر خدا ہی حافظ ہے! اب یہ تصویر دیکھئے۔ شیخ صاحب نہرو جی کی قیام گاہ پر اُن کے ساتھ ہیں۔ بیگ صاحب اندرا جی اور فاروق عبداللہ کے علاوہ اس تصویر میں ڈاکٹر سوشیلا نائر بھی کھڑی ہیں۔ لیکن ایڈیٹر صاحب نے قلم کی ایک ہی جُنبش میں اُنہیں شریمتی لکشمی مینن بتایا ہے سمجھے اب آپ اُس شعر کے معنی۔

جو چاہے آپ کا ''قلم'' کرشمہ ساز کرے

اب ہم ترتیب کے صفحے پر پہنچے ہیں لیکن آپ گھبرا کیوں گئے۔ ڈیڑھ انچ موٹی یہ دو سیاہ لکیریں خاکم بدہن کسی ماتمی علامت کی نشانی نہیں ہیں یہ تو ایڈیٹر صاحب نے دو کالموں کو ایک دوسرے سے جُدا کرنے کے لیے لگائی ہیں۔ چراغ بیگ کی اُن سے آئیندہ کے لیے صرف یہی استدعا ہے کہ دو کالموں کو ڈبل سپیس کی دو پتلی پتلی لکیروں سے بھی علاحدہ دِکھایا جا سکتا ہے۔

اب دیکھیے یہ شوا جی راؤ کا پیغام۔ آپ کا کہنا ہے کہ کشمیر کے مسئلے کا بہترین حل ہے۔ ''آزاد کشمیر'' ......بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی۔ غضب ہو گیا۔ یہاں تو محاذ کے لیڈر حاشا وکلا ''آزاد کشمیر'' کے نام سے ہی انکاری ہیں۔ آپ نے کیوں یہ راز فاش کر دیا؟ اور محاذ کے ایڈیٹر خیر ــــ یہ تو رازِ درون پردہ ہے۔ یہ دیکھیے یہ حفیظ جالندھری کی وہ نظم ہے جو اُنہوں نے شیخ صاحب کی رہائی پر راول پنڈی ریڈیو کے کشمیر سیکشن کے لیے ۲۵ روپے کنٹریکٹ پر لکھی تھی (شاعر اسلام کنٹریکٹ ملنے پر کفر کی تعریف

میں بھی نظم لکھتے ہیں) اس میں اُنہوں نے شیخ صاحب کے علاوہ بیگ صاحب، مسعودی صاحب، قرہ صاحب، چکن صاحب، صوفی محمد اکبر صاحب کو بھی سلام کہا تھا۔ لیکن ایڈیٹر صاحب نے ان بے چاروں کو بیک جُنبش قلم خارج کر دیا ہے (جیسے ریڈیو کشمیر کا کوئی پیکس رحمان راہی صاحب کی نظموں کے بندوں کے بند کاٹ لیتے ہیں اور وہ پچیس روپے کے لالچ میں بھیگی بلی بن کر چُپ رہتے ہیں) یہ کسی صاحب کا مضمون ہے "سابق ایڈیٹر خدمت" اس پر عنوان ہے۔ ارے ستم گر واس ممتاز صف میں تو غلام الدین گانی سے محمد امین پنڈت تک سینکڑوں جانباز رہ چکے ہیں۔ صاف کیوں نہیں لکھتے کہ یہ مضمون فرضی ہے۔

آیئے اب بیگ صاحب کے انٹرویو پر نظر ڈالتے ہیں۔ حالاں کہ صفحات کی اُلٹ پھیر میں یہ انٹرویو بیگ صاحب سے زیادہ چراغ بیگ کا انٹرویو معلوم ہوتا ہے) بیگ صاحب سے پوچھا جاتا ہے "آپ کو شیخ صاحب کی کون سی خوبی پسند ہے؟"

جواب ہے 'اُن کی ماس اپیل...... قرآن خوانی' تو یہ بات ہے۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ ان دو جلیل ہستیوں کے درمیان نظریات کا بندھن ہے عقائد کا رشتہ ہے۔ سیاسی ہم آہنگی کا ربط ہے یہ تو بالکل ہی نئی بات ہوئی۔ کیوں کہ یہ دونوں چیزیں شیخ صاحب سے زیادہ اور لوگوں کے یہاں بیگ صاحب کو مِل سکتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ دلیپ کمار کی ماس اپیل اُن سے زیادہ ہے اور قاری فیض اللہ کی لحن اُن سے زیادہ دِل کش اور عربی تلفظ اُن سے ہزار گُنا بہتر

ہے۔ چراغ بیگ کا اب بھی خیال ہے کہ بیگ صاحب کا جواب یہ نہیں ہوسکتا۔ یہ تو ایڈیٹر صاحب نے اُن کے ساتھ چپکا دیا ہے لیکن صوفی محمد اکبر صاحب کو کیا جواب دیجیے۔ بڑی بی تو بڑی بی، چھوٹی بی سُبحان اللہ۔ اُن سے پوچھا گیا ہے کہ شیخ صاحب کی مقبولیت کا کیا سبب رہا ہے اور اُن کا جواب ہے کہ خوش الحانی، نعت خوانی اور قرآن خوانی ـــ ایں خانہ تمام آفتاب است!

غلام محمد شاہ صاحب کا ایک اور مضمون ہے جس میں وہ انکشاف کرتے ہیں۔ شیخ صاحب نے آج کل سیاست میں اپنا اعتماد بیگ صاحب اور اوقاف میں شاہ صاحب کو دیا ہے۔ گویا مسعودی صاحب، کوچک صاحب، قرہ صاحب وغیرہ یوں ہی ''نہ تین میں نہ تیرہ میں'' گنگنا رہے ہیں۔

شیخ صاحب کے خطبات اور خطوط کی بے حد غلط اور بھونڈی کتابت کی گئی ہے۔ لیکن دو مضامین کے لیے خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ ایڈیٹر صاحبان کے مضامین کے لیے ایک آفسیٹ میں چھاپا گیا ہے اور دوسرا بے حد نفیس کاتب سے لکھوایا گیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان حریری پردوں کو اُٹھا کر ان کی تہہ میں کچھ نظر نہیں آتا۔ شیخ صاحب کی سیاسی شخصیت کو مرکوز کرنے کی بجائے اُن کے متعلق سُنی سنائی روایتی باتوں کو حقائق مانا گیا ہے، جیسے شیخ صاحب بیسویں صدی کے سیاست دان نہیں ہیں بلکہ سولہویں صدی کے مجاور ہیں۔

آپ ہمت ہار گئے۔ چراغ بیگ کو بھی ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔

<u>چراغ بیگ کی ڈائری سے:۔</u>

(۱) نیشنل کانگریس کے افتتاح پر اس کے تمام ممبر شپ فارم ایک گھنٹے

کے اندر اندر اُسی طرح بلیک میں فروخت ہونے لگے جس طرح پلیڈیم سینما میں تھرڈ کے ٹکٹ بکتے ہیں...... ممبر شپ فارموں کی کل تعداد...... ۸۱

(۲) سرینگر کی بہت سی مسجدوں پر محاذ رائے شماری کے جھنڈے لہرا رہے ہیں۔ یوم جمہوریہ پر کشمیری پنڈتوں نے اس کا جواب یوں دے دیا کہ بہت سے مندروں پر کانگریس کا جھنڈا لہرا دیا۔

(۳) شیخ صاحب کو دھمکی دینے کے لیے موجودہ حکومت نے کار صاحب کا انتخاب کیا ہے تاکہ بوقت ضرورت ان دھمکیوں سے لاتعلقی ظاہر کرنے میں آسانی ہو۔

(۴) یوم احتجاج کے بعد حکومت کے بدلتے ہوئے تیور دیکھ کر محاذ رائے شماری کی طرف اب تک گیارہ عدد تردید نامے عرف معافی نامے شائع کیے جا چکے ہیں اور آئندہ یوم احتجاج کے بعد اِسی قسم کے اور تردید نامے پیشگی ہی تیار کروا لیے گئے ہیں۔

☆

دسمبر ۱۹۶۴ء

خصم ہے نگوڑا کہ دل کا زخم

پرسوں ایک منسٹر صاحب سے چراغ بیگ کی مُلاقات ہوگئی۔ منسٹر کیا ہیں، قدرت کے آرٹ بیورو کے کسی تھرڈ کلاس آرٹسٹ کا لاپروائی سے بنایا ہوا ایک کارٹون ہیں۔ ٹانگیں مسواک کی طرح (ناک تو خیر خطرناک بس بخشی صاحب کے حصے میں ہی آگئی) اور گردن اب آپ سے کیا چوری۔ اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی۔ مگر کل سیدھی یا ٹیڑھی ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ تقدیر اچھی پائی ہے۔ بخشی وزارت میں بھی نوکر اور صادق وزارت میں بھی منسٹر۔ بہرحال تعارف کی رسم نبھانے سے کیا فائدہ؟ کیوں کہ یہ صفات تو ماشاءاللہ شری ڈی پی در کے سوا اور ہر کسی منسٹر میں پائی جاتی ہیں۔ ڈی پی صاحب منسٹروں کے دلیپ کمار ٹھہرے۔ زبان پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا۔

تو خیر چراغ بیگ کی ان منسٹر صاحب سے مُلاقات ہوگئی۔ علیک سلیک کے بعد نہ معلوم چراغ بیگ کو کیا سوجھی کہ انہوں نے جھٹ سے ایک عجیب سا سوال داغ دیا۔ ”وزیر صاحب آپ دُنیا میں کسی سے ڈرتے بھی ہیں؟“ منسٹر صاحب کی ٹیڑھی گردن اس سوال کا ہتھوڑا پڑنے پر ایک لمحے

کے لیے سیدھی ہوگئی اُن کے چہرے پر ایک مضحکہ خیز مُسکراہٹ نمودار ہوئی (ویسے انہوں نے ''عام استعمال'' کے لیے اپنی خاص مُسکراہٹ کی بڑی محنت سے ریہرسل انجام دی ہے) اور بے ساختہ بول اُٹھے ''پہلے رشید صاحب سے ڈرا کرتا تھا۔ اب اپنی بیوی سے ڈرتا ہوں۔'' رشید صاحب اور بیوی کا یہ جوڑ سُن کر چراغ بیگ کی تھوتھنی بھی اُس انداز میں ہل گئی جسے عرفِ عام میں مُسکراہٹ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مکالمہ جاری رہا، چراغ بیگ نے منسٹر صاحب سے پوچھا۔ ''آپ رشید صاحب سے کیوں ڈرا کرتے تھے بھلا؟'' منسٹر صاحب بولے۔ ''ارے یار تم کو تو معلوم ہی ہے کہ رشید صاحب مزاج کے بڑے نازک تھے۔ کسی روز رشید صاحب کے پاس جا کر تھوڑی سی گُستاخی ہو جاتی تھی تو وہ برسرِ عام میری پگڑی اُتارتے تھے اور اُسے اپنے ''رحیما'' سے جوتوں میں پھینکواتے تھے۔'' چراغ بیگ نے جرح کی۔ مثلاً کس قسم کی گستاخی؟ منسٹر صاحب کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ جوش سے بولے ''یار چھوڑو ان باتوں کو، وہ شخص بڑا کمینہ تھا'' چراغ بیگ نے کہا۔ شرافت کے دیوتا، مکالمہ تو جاری رکھو۔ مجھے یہ تو بتاؤ تم نے قوم کی عزت بچانے کے لیے کس کس طرح اپنی جانِ ناتواں کو تختۂ مشق بنوایا ہے۔ یہ تو وہ عظیم قربانی ہے جس کا کشمیری قوم کبھی بدلہ نہیں دے سکے گی۔ آپ نے اپنی عزت کا جامہ تار تار کروا کے ہزاروں شریفوں کی عزت بچائی ہے۔ آپ تو مجاہد ہیں مجاہد! ''منسٹر صاحب پھر موڈ میں آگئے اور بولے۔ ''ہاں صاحب۔ مثلاً یہ کہ ایک دِن میں اُن کی بیٹھک میں گیا۔ رشید صاحب کسی ٹھیکے دار سے مصروفِ گفتگو

تھے۔ میں نے اُنہیں سلام کیا۔ اُنہوں نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ آنکھ اُٹھا کر بھی میری جانب نہیں دیکھا خیر: یہ کوئی نئی بات نہیں تھی میرے لیے۔ عمر گزری تھی اسی دشت کی سیاحی میں۔ میں نے رشید صاحب کو متوجہ کرنے کے لیے سگریٹ نکالا ایک اُن کی خدمت میں پیش کیا اور ایک خود لے لیا۔ رشید صاحب کا سگریٹ سُلگا لیا اور بعد میں بیٹھ کر اپنا سگریٹ سلگانے لگا۔ اچانک رشید صاحب کی بے توجہی ٹوٹ گئی۔ لیکن وہ مُسکرانے کی بجائے غصّے سے ہانپنے لگے اور کہنے لگے۔ ''ارے او اندھے'' یہ تمہارے سامنے کون بیٹھا تھا تمہارا...... (منسٹر صاحب کو یہ لفظ دہراتے ہوئے شرم آ گئی) اس کو سگریٹ کیوں نہیں دیا...... یا تم کو منش ٹری کا نشہ چڑھ گیا ہے۔ ایسے ایسے ایک لاکھ منسٹر دِن میں میرا بوٹ صاف کرتے ہیں۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ رشید صاحب کا بوٹ صاف کرنے لگا لیکن اُنہوں نے بوٹ کی ٹھوکر سے میرا ہاتھ ہی لہولہان کر دیا۔ میں نے ٹھیکے دار صاحب کی سگریٹ سُلگانا چاہی تو رشید صاحب نے سگریٹ ڈبی میرے ہاتھ سے چھین کر پھینک دی اور کہنے لگے۔ بس بس۔ جاؤ۔ اور ''آپا'' کے پاس بیٹھ جاؤ۔ آج سے تمہاری نوکری ختم۔ جاؤ اپنا منحوس مُنہ مجھے نہ دِکھانا۔'' میں دوزانو ہو کر رشید صاحب کے پیر دبانے لگا۔ نہیں نہیں ایسا ظُلم نہ کیجیے۔ بال بچے والا آدمی ہوں۔ مارا جاؤں گا۔ لیکن رشید صاحب ایک جُنبش ناگہانی (چراغ بیگ کو مرگِ ناگہانی یاد آ گیا) سے اُٹھے۔ رحیما کو بُلایا اور اُسے کہا کہ منسٹر کے ڈرائیور کو کہو کہ وہ آج ٹھیکے دار صاحب کے ساتھ رہے اور کل صبح پھر یہاں آ جائے۔ یہ کہہ کر رشید

صاحب اندر چلے گئے۔ ٹھیکے دار صاحب میرے ہی سامنے میری موٹر میں بیٹھ گئے اور میرے سامنے ہی میری عزت کا جنازہ موٹر کار کے روپ میں فراٹے بھرتا ہوا چلا گیا۔ چراغ بیگ نے بڑی ہمدردی سے سوال کیا۔ ''پھر۔ پھر آپ نے کیا کیا؟ منسٹر صاحب کے چہرے پر بھی بڑی بے کسی سی ٹپک رہی تھی۔ پھر۔ پھر وہی جو کیا کرتا تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ رشید صاحب دِل کے بڑے نیک تھے۔ جب میں پورے دِن رات کچھ کھائے پیے بغیر اُن کے دروازے پر رہا۔ اُن کے بچوں کو گود گود کھلواتا رہا......تو آخر کار وہ پسیج گئے سچ تو یہ ہے کہ رشید صاحب جیسا نیک دِل آدمی ڈھونڈنے سے نہ ملے گا۔ چراغ بیگ کو ہنسی آ گئی۔ اُس نے منسٹر صاحب سے کہا۔ بھئی آہستہ۔ کہیں ڈی پی صاحب نے سُن لیا تو......سمجھے......منسٹر صاحب کے چہرے پر ہوائیاں چھوٹنے لگیں۔ لیکن پھر جلال میں آ گئے۔ نہیں نہیں۔ ڈی پی صاحب کو سب معلوم ہے۔ پرسوں جب دہلی میں رشید مجھے ملا۔ تو میں نے ڈی پی صاحب کے سامنے اُس کو گالی دی اور اُسے کہا کہ ہم......ہم ......چراغ بیگ نے منسٹر صاحب کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ بے شک، بے شک آپ کی بہادری تو بے مثال ہے......لیکن یہ بتائیے کہ اپنی بیوی سے آپ کیوں ڈرتے ہیں؟'' منسٹر صاحب کے چہرے پر بڑی لطیف مُسکراہٹ نمودار ہوئی اور کہنے لگے۔ یار تم بڑے شرارتی ہو۔ یہ بڑا لمبا قصہ ہے۔ بیوی۔ بیوی ہونہہ۔ ہم دِن رات محنت مزدوری کرتے ہیں۔ اوپر سے اُس کی جھاڑ۔ رشید کے وقت میں بھی یہی کرتی تھی۔ لیکن اب تو حد ہو گئی

ہے۔ ''اب تو وہ مجھے نِگوڑا کہنے سے بھی باز نہیں آتی۔''

چراغ بیگ منسٹر صاحب کو ذرا اور کریدتے اور شاید ''شاہ نامہ بیوی'' کا یہ سین بھی نظر آ ہی جاتا۔ لیکن اُدھر سے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ چراغ بیگ نے اتفاق سے ریسیور اُٹھا لیا تو ڈی پی صاحب کے پی۔ اے گرجتے ہوئے بولے۔ ''کہاں ہے؟'' چراغ بیگ یہ تحکمانہ لب و لہجہ سُن کر گھبرا گئے اور گھبراہٹ میں اُن کے مُنہ سے نکل گیا۔ یہاں ہیں! ٹیلی فون پر آواز آئی۔ اُس کو کہو صاحب فوراً بُلاتا ہے۔'' منسٹر صاحب نے کان ریسیور سے لگا رکھا تھا۔ یہ آواز سُن کر ہی جیسے اُن کو بھڑ نے کاٹ لیا۔ وہ اُچک کر کھڑے ہو گئے اور چراغ بیگ کو پوچھے بغیر یہ جا۔ وہ جا۔ نو دو گیارہ ...... رشید صاحب سے ڈی پی صاحب تک کا فاصلہ چشم زدن میں طے ہو گیا۔ چراغ بیگ کو یہ عالم دیکھ کر علامہ اقبال کے اس شعر کے معنی پہلی مرتبہ سمجھ میں آ گئے ؎

عشق کی اِک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھتا تھا میں

چراغ بیگ کی بیاض سے چند قطعات:

۱) حکومت کشمیر کی طرف سے مرکزی وزارت اطلاعات ونشریات کو ایک احتجاجی نوٹ بھیجا گیا جس میں کشمیر کے ساتھ امتیازی سلوک پر سخت برہمی کا اظہار کیا گیا ہے۔ تازہ مثال یہ دی گئی کہ وزارت کے نیوز ریویو ۸۴۲ میں جہاں بچوں کے دن پر باقی ریاستوں کے منسٹروں کی جھلکیاں واضح طور پر پیش کی گئی ہیں وہاں شری ڈی پی در

کی صرف پیٹھ دکھائی گئی ہے۔ حالاں کہ اُن کا چہرۂ زیبا'' ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ'' کے زمرے میں آتا ہے۔

۲) شیخ صاحب کے جنم دن پر اُن کے حضور فرشی سلام بجانے والوں میں بخشی عبدالرشید کے سمدھی سیف الدین صاحب گنائی بھی تھے۔ وہ ایسے بچھ بچھ گئے کہ بعد میں شیخ صاحب نے اُن کو خاص خدمتگاروں کے ذریعہ سیدھا کروالیا۔

۳) یومِ پرچم کی تقریبات سے بچنے کے لیے خواجہ غلام محی الدین قرہ نے سیاسی بخار کا بہانہ کرا کے اپنا پنڈ چھڑ الیا۔

☆

۱۹۷۶ء

ہم سب کام چور ہیں

چراغ بیگ کے پڑوس میں پچھلے تین ہفتوں سے ایک مکان کی تعمیر جاری ہے، جس رفتار سے اس عمارتِ نو کی ساخت کا سلسلہ جاری ہے، اس حساب سے اِس کی تکمیل میں ہفتے اور مہینے نہیں، کم از کم ایک سال لگے گا۔ درجن بھر مزدور اور ترکھان ہر صبح نو بجے ''موقعِ واردات'' پر تشریف لاتے ہیں۔ لیکن اپنی تشریف آوری کے فوراً بعد وہ کام شروع نہیں کرتے، بلکہ کچھ دیر کے لیے ملک اور محلے کی سیاست پر اظہارِ خیال کرتے ہیں، اِس کے ساتھ ہی افتتاحی چائے ہوتی ہے اور ساڑھے نو، پونے دس بجے کے قریب کام شروع ہو جاتا ہے، دن میں، میں جتنی بار وہاں سے گزرتا ہوں، ہر مزدور اتنی ہی بار مجھ سے ٹائم، پوچھتا ہے۔ تنگ آ کر میں نے کئی بار سوچا، کہ اپنا پرانا ٹائم پیس ان کو تحفتاً پیش کر دوں تا کہ یہ لوگ مجھے سوئس واچ کی طرح استعمال کرنا چھوڑ دیں۔ لیکن پھر اس خیال سے کہ یہ ٹائم پیس میرے والدِ مرحوم کی یادگار ہے۔ میں اپنے ارادے سے باز آیا۔ میرا خیال ہے کہ جتنا وقت روزانہ یہ مزدور کاریگر مجھ سے ٹائم دریافت کرنے میں صرف کرتے ہیں، وہ سارا وقت اگر اس مکان کی تعمیر میں صرف ہو، کہ جس کے لیے ان کی خدمات

حاصل کی گئی ہیں تو اِس کی تکمیل میں کم از کم ایک مہینے کی بچت ہو گی، لیکن ایسا نہیں ہو گا کیوں کہ ٹائم دریافت کرنے کے علاوہ ہمارے یہ 'فنکار' دن میں متعدد بار چائے نوشی، تمباکو نوشی اور نسوار کشی سے بھی شغل فرماتے ہیں اور ایک صاحب، جو غالباً ترکھان ہیں، دن میں دو بار نماز کے بہانے کہیں غائب ہو جاتے ہیں (کچھ لوگوں نے انہیں اِس وقفے کے دوران ساتھ کے ایک باغیچے میں سوتے دیکھا ہے) اور اس طرح تعمیر مکان کا سلسلہ بڑے ''زور و شور'' سے جاری ہے۔

پرسوں کی بات ہے کہ میں ایک دکان پر بچے کے لیے جوتے خریدنے گیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ خاصی گرمی پڑ رہی تھی۔ اس لیے دکاندار صاحب پنکھے کے نیچے اپنی نشست پر دراز تھے۔ میں نے دکان میں داخل ہو کر اپنی آمد کا مدعا بیان کیا۔ دکاندار نے لیٹے لیٹے دریافت کیا کہ بچے کی عمر کیا ہو گی؟ میں نے کہا تین اور چار سال کے درمیان دوسرا سوال تھا، کون سا جوتا چاہیئے؟ میں نے جواب دیا۔ ''آپ کچھ جوتے دکھایئے، ان میں سے جو پسند آئے، لے لوں گا'' ...... ہمارے پاس اس عمر کے بچوں کے لیے جوتے نہیں ہیں۔ وہ سامنے والی دکان پر جایئے، وہاں مِل جائے گا، دکاندار نے اپنا حلیہ اور اپنی ہیئت بدلے بغیر، جواب دیا، صاف ظاہر تھا کہ اُسے میرا اِس وقت دکان میں داخل ہو کر اس کے آرام میں خلل ڈالنا سخت بُرا لگ رہا تھا۔ اور وہ کم سے کم وقت میں مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں جوتا خریدے بغیر وہاں سے چل دیا۔ یہ چار دن قبل کا واقعہ ہے، کہ میں جموں

وکشمیر بینک ریذیڈنسی روڈ سے بادامی باغ جانے کے لیے ٹیکسی کے انتظار میں تھا۔ کئی خالی ٹیکسیاں سامنے سے گزر گئیں۔ اور میں ہاتھ ہلا ہلا کر تھک گیا، لیکن ان کی ''مصروفیت'' کا یہ عالم تھا، کہ ان کا رکنا محال نظر آتا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک غیر ''متوقع حادثہ'' ہوا، ایک ٹیکسی رُک گئی، بالکل نئی نویلی، اِس میں ریڈیو بج رہا تھا۔ اور لتا منگیشکر اپنی آواز کے جادو سے ڈرائیور اور چراغ بیگ دونوں پر جادو کر رہی تھی۔ ڈرائیور نے آواز دھیمی کیے بغیر دریافت کیا کہ کہاں جانا ہے، میں نے اپنی منزلِ مقصود کا پتہ بتایا، تو اُس کے ماتھے پر کچھ شکنیں نمودار ہو گئیں۔ فرمانے لگے، ہاتھ تو ایسے دیا تھا، کہ جیسے آپ قاضی گنڈ جا رہے ہوں، اسی کو کہتے ہیں کھودا پہاڑ اور نکلی چوہیا۔ یہ کہہ کر ڈرائیور صاحب پھر سے اُڑ گئے، اور مجھے اپنا وجود چوہیا سے بھی گیا گزرا محسوس ہونے لگا۔ چند لمحوں بعد ایک اور ٹیکسی آئی، میں نے بصد آداب پوچھا، کہ بادامی باغ چلیں گے؟ اُنہوں نے بھی نہایت خوش اخلاقی سے جواب دیا، کہ معاف کیجیے، میں اِس وقت نہیں جا سکتا۔ ''اس وقت'' کے استعمال نے مجھے کچھ پریشان کر دیا اور میں نے پوچھا، کہ اِس وقت کیوں نہیں؟ جواب مِلا کہ اس وقت وہاں سے واپسی پر سواری ملنا مشکل ہے، پھر کچھ دیر بعد ایک تھری ویلر سکوٹر گزرا، میں نے اُسے روکا، وہ رُک گیا، میں نے کہا بادامی باغ چلو گے؟ جواب مِلا، ضرور چلوں گا، میں حیرت اور مسرت کے مِلے جُلے جذبات کے ساتھ سکوٹر میں بیٹھ کر بادامی باغ پہنچ گیا...... سکوٹر چلانے والا ایک پنجابی نوجوان تھا!

شہر میں کئی پیٹرول پمپ ہیں، اور ان پمپوں پر دن میں بیس بائیس ہزار روپے کی مالیت کا پیٹرول بکتا ہے۔ لیکن اگر آپ صاحب موٹر کار ہیں۔ اور آپ کی موٹر کے پہیوں میں ہوا کچھ کم ہے تو شہر کے کسی پمپ پر اِس اُمید کے ساتھ نہ جائیے کہ وہاں آپ کی مشکل حل ہو جائے گی۔ ہر پیٹرول پمپ پر ہوا بھرنے کی مشین عرصہ ہوا بے کار ہو گئی ہے اور چوں کہ پہیوں میں بھری جانے والی ہوا مُفت تقسیم ہوتی ہے۔ اس لیے ان مشینوں کا مستقبل قریب میں ٹھیک ہونا محال ہے، پیٹرول بیچنے والوں کو پیٹرول بیچنے سے اتنی فرصت کہاں، کہ وہ اپنے خریداروں کو کوئی ایسی سہولت دینے پر توجہ دیں کہ جس سے پیسے میں تو نہیں، لیکن شہرت میں اضافہ ہونے کا امکان ہو۔

''آئینہ'' جب سے روزنامہ بن گیا ہے۔ چراغ بیگ کو کچھ ذاتی تجربات اور صدمات بھی اُٹھانے پڑ رہے ہیں۔ مثلاً اخبار چھاپنے والا، رات ۹ بجے کے بعد کام کرنے پر آمادہ نہیں جب کہ روزانہ اخبار دس گیارہ بجے بعد ہی پریس میں جاسکتا ہے۔ اخبار کے کاتب مُنہ مانگی اُجرت لینے کے باوجود کام کرنے پر رضامند نہیں، اور اخبار تقسیم کرنے والے ہاکر صرف دو گھنٹے کام کرنے کے بعد اتنا تھک جاتے ہیں، کہ پھر دن بھر وہ کام کرنے کے اہل نہیں رہتے۔

یہ تو رہا پرائیویٹ سیکٹر کا حال، اب ذرا پبلک سیکٹر کی طرف آجائیے۔ سرکاری ملازمت سے عام لوگوں کی دلچسپی اور والہانہ عقیدت کی یوں تو کئی وجوہات ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ اہم وجہ یہ ہے۔ کہ سرکاری ملازمت

میں بغیر کسی کام کے مستقل معاوضہ اور مشاہرہ ملنے کی اُمید ہوتی ہے۔ اور اِسی لیے ہمارے بزرگ، ہمارے نوجوانوں کو صرف سرکاری ملازمت کے حصول کے لیے تیار کرتے ہیں۔ آپ نے سُنا ہوگا کہ آج کل سرکاری افسروں اور ملازموں نے بہ حالتِ مجبوری، مقررہ وقت پر دفتر جانا شروع کر دیا ہے لیکن آپ نے یہ نہیں سُنا ہوگا۔ کہ ان کے وقت مقررہ پر دفتر جانے سے کام کی رفتار تیز ہونے کے بجائے کچھ کم ہوگئی ہے۔ کیوں کہ دفتر میں حاضری تو محض ایک قانونی ضابطے کی تکمیل ہے۔ اصل مسئلہ تو دفتر میں بیٹھ کر کام کرنے کا ہے اور اس مسئلے کی طرف ابھی تک کسی نے توجہ نہیں دی ہے کہ وقت پر دفتر آنے سے کام کی پیداوار اور رفتار میں کتنا اضافہ ہوا ہے۔ چراغ بیگ اپنے ذاتی علم اور تجربے کی بناء پر یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ

وہی ہے چال بے ڈھنگی، جو پہلے تھی، سو اب بھی ہے!

بات دراصل یہ ہے کہ اس ملک میں مزدور سے لے کر لیڈر تک، کاریگر سے لے کر کارخانہ دار تک، ٹیکسی ڈرائیور سے لے کر ٹیلی فون آپریٹر اور چپراسی سے لے کر سیکریٹری تک کوئی شخص کام کرنے کے لیے تیار نہیں، ہر شخص کی یہی خواہش ہے کہ اُسے کم سے کم کام کے لیے زیادہ سے زیادہ اور معمولی سے معمولی چیز کے لیے زیادہ سے زیادہ دام ملیں۔ ہر شخص جسمانی مشقت اور محنت سے جی چراتا ہے اور اپنا زیادہ وقت دوسروں کی عیب جوئی میں صرف کرتا ہے۔ ہر شخص اِس کوشش میں ہے کہ اِسے بغیر حرکت کیے دولت بھی ملے اور آرام بھی۔ وہ ڈاکٹر ہو یا یونیورسٹی میں پڑھانے والا

پروفیسر وہ پریس میں کام کرنے والا مکینک ہو یا سکریٹریٹ میں کام کرنے والا بہت بڑا افسر، ہر شخص اپنے کام کے علاوہ ہر دوسرا کام کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ ہمارا ملک کام چوروں، حرام خوروں اور سینہ زوروں کی ایک ایسی چراگاہ بن گیا ہے، کہ جس میں محنت ومشقت کرنے والے کو بے وقوف اور احمق سمجھا جاتا ہے۔ اور کم سے کم محنت سے زیادہ سے زیادہ منافع کمانے والے کو کامیاب وکامران........ جب تک محنت، مشقت اور ریاضت کو ہماری زندگی ہمارے سیاسی اور سماجی نظام، غرض ساری معاشرت میں، اپنا صحیح منصب نہیں ملتا۔ اس ملک کی نجات کی کوئی صورت، چراغ بیگ کو نظر نہیں آتی۔

مسئلہ حل نہیں ہوگا!:۔

وزیر اعلا جناب شیخ محمد عبداللہ نے ریاستی اسمبلی میں وزیروں، وزرائے مملکت، نائب وزیروں اور ممبران اسمبلی کے ماہانہ مشاہروں میں اضافے کے بل پر بحث کا جواب دیتے ہوئے، اِس اضافے کا یہ جواز پیش کیا ہے کہ "جو لوگ قوم کی خدمت پر مامور ہوتے ہیں، ان کی جائز ضروریات کو پورا کرنے کے لیے انہیں، مناسب سہولیات فراہم کرنا لازمی ہے۔ تاکہ ایسے افراد کو کوئی "دوسرا" طریقہ اختیار کرنے کی ضرورت یا ترغیب پیش نہ آئے۔" چراغ بیگ، شیخ صاحب کی اِس منطق اور ان کی اِس دلیل سے اتفاق نہیں کرتا۔ اور اس کا خیال ہے کہ مشاہروں میں یہ ایزادگی، سادگی، قناعت اور کفایت شعاری کے ان دعووں کی نفی کرتی ہے کہ جن کا

گزشتہ چند ماہ سے بڑا چرچا ہو رہا ہے، اگر وزیروں کو ناجائز ذرائع سے اپنی ضروریات پوری کرنے کی ہوس سے باز رکھنے کے لیے ان کی تنخواہوں میں چار چار، پانچ پانچ سو روپے کا اضافہ، اِس بات کی ضمانت قرار پائے، کہ اب ہر وزیر ایمانداری اور دیانتداری کا مجسمہ بن جائے گا۔ تو لاکھ، دو لاکھ سالانہ کے اِس اضافے کو ایک کڑوی دوائی سمجھ کر حلق سے اُتارنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

لیکن اولاً یہ اضافہ اِن تمام ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ناکافی ہے۔ کہ جو وزیروں اور اس قبیل کے دوسرے قبائیلی سرداروں کو آئے دن درپیش رہتی ہیں اور اگر انہیں واقعی تمام جائز ضروریات کے بارے میں خود کفیل بنانا ہے۔ تو وزیر اعلا کی کم از کم تنخواہ پانچ ہزار روپے ماہوار اور دوسرے وزراء کی تین ساڑھے تین ہزار روپے ماہوار مقرر ہونا چاہیے۔ اس کے بعد بھی یقیناً کسی کی بھی ضروریات پوری تو نہیں ہو سکیں گی، لیکن کسی حد تک ان کی شدّت اور حدت میں کمی ہونے کا امکان پیدا ہو جائے گا۔ مگر میری دانست میں ضروریات پوری کرنے کا یہ ذہنی رویہ ہی غلط ہے اور کم از کم وزیروں کے معاملے میں تو اس کی بالکل ہی گنجایش نہیں۔ کیوں کہ جو بات وزرائے کابینہ کے بارے میں صحیح ہے وہ پٹواریوں اور چپراسیوں کے بارے میں زیادہ صحیح ہے اور وہ بجا طور پر دعویٰ کر سکتے ہیں کہ جب تک ان کی تنخواہوں میں اس حد تک اضافہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی سبھی جائز ضروریات پوری کر سکیں انہیں دوسرے طریقوں سے اپنی ضروریات کی دیکھ بھال

کرنے کا اخلاقی حق حاصل ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس وقت شیخ صاحب ان کی اس منطق اور دلیل کا کیا جواب دیں گے۔

معاملے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جس کی طرف یقیناً شیخ صاحب کی نگاہ نہیں گئی ہے اور وہ ہے ذاتی دیانت اور بگڑتی عادات کا، دیانت دار آدمی کم آمدن میں بھی اپنی ضروریات پوری کر ہی لیتا ہے۔ لیکن بددیانت انسان کے لیے زیادہ سے زیادہ آمدن بھی اس لیے کم ہوتی ہے کہ وہ ضرورت اور عیاشی میں فرق نہیں کرسکتا اور اس کے لیے ہر عیاشی اس کی ضروریات میں داخل ہوتی ہے اس کی تازہ مثال پنجاب کے ایک سابق وزیر اعلا پرکاش سنگھ بادل اور ان کے کابینہ کے چند وزراء کے خلاف چھگانی کمیشن کی وہ رپورٹ ہے کہ جس کے مطابق بڑی بڑی تنخواہیں لینے والے وزیروں نے بھی اپنی عادت اور فطرت سے مجبور ہو کر رشوت ستانی کا بازار گرم کیا تھا۔ اس کے برعکس کیرالہ کے وزیروں نے اپنی تنخواہوں میں اپنی مرضی سے کمی کرنے کے باوجود دیانتداری اور کفایت شعاری کا وہ معیار قائم کیا ہے کہ جو قابل تعریف ہی نہیں قابل تقلید بھی ہے۔ بددیانتی اور بداطواری انسان کی ضروریات سے زیادہ اس کی ذہنیت اور تربیت سے تعلق رکھتی ہے۔ آپ بے ایمان وزیروں کو دس ہزار روپے ماہوار تنخواہ دینے کے بعد بھی بے ایمانی سے باز نہیں رکھ سکتے۔

☆

مئی ۱۹۶۵ء

شیخ صاحب سے شفیع سمنانی تک

"آئینہ" زندہ ہے مگر اس کی زندگی پر موت کے سایے منڈلا رہے ہیں۔ چراغ بیگ آزاد ہے مگر اس کے قلم کی گرفتاری کے لیے "طالع منزل" میں سازشیں ہو رہی ہیں۔ کون جانتا ہے کہ وزیر ڈی۔ آئی۔ آر "آئینہ" کو زندگی کی خیرات دے کر چراغ بیگ کی ہمت اور حوصلے کا امتحان لینا چاہتے ہوں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ "آئینہ" کو "فرصتِ گناہ" دے کر اس کی مستقل موت کا سامان کیا جا رہا ہو۔

مُجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

لیکن پیشتر اس کے کہ موت کا پروانہ جاری ہو جائے، پیشتر اس کے کہ چراغ بیگ کی زبان پر تالے لگا دیے جائیں اور اس کے ہاتھ سے قلم چھین کر اس پر وطن دُشمنی کا الزام لگایا جائے، چراغ بیگ اپنا فرض اور قرض چُکانا چاہتا ہے۔ چراغ بیگ نے اسی قلم سے صادق سرکار کی جمہور نوازی، اس کے صالح اقدامات اور اس کی خلوص نیت کے قصیدے لکھے ہیں۔ آج ڈی۔ آئی۔ آر کا زہراب پینے سے پہلے وہ اس سرکار کا مرثیہ لکھنا چاہتا ہے کیوں کہ اس کی

نگاہوں میں وہ سرکار مرگئی ہے جس نے اس کے ''آئینے'' کو جلا بخشی تھی۔

آج سے چودہ ماہ قبل جب نئی سرکار کا طلوع ہوا تو خواجہ غلام محمد صادق نے اپنے پہلے پالیسی بیان میں ریاستی عوام سے چند وعدے کیے جن میں سے جمہوری حقوق کی بحالی کا وعدہ سب سے اہم اور معنی خیز تھا۔ ریاستی محکمہ اطلاعات کی طرف سے صادق صاحب کے اس وعدے کی تشہیر پر اگر لاکھوں نہیں تو ہزاروں روپے ضرور خرچ ہوئے ہوں گے۔ صادق صاحب نے اپنے اس وعدے کو ایک نہیں، ایک ہزار چار سو ستر بار دہرایا۔ اور حق یہ ہے کہ وزیر داخلہ شری ڈی، پی در (جو شہری آزادیوں کے معاملے میں بخشی صاحب کے ہمزاد ہیں) کے باوجود صادق صاحب نے اپنے اس وعدے کو بڑی وفاداری اور دیانت داری سے نبھایا بھی! ریاست میں پورے سترہ سال کے بعد تحریر وتقریر کی آزادی بحال کر دی گئی۔ جھوٹے اور فرضی مقدمات واپس لیے گئے۔ سیاسی نظر بندوں کو غیر مشروط طور پر آزاد کر دیا گیا۔ شیخ محمد عبداللہ اور اُن کے ساتھیوں کو اپنے نظریات کی تبلیغ کے لیے کھلی چھٹی دی گئی۔ اخبارات کی اشاعت پر سے پابندیاں ہٹادی گئیں اور درجنوں نہیں بلکہ سینکڑوں اخبارات جموں اور کشمیر سے شائع ہونے لگے۔ ریاست کی تاریخ میں یہ ایک نیا موڑ، ایک نیا باب اور ایک اہم تجربہ تھا۔ اس تجربے کے پیچھے ایک پختہ ذہن ایک وسیع دِل اور ایک بلند نظر تھی۔ اس میں مصلحات سے زیادہ اعتقادات اور تجربے سے زیادہ سائنسی نقطہ نگاہ کی کارفرمائی تھی۔ اقتصادی میدان اور انتظامیہ کی تطہیر کے سلسلے میں نئی سرکار

نے کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو، سیاسی میدان میں صادق سرکار نے وہ کچھ کر دکھایا جس کی ہمت خود شیخ محمد عبداللہ کو اپنے دورِ استبداد میں نہیں ہوئی تھی! لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ صرف ایک سال کے تجربے کے بعد صادق سرکار نے صرف اپنی شہرت ہی نہیں بلکہ اپنے وجود کے سب سے بڑے جواز کو ڈی ۔آئی۔ آر کی قربان گاہ چڑھا دیا۔ ہو سکتا ہے کہ اب صادق صاحب اور ان کے رفقاء اُس ہلچل، پریشانی، ہیجان، اضطرار اور اتھل پتھل سے محفوظ ہو گئے ہوں جو سیاسی حقوق کی بحالی کی وجہ سے ان کا مقدر بن گئی تھی۔ آئے دن کے ہنگاموں اور اپنے سیاسی حریفوں کے چیلنج سے انہیں اب نجات مل جائے گی، لیکن چراغ بیگ کے لیے تکلیف دہ بات یہ ہے کہ اب ان کی حکومت کا کوئی اخلاقی جواز بھی تو نہیں رہا۔ وہ اپنے سیاسی اختلافات اور جماعتی مناقشات کے باوجود بخشی غلام محمد کے اتنے قریب ہیں کہ پہلے کبھی نہ تھے!

یہ صحیح ہے کہ شہری آزادیوں کا غلط استعمال ہوا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ شہری آزادی کے نام پر ہلڑ بازی اور امن شکنی کی حرکات روا رکھی گئیں۔ اس بات سے انکار نہیں کہ دو ایک جماعتوں نے شہری آزادی کو صرف اپنے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ شیخ صاحب نے ترکِ موالات کا نعرہ لگا کر یہ ثابت کر دیا تھا کہ ان کی ڈکشنری میں شہری آزادی کا لفظ اُن معنوں میں استعمال نہیں ہوتا جو اصطلاحِ عام میں اس کے لیے مخصوص ہے یہ بھی صحیح ہے کہ نئی حکومت شہری آزادی کے نام پر لاقانونیت اور امن شکنی کی اجازت نہیں دے سکتی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا شہری آزادیاں صرف شیخ

محمد عبداللہ یا محاذ رائے شماری کے لیے ہی مخصوص تھیں کہ ان کے رہا ہوتے ہی ان کا اعلان کر دیا گیا۔ اور ان کی گرفتاری کے ساتھ ہی انہیں معطل کر دیا گیا۔ کیا صرف چند اشخاص کی ہُلڑ بازی اور ہنگامہ آرائی کو بُنیاد بنا کر ریاست کے تیرہ لاکھ لوگوں کو شہری آزادی سے محروم کیا جا سکتا ہے؟ کیا بعض افراد (خواہ وہ کتنے ہی با اثر، بارسوخ اور معزز کیوں نہ ہوں) کے غلط طریق کار کی بنا پر جمہوریت اور شہری آزادی کے تصورات کو غلط قرار دیا جا سکتا ہے۔ جو لوگ شہری آزادی کا صحیح استعمال نہیں کرتے ان کے خلاف کی جانے والی ہر کاروائی میں چراغ بیگ حکومت کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہے اور میرا خیال ہے کہ رنبیر پینل کوڈ میں کئی ایسی دفعات موجود ہیں، جن کے تحت ایسے افراد کے خلاف کارروائی کی جاسکتی ہے لیکن چند افراد یاد و ایک سیاسی جماعتوں کی قابلِ اعتراض سرگرمیوں کی بنا پر ہمیں ان حقوق سے کیوں محروم کیا جا رہا ہے، جن کے حصول کے لیے ہمارے آباؤ اجداد نے اور ہم نے خون بہایا ہے۔ چراغ بیگ شیخ محمد عبداللہ کی گرفتاری کے خلاف احتجاج نہیں کرتا۔ ان پر چینی وزیر اعظم چو این لائی سے مُلاقات اور بیرونی ممالک میں ہندوستان کے خلاف پروپیگنڈہ کے الزامات ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ مرکزی حکومت اور ریاستی سرکار کو ملک کی سلامتی کے لیے اُن کی گرفتاری ناگزیر نظر آئی ہو۔ لیکن ایڈیٹر ''زمیندار'' محمد شفیع سمنانی کی گرفتاری کا کیا جواز ہے؟ اس نے کس چو این لائی سے ملاقات کی ہے؟ اسے ملک کی سلامتی کے لیے کیوں خطرہ تصور کیا گیا ہے؟ کیا شیخ صاحب اور محمد شفیع سمنانی کی سرگرمیاں ایک ہی

نوعیت کی ہیں؟ وادی کے دس اخبارات کو بند کرنے کا کیا جواز ہے؟ مانا کہ ''محاذ'' اور ''فرنٹ'' ایک ایسی تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں جس کی وفاداریاں ہندوستان کے تئیں مشکوک ہیں۔ لیکن ''رہبر'' ''کشمیر پوسٹ'' اور ''زمیندار'' کا تعلق نہ محاذ رائے شماری سے ہے اور نہ ایکشن کمیٹی سے۔ یہ اخبارات تو قابلِ اعتراض حد تک وطن پرست ہیں۔ انہیں ملک کی سلامتی کے لیے کیوں خطرہ سمجھا گیا؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ان کی اشاعت پر صرف اس لیے پابندی عائد کردی گئی ہے کہ یہ ریاستی سرکار کی پالیسیوں پر کڑی نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں؟ کیا ریاستی سرکار پر نکتہ چینی کرنا مُلک کی سلامتی کے لیے خطرہ ہے؟ محاذ رائے شماری کے کارکنوں کے ساتھ ساتھ بخشی غلام محمد کے گروہ کے آدمیوں کو کیوں گرفتار کیا گیا ہے؟ کیا حکومت ہنگامی حالات کی آڑ میں اپنے تمام مخالفین کو دبانا چاہتی ہے؟ اس ناپاک مقصد کے لیے ملک کی سلامتی کی آڑ لینا موجودہ حکومت کی شان کے شایان نہیں۔

چراغ بیگ بخشی غلام محمد کی غلط کار سیاست کے خلاف آج پورے ایک سال سے برسرِ پیکار ہے۔ وہ آج بھی ریاست کو ان کے منحوس سایے سے محفوظ رکھنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرے گا۔ لیکن بخشی غلام محمد کو نیچا دکھانے کے لیے جمہوریت اور انصاف کا گلا گھونٹنا آئین اور اخلاق کی کس کتاب میں درج ہے؟ کیا ملک کے دفاع کے لیے نافذ کردہ آرڈی ننس کو چند افراد کے سیاسی استحکام کے لیے استعمال کرنا وطن پرستی ہے اور ان بالا دستیوں کے خلاف آواز بلند کرنا وطن دُشمنی ہے؟ چراغ بیگ یہ جاننا چاہتا ہے کہ اگر کشمیر

ہندوستان کا اٹوٹ انگ ہے تو یہاں شہری آزادی کے وہ معنی کیوں نہیں ہیں جو مُلک کے دوسرے حصوں میں مروّج ہیں؟۔

عنانِ اقتدار سنبھالنے کے کچھ ہی دن بعد وزیر اعلا خواجہ غلام محمد صادق نے ایک تقریر میں کہا تھا کہ اگر مجھے گولی چلا کر حکومت کرنا پڑے تو میں مستعفی ہو جاؤں گا، میں مستعفی ہونے کا مطالبہ تو نہیں کروں گا، لیکن ان کی توجہ اُس سرکاری پریس نوٹ کی طرف دِلانا چاہتا ہوں جس میں چار بار گولی چلائے جانے کا اعتراف کیا گیا ہے۔

وزیر اطلاعات شری علی محمد طارق نے آج سے ایک سال قبل پارلیمنٹ میں بخشی غلام محمد کو چیلنج دیا تھا کہ وہ دونوں پولیس کے سہارے کے بغیر شہر کا دورہ کریں گے اور ان میں سے جو کپڑوں سمیت واپس آ جائے وہ عوام کا نمائندہ قرار پائے گا۔ کیا طارق صاحب آج اس چیلنج کو دہرانے کے لیے تیار ہیں؟

☆

جنوری ۱۹۶۷ء

ووٹ کتروں سے خبردار رہیے!

ان دِنوں پورے ملک میں الیکشن کی گرم بازاریاں ہیں۔ شریمتی اندرا گاندھی سے لے کر شمیم احمد شمیم تک ہر لیڈر اور پلیڈر انتخابی دنگل میں کود پڑا ہے۔ اپنی ریاست میں پہلی بار آزادانہ فضا میں انتخابات منعقد کیے جانے کا اندیشہ پیدا ہوگیا ہے۔ اس لیے فضا میں کچھ زیادہ ہی گہما گہمی اور ہل چل پائی جاتی ہے۔ کانگریس نے خُدا خُدا کر کے اپنے اُمیدواروں کی فہرست شائع کردی۔ فہرست کو ایک نظر دیکھ لینے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ جس طرح بہار اور یو۔پی کے بعض علاقوں میں سخت غذائی قحط پڑ رہا ہے، اسی طرح ریاست جموں و کشمیر میں کانگریسی اُمیدواروں کی فہرست پوری کرنے کے لیے کچھ پاکستانیوں، محاذیوں اور جن سنگھیوں کو بھی ٹکٹ دینا پڑا۔ نئے چہروں کی تلاش میں کانگریس اتنی دُور نکل گئی کہ اُمیدواروں کے لیے کانگریسی ہونا بھی ضروری قرار نہیں دیا گیا۔ جن لوگوں نے اپنی ساری زندگیاں سیاسی جدوجہد میں گزاری ہیں انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کچھ نئے چہروں کو ہیلی کوپٹروں کے ذریعے ان کے سروں پر کھڑا کر دیا گیا۔

پرانے کارکن بددِل اور بدظن ہیں اور نئے چہرے حیران کہ وہ کون ہیں، کیوں ہیں، کہاں ہیں اور کیسے ہیں۔ غرض ریاستی کانگریس نے جوں توں کر کے انتخابی معرکے کا پہلا مرحلہ طے کرلیا۔ نیشنل کانفرنس کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ یہ جماعت بھی اُمیدواروں کے سلسلے میں بہت حد تک سُوکھے سے متاثرہ جماعت ہے۔ اُمیدواروں کی تلاش کے لیے کانفرنس کا ایک دستہ پچھلے کئی ماہ سے ریاست کی خاک چھان رہا ہے اور توقع ہے کہ آئندہ چند دنوں تک نیشنل کانفرنسی اُمیدواروں کا پٹارہ بھی کھول دیا جائے گا۔ اس پٹارے میں سے کیسے کیسے ''نمونے'' برآمد ہوں گے۔ یہ دیکھنے کے لیے چراغ بیگ اور اُس سے زیادہ کانگریسی لیڈر بے تاب ہیں۔ ریاست میں پہلی مرتبہ کمیونسٹ پارٹی بھی انتخاب لڑ رہی ہے۔ دائیں بازو اور بائیں بازو کی پارٹیوں نے اپنے اپنے ''نمونوں'' کو بازار میں پیش کر دیا ہے۔ پرجاسوشلسٹ پارٹی چوں کہ صرف لیڈروں پر ہی مشتمل ہے اس لیے پارٹی کے سبھی لیڈر انتخاب میں حصہ لے رہے ہیں۔ محاذ رائے شماری کمیونسٹ پارٹی کی طرح دو بازوؤں میں تقسیم ہوگئی ہے۔ ایک بازو الیکشن لڑنے کے لیے بے تاب اور دوسرا بازو بائیکاٹ پر بضد! ابھی تک یہ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اصلی محاذ کون سا ہے۔ جلد یا بدیر ''اصلی محاذ کو پیش کرو'' کا نعرہ بھی سُننے میں آئے گا۔ جن سنگھ کی طرف سے یہ دھمکی دی گئی ہے کہ وہ جموں میں تمام نشستوں پر انتخاب لڑنے کے علاوہ وادی میں بھی گیارہ نشستوں پر انتخاب لڑیں گے۔ جموں میں تمام نشستوں پر اُمیدوار کھڑا کرنے کی منطق تک تو

سمجھ میں آسکتی ہے لیکن کشمیر میں گیارہ اُمیدوار کھڑے ہو کر کیا کریں گے کوئی نہیں جانتا، وہ گیارہ اُمیدوار بھی نہیں جانتے جنہیں چار و ناچار کھڑا کر دیا جائے گا۔ انتخابی میدان میں پرواز کرنے کے لیے بہت سے آزاد اُمیدوار بھی پر تول رہے ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں جو ہیں تو پابند اُمیدوار، لیکن بظاہر آزاد اُمیدوار دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو اس وقت آزاد ہیں لیکن رفتہ رفتہ پابند ہوتے جائیں گے۔ ایسے آزاد اُمیدواروں کی بھی کمی نہیں جو صرف آزاد ہیں، اُمیدوار نہیں۔ ان کا نام جبھی تک سُننے میں آئے گا جب تک کاغذاتِ نامزدگی داخل ہو جاتے ہیں۔ یہ "آزاد" صاحبان کھڑے ہو کر اپنے بیٹھنے کی قیمت مانگتے ہیں اور بس! غرض انتخابی بُخار رفتہ رفتہ چڑھتا جا رہا ہے۔ اور ووٹروں کی قدر و قیمت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

جن لوگوں کو کوئی دو ٹکے کو نہیں پوچھتا تھا آج دیوان خانوں میں ان کی خاطر داریاں ہوتی ہیں۔ جن کو مُلاقات کے لیے ہفتوں نہیں مہینوں انتظار کرنا پڑتا تھا، اب ان سے مُلاقات کے لیے "صاحب" خود دوڑے دوڑے جاتے ہیں۔ جو کل تک کریم نایید کہلاتا تھا، آج خواجہ عبدالکریم ہو گیا ہے۔ کل کا غفار قصائی راتوں رات عبدالغفار گنائی ہو گیا ہے۔ جن لیڈروں کو دیہاتیوں کے جسم سے ایک عجیب طرح کی بدبو آیا کرتی تھی، ان کی نگاہوں میں یہ لوگ اب سب سے زیادہ پاک وصاف اور محترم ہو گئے ہیں۔ کچھ آزاد قسم کے اُمیدواروں کو یک لخت شیر کشمیر کی نظر بندی کا غم ستانے لگا

ہے اور وہ شیر کشمیر کے نام کو کامیابی کی سیڑھی سمجھ کر اپنی کامیابی کے لیے استعمال کرنے لگے ہیں۔ غرض الیکشن کی گرم بازاری میں اُمیدواروں کی گرم گفتاری اور نرم روی کا ایک عجیب سماں دیکھنے میں آرہا ہے۔ لیکن ووٹر حضرات جانتے ہیں کہ شرافت اور دیانت کا یہ لبادہ جب تک ہی زیبِ تن رہتا ہے۔ جب تک اُمیدوار، اُمیدوار ہوتا ہے۔ ممبر ہوتے ہی اس کے چہرے سے غازہ اُتر جاتا ہے اور وہ اپنی اصلی اوقات پر آجاتا ہے اس لیے چراغ بیگ کا مشورہ ہے کہ :

''ووٹ کتروں سے خبردار رہیے''!

<u>پبلک سیکٹر، پرائیویٹ سیکٹر</u>:۔

چراغ بیگ کی ترقی پسندی میں خود ترقی پسندوں کو بھی کوئی شُبہ نہیں۔ وہ کبھی کبھی اتنا ترقی پسند ہوجاتا ہے کہ دوست احباب کو اس کے کمیونسٹ ہونے کا گُمان ہونے لگتا ہے۔ مثلاً وہ سوشلزم کا زبردست حامی اور سرمایہ داری کا زبردست مخالف ہے۔ وہ اجارہ داری کا مخالف اور غیر طبقاتی نظام کا موید ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ دولت پیدا کرنے والے تمام بڑے ذرائع قومی تحویل میں لیے جانے چاہئیں ۔ بہ الفاظِ دیگر وہ پرائیویٹ سیکٹر کے مقابلے میں پبلک سیکٹر کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ مگر پچھلے ایک ماہ کے دوران اُسے پبلک سیکٹر اور پرائیویٹ سیکٹر کے تقابلی مطالعے کا جو موقع فراہم ہوا، اُس سے اس کے نظریات، رُجحانات اور میلانات میں غیر معمولی تبدیلی واقع ہوئی ہے اور وہ اب اس بات پر رضامند ہے کہ جو ادارے اس وقت پبلک

سیکٹر کے اہتمام سے چل رہے ہیں وہ بھی پرائیویٹ سیکٹر کی تحویل میں دیے جائیں۔آپ پوچھیں گے کہ اس زبردست ذہنی انقلاب کے محرکات کیا ہیں۔تو لیجیے سُن لیجیے!

تین ہفتے قبل چراغ بیگ کو ایک مقدمے کی پیشی کے سلسلے میں بڈگام جانا تھا۔ چراغ بیگ نے پرائیویٹ بس کی بجائے سرکاری بس میں سفر کرنے کی حماقت کی تھی۔بس میں بیٹھتے ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔لیکن ٹکٹ کٹ چکا تھا، اس لیے اسی بس میں سفر کرنا ضروری تھا بس کیا تھی میونسپلٹی کی کوڑا کرکٹ لے جانے والی گاڑی تھی۔ دُنیا بھر کی غلاظت اور گندگی سے سجی ہوئی اس بس کا کوئی شیشہ اپنی جگہ پر نہ تھا۔کوئی سیٹ اس قابل نہ تھی کہ اس پر آرام سے بیٹھا جاسکے۔ جب ساری بس سواریوں سے بھر گئی تو عین وقت پر کسی افسر کو یاد آیا کہ اس بس کو بڈگام نہیں جانا ہے کہیں اور جانا ہے۔سواریوں کو حکم دیا گیا کہ وہ دوسری بس میں سوار ہو جائیں۔ پندرہ منٹ کی آپا دھاپی اور دھینگا مُشتی کے بعد چراغ بیگ دوسری بس میں بیٹھنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور گیارہ بجے سرینگر سے چل کر ٹھیک بارہ بجے بڈگام پہنچ گیا۔واپسی پر چراغ بیگ ایک پرائیویٹ بس میں سوار ہوا۔ اور صرف آدھ گھنٹے میں سرینگر پہنچ گیا۔اس بس کے سبھی شیشے اپنی جگہ پر موجود تھے۔

پچھلے ہفتے چراغ بیگ کو ایک ضروری کام کے سلسلے میں جموں جانا پڑا۔اور بحالت مجبوری ڈاک بنگلے میں قیام کرنا پڑا۔ جموں کے ڈاک بنگلے کے بارے میں آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کا سارا انتظام وانصرام محکمہ سیاحت

کے ہاتھوں میں ہے۔ کچھ عرصے سے ڈائننگ ہال کا انتظام بھی سرکار نے اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔ یقین کیجیے کہ ڈاک بنگلے میں تین دن قیام کرنے کے بعد اس قدر پچھتایا کہ کئی بار خودکشی کا ارادہ کیا۔ میں ڈاک بنگلے کے اعلا ترین کمرے یعنی کمرہ نمبر ایک میں رہا جس کا روزانہ کرایہ بارہ روپے ہے۔ جب تک میں اس میں رہا، کسی نے اس کمرے کا باتھ روم صاف نہیں کیا۔ کسی نے صبح شیو کا پانی نہیں دیا۔ باتھ روم میں لگا ہوا گیزر بیکار پڑا میرا مُنہ تکتا رہا۔ ہر بار جب مجھے کسی چیز کی ضرورت پڑی مجھے نائٹ سُوٹ میں نیچے آکر بیرے کو آواز دینا پڑی۔ بارہ روپے روز کے کمرے میں بجلی کی گھنٹی کا کوئی بٹن نظر نہیں آیا۔ دروازے پر کسی نے آکر یہ نہیں پوچھا کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ ڈائننگ ہال کا حال اس سے بھی زیادہ بُرا۔ اس پورے ہال پر وہی اُداسی چھائی ہوئی ہے جو کانگریس منڈیٹ نہ ملنے والے اُمیدواروں کے چہروں پر دکھائی دیتی ہے۔ دو ایک دفعہ وہاں کھانا کھایا۔ اتنا بدمزہ، پھیکا اور مُضرِ صحت کہ ابھی تک ابکائیاں آرہی ہیں حیرت ہے کہ جموں شہر کی میونسپلٹی اس کباڑ خانے کو کیوں کر برداشت کرتی ہے! یہاں سے صرف چند گز کے فاصلے پر جب میں نے ایک پرائیویٹ ریستوران میں کھانا کھایا تو وہاں کا ماحول دیکھتے ہی ایسا محسوس ہوا کہ میں سبزی منڈی سے کسی سنیما ہال میں آیا ہوں۔ کھانا کھایا تو ایسا محسوس ہوا کہ ڈاک بنگلے میں انسانوں کے لیے کھانا نہیں بلکہ مویشیوں کے لیے چارہ بنتا ہے ایک دوست سے اپنی روائیداد سُنائی۔ تو اُس نے کہا...... کہ ڈاک بنگلے میں رہنے سے بہتر

تو یہی تھا کہ فٹ پاتھ پر پڑے رہتے۔ جب سے سرکار نے اسے اپنے ہاتھ میں لیا ہے، اس کا بیڑا غرق ہو گیا ہے۔

اب آپ ہی کہیئے کہ ان دو نادر تجربات کے بعد بھی کوئی انسان پبلک سیکٹر کا حامی رہ سکتا ہے میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ریاستی حکومت کو بھی پبلک سیکٹر کی بجائے پرائیویٹ سیکٹر کے اہتمام سے چلانا چاہیئے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟

☆

”مداخلت کاروں کا بادشاہ“

مداخلت کار انگریزی لفظ انفلی ٹریٹر کا اردو ترجمہ ہے، جو 1965ء میں مقبولِ عام ہوا۔ مداخلت کار کے معنی ہیں چوری چھپے گھس آنے والا، وہ جسے اندر آنے کا کوئی حق نہیں اور اس کے باوجود جوں توں کر کے گھس آئے۔ اس تعریف کی روشنی میں ریاستی اسمبلی میں مداخلت کاروں کی ایک بھاری تعداد گھس آئی ہے جس میں زیادہ تر کانگریسی ہیں۔ جو بغیر کسی استحقاق اور قانونی جواز کے ممبر اسمبلی منتخب کیے گئے۔ خاص طور پر وہ جن کو کامیاب کرانے کے لیے حلف نامے بھی چرائے گئے۔ مداخلت کاروں کا اِس بھاری تعداد میں ریاستی اسمبلی میں گھس جانا یقیناً جمہوریت اور سیکولرازم کے لیے نیک فال نہیں۔ لیکن ہوا کی سمت بتاتی ہے کہ یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوتا ،ایک اطلاع کے مطابق مداخلت کاروں کا بادشاہ جو اپنے ساتھیوں کو اندر گھسیٹ کر اب خود کسی چور دروازے سے گھس کر اندر آنے کی کوشش کر رہا تھا، عنقریب ہی باضابطہ طور مداخلت کاروں کی صف میں شریک ہوگا۔ روئے سخن وزیر خزانہ شری درگاہ پرشاد در کی طرف ہے۔ جن کے بارے میں یہ سُنا

گیا ہے کہ وہ ریاستی اسمبلی کی کسی نشست کے لیے انتخاب لڑنے کی بجائے قانون ساز کونسل کے چور دروازے سے قانون ساز اسمبلی میں داخلہ لینے کی فکر میں ہیں۔ انتخابی کرشمے دکھانے میں در صاحب کو جو عالمگیر شہرت حاصل ہو چکی ہے اِس کے پیش نظر عوام الناس کا خیال تھا کہ وہ خود بھی ضمنی انتخاب لڑ کر اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کا مظاہرہ کریں گے۔ خاص طور پر ایسے وقت جب کہ ریاست میں کانگریس کی مستحکم اور نا قابل شکست حکومت قائم ہے انہیں کانگریس کے تئیں ریاستی عوام کی بے پناہ عقیدت کے مظاہرے کا یہ موقع ہاتھ سے نہ دینا چاہیے تھا۔ لیکن ڈی پی صاحب، چراغ بیگ سے زیادہ دور اندیش اور محمد افضل بیگ سے زیادہ محتاط واقع ہوئے ہیں۔ اسی لیے عام انتخاب کی بجائے صادق صاحب کے حسنِ انتخاب پر تکیہ کیے ہوئے ہیں۔ حیرت اِس بات کی ہے کہ جس شخص نے اپنے ہاتھ کی صفائی اور اپنے ضمیر کی سیاہی سے جموں میں کانگریس کی عظیم الشان کامیابی کو ممکن بنا دیا، وہ خود ایک ضمنی انتخاب لڑنے کا تصوّر کرتے ہوئے بھی کانپتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ریاستی کانگریس کے بلا مقابلہ صدر سید میر قاسم کو یہ دعویٰ ہے کہ عام انتخابات کے دوران ریاستی عوام نے کانگریس کو اپنا اعتماد سونپا ہے۔ صادق صاحب اور قاسم صاحب کو اگر واقعی اپنے اس بیان کی صحت پر ذرہ بھر اعتماد ہے تو چراغ بیگ ان سے گزارش کرے گا کہ ڈی پی صاحب کو کسی بھی نشست سے انتخاب میں کھڑا کر کے ایک بار پھر اس اعتماد کی توثیق کریں۔ اب رہی بات یہ کہ ان کے لیے نشست کون خالی کرے گا، سو عرض ہے کہ مداخلت کاروں

کی اتنی بڑی تعداد میں سے کسی بھی مداخلت کار کو مداخلت کاروں کے بادشاہ کے لیے جگہ خالی کرنے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے!

''مال مفت دِل بے رحم''

ابھی پچھلے ہفتے چراغ بیگ دیہات کا دورہ مکمل کر کے سرینگر لوٹا ہے۔ اس دورے کا خاص پہلو یہ ہے کہ اس میں انسانوں سے کم اور مچھروں سے زیادہ ملاقات ہوئی۔ بلکہ مچھروں کی بے پناہ محبت کی نشانیاں ابھی تک سارے جسم پر پیوست ہیں اگر چہ بارش نہ ہونے کی وجہ سے مکئی کی فصل کو بہت نقصان پہنچا ہے تاہم شالی کی فصل خدا کے فضل سے اب کی بار پورے جوبن پر ہے۔ کسان بھائی بڑی بے صبری کے ساتھ اپنی اُمیدوں اور آرزؤں کی فصل کاٹنے کا انتظار کر رہے ہیں لیکن ادھر دیہات میں کچھ دنوں سے مچھروں کی ایک نئی جنس بھی ظاہر ہونے لگی ہے۔ دیہاتی لغت میں اُن کو سرکاری مچھر کہتے ہیں۔ یہ سرکاری مچھر جو اصطلاحِ عام میں تحصیلدار اور کبھی کبھی نائب تحصیلدار کہلاتے ہیں۔ صبح و شام دیہات میں روپیوں کی ایک پوٹلی لیے پھرتے ہیں اور ہر ایرے غیرے نتھو خیرے میں پانچسو، سات سو، ہزار، پندرہ سو روپیہ تقسیم کرتے ہیں کسان یہ روپیہ اپنی مرضی سے لیں تو بات سمجھ میں آ سکتی ہے۔ لیکن ایسا نہیں، سرکاری مچھر عرف تحصیلدار، یہ روپے زبردستی ان پر ٹھونستا ہے وہ لینے سے انکار کریں، تو وہ روپیہ چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ روپے کی اتنی بے دردانہ تقسیم پہلی بار دیکھنے میں آئی ہے لیکن یہ تقسیم اتنی بے غرضانہ نہیں جتنی بادی النظریں دکھائی دیتی

ہے۔سرکاری روپے کی اس فیاضانہ تقسیم کا مقصد کسانوں سے شالی خریدنا ہے لیکن جس کسان کے کھیت سے مشکل سے اپنی ضرورت کا اناج حاصل ہوتا ہے، اسے زبردستی پندرہ سو روپے کی رقم دے کر سرکاری مچھر کس قسم کی پروکیورمنٹ(Procurement) کرنا چاہتے ہیں؟ یہ صرف ڈی پی صاحب جانتے ہوں گے۔

☆

اپریل ۱۹۶۵ء

اپنے منہ میاں مٹھو

بخشی غلام محمد صاحب خیر سے واپس کشمیر آ گئے ہیں۔ انہوں نے جس طرح اپنا خیر مقدم کرائے کے آدمیوں سے ہوائی اڈے پر کرایا اور جس طرح اپنے صرفے سے اپنا جلوس نکلوایا، وہ بھی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ کشمیر اپنے نظاروں ہی کے لیے نہیں، استقبالیہ تقریبوں کی شاندار روایات کے لیے بھی مشہور ہے۔ دو گھنٹے کے نوٹس پر وہ شان دار محرابیں سڑکوں پر بن جاتی ہیں کہ آنے والا مہمان، جس کو اہلِ کشمیر نہ بھی جانتے ہوں، اس غم میں ادھ موا ہو جاتا ہے کہ پہلے کیوں نہ ایسا شاندار استقبال وصول کیا۔ بڑے سے بڑے عظیم آدمی سے لے کر بڑے سے بڑے ایرے غیرے نتھو خیرے کو شہر سرینگر کے باسیوں نے شاندار استقبال ''دیا'' ہے۔ کئی استقبال خود بخشی غلام محمد صاحب نے اپنے عہد حکومت میں سرکاری خزانے سے زرِ کثیر صرف کر کے منظّم کیے۔ لیکن افسوس چند روز پہلے جب وہ ڈی، آئی، آر کے تحت قید ہونے کے بعد پہلی بار کشمیر میں وارد ہوئے تو ''کس نمی پرسد کہ بھیا چیستی'' والا معاملہ تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اُن کے عہد کے کچھ بڑے قانون شکنوں نے ڈرا دھمکا کر نہیں بلکہ روپیہ خرچ کر کے شہر کی تمام غیر سرکاری

ٹیکسیاں انگیج کرلی تھیں اور بہت سی بسیں بھی چوگنے کرایہ پر حاصل کرلی تھیں اور استقبال کرنے والے اُسی طرح کرایے پر بلوائے گئے تھے جیسے امریکہ میں کرایہ کے نوحہ گر ماتمی تقریبوں کے لیے لائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ استقبال خاصا مضحکہ خیز تھا کئی لحاظ سے۔ اس استقبال اور جلوس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ڈیڑھ دوسو کاروں اور بسوں کا جو قافلہ ہوائی اڈے سے سونہ وار تک چلا، اُس کو دیکھنے کے لیے سڑکوں کے کنارے راہگیر تک کھڑے نہیں ہوئے۔ معلوم ہوا ہے کہ بخشی صاحب کے کچھ کارندے سلک فیکٹری اور وولن ملز کے مزدوروں کے پاس بھی گئے تھے کہ وہ کارخانوں سے رخصت لے کر بخشی صاحب کے خیر مقدم کے لیے سڑکوں کے دونوں طرف کھڑے ہوں۔ لیکن اس کے لیے جو اُجرت انہوں نے طلب کی وہ بخشی صاحب کے کارندوں کو بہت زیادہ معلوم ہوئی۔ ایک اندازے کے مطابق اڈے پر کرایے کے جو لوگ لائے گئے تھے اُن پر بخشی برداروں کا چالیس ہزار روپے خرچ ہوا۔ کارخانوں کے مزدوروں نے پچاس ہزار روپیہ کی رقم طلب کی، اس لیے اس کو پروگرام سے نکالا گیا۔

بخشی صاحب کا ایک ٹٹ پونجیا انگریزی ہفتہ وار چیتھڑا ابھی سرینگر سے نکلتا ہے۔ ان کے سرینگر میں آنے سے قبل ہی اس کی خبریں نہ صرف ترتیب دے دی گئی تھیں بلکہ عبارت کو کمپوز بھی کرلیا گیا تھا اور جو جگہ باقی رہ گئی تھی وہاں بخشی صاحب کے ہار پہنے ہوئے پرانے بلاک بھی لگادیے گئے تھے۔ ایڈیٹر نے جوشِ نمک خواری میں کم، ترقی کی اُمید میں زیادہ ایسے

پھوہڑپن کا ثبوت دیا ہے کہ اخبار نویسی کا فن سر پیٹ رہا ہے۔ بخشی صاحب جس زمانے میں برسر اقتدار تھے اُس زمانے کی تصویریں اس طرح چھاپ دی ہیں گویا یہ تازہ استقبال کی ہیں۔ آج بخشی صاحب کی صحت وہ نہیں ہے جو پہلے تھی جس زمانے کی یہ تصویریں ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اپنے شہر سرینگر میں بلاک سازی کا صرف ایک کارخانہ ہے جو سرکاری ہے اور گورنمنٹ پریس میں ہے اور اس کے بنائے ہوئے بلاک اور جس کام بھی آتے ہوں، چھپائی کے کام تو نہیں آسکتے سرکاری کارخانے کے بلاک بالفرض چھپائی کے کام میں استعمال بھی ہوسکتے تو اب بخشی صاحب کی تصویر کا بلاک سرکار کے دفتر میں کیوں بنتا؟ بخشی صاحب کے آنے کے بعد سے جہاز اور سڑک کے راستے بند رہے۔ اس لیے بخشی صاحب کی ''خیر مقدمی'' تصویر بلاک کے لیے نہ دہلی جاسکی اور نہ وہاں سے بلاک بن کے آسکا۔ جس طرح اس چیتھڑے میں خبریں فرضی اور نقلی چھپتی ہیں اسی طرح یہ تصویریں بھی چھپیں۔

بخشی صاحب نے ایڈیٹر ''آئینہ'' کو ایک انٹرویو دیا تھا۔ یہ انٹرویو شائع ہوا تو انہوں نے اس بات کی تردید دہلی جاکر کی کہ میں نے کوئی انٹرویو کسی ریاستی اخبار کو دیا ہی نہیں۔ یہ تو اُن کی پرانی عادت ہے۔ سچی باتوں کی تردید کرنا ہی ان کے نزدیک سیاست ہے۔ ان کے چیتھڑے میں شائع ہونے والی اُن کی تصویریں اُن کے ہوتے ہوئے بھی اس خبر سے متعلق نہیں ہیں جن سے ان کو چسپاں کیا گیا ہے۔ اُمید تو نہیں بخشی صاحب اپنے ہی اخبار کی اس غلط بیانی کی تردید کریں گے جو اُن کی تصویروں کی مدد سے

بولا گیا ہے۔

کشمیر واپس آنے کے بعد بخشی صاحب کی مصروفیات میں چرار شریف جانا بھی شامل ہے۔ یہ وہی زیارت ہے جس کے لیے ایک عقیدت مند سے بخشی صاحب نے چندے میں ایک کار حاصل کی اور اس کو فروخت کر کے اس کا پیسہ زیارت کو دینے کے بجائے اپنے ذاتی صرف میں لائے۔

بخشی صاحب کی معزولی کے بعد سے اہل کشمیر نے ایک حد تک اُن کو معاف کر دیا ہے، اس کی کئی وجوہ میں سے ایک یہ ہے کہ انہوں نے خود کو دوبارہ شیخ محمد عبداللہ کا خادم مشہور کر دیا۔ بار بار شیخ صاحب سے ملاقاتیں کیں اور اپنی وفاداریوں کا یقین دلایا۔ لیکن اس معاملے میں وہ خاصے ''سیاستدان'' ہیں۔ دلی جاتے ہیں تو شیخ محمد عبداللہ کے خلاف کھل کر نہیں، لیکن گول مول بیان دیتے ہیں۔ کچھ اس طرح باتیں کرتے ہیں...... ''دنیا جانتی ہے کہ شیخ محمد عبداللہ کو کس نے قید کیا تھا۔ میں وطن کا وفادار ہوں۔'' دلی والوں کے لیے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے۔ کہ شیخ محمد عبداللہ کو بخشی غلام محمد نے قید کیا تھا اور بخشی غلام محمد ہندوستان کے وفادار ہیں۔ لیکن شیخ محمد عبداللہ کے حامیوں کے لیے کشمیر میں اس کے یہ مطلب ہوتے ہیں کہ شیخ محمد عبداللہ کو مرکزی سرکار نے قید کرایا تھا اور بخشی غلام محمد شیخ محمد عبداللہ کے اس موقف کی حمایت کرتے ہیں کہ کشمیر کو آزاد اور خود مختار ہونا چاہیے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ بخشی صاحب دلی میں ایک بات کہتے ہیں اور کشمیر میں دوسری۔ دلی میں اپنی وفاداریوں کا یقین دلانے کے بعد جب کشمیر واپس آئے اور ایک

زیارت میں حاضر ہوئے تو لوگوں نے پکڑ لیا۔ پہلا مطالبہ یہ کیا کہ ''اصلی مجرم کو پیش کرو۔'' بخشی صاحب بخوبی جانتے ہیں کہ کشمیر میں ''اصلی مجرم'' کس کا لقب ہے۔ جواب میں بخشی صاحب نے کہا کہ یہ مطالبہ صادق صاحب سے کیجیے۔ لوگوں نے ان کو بخش دیا دوسرا مطالبہ اُن سے یہ کیا گیا کہ رائے شماری کرائیں۔ بخشی صاحب نے اس کے جواب میں وہ باتیں نہیں کہیں جس کا یقین انہوں نے مرکزی سرکار کے لیڈروں کو اپنے ایمان کے ''ساتویں جُزو'' کے طور پر دلی میں دلایا ہے۔ جب اُن سے رائے شماری کرانے کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا...... ''ایک بار نہیں، تین بار......'' مطلب یہ تھا کہ اے لوگو! میں کشمیر میں رائے شماری کی حمایت کرتا ہوں، ایک بار نہیں، تین بار۔ تم مجھ کو شیخ محمد عبداللہ کا ادنیٰ سپاہی سمجھو لیکن دلی میں مرکزی سرکار کے لیے اس کا مطلب وقت پڑنے پر بخشی صاحب یہ بھی بیان کر سکتے ہیں...... ''حضور آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے تو اُن سے یہ کہا ہے کہ رائے شماری تین بار ہو چکی ہے۔ ہاں آپ جانتے ہیں، میں بیمار آدمی ہوں۔ نقاہت کی وجہ سے پوری بات زبان سے نہیں نکلی۔ آدھی بات کہنے کے بعد دم پھول گیا......''

جب شیخ محمد عبداللہ جیل سے رہا ہوئے تو بخشی غلام محمد اُن سے جا کر بہ اندازِ خادمانہ ملے اور ایک اطلاع کے مطابق انہوں نے شیخ صاحب سے کہا۔ آپ جانتے ہیں آپ کو میں نے اپنی مرضی سے نہیں قید کیا۔ آپ کے ساتھ جو نازیبا سلوک ہوا ہے اُس کے لیے اگر چہ میں آلۂ کار بنا لیکن میں

نے اس بات کا لحاظ رکھا کہ آپ کے مفادات کو نقصان نہ پہنچے۔ چناں چہ آج بھی کشمیر کا مسئلہ وہی ہے جو آپ کے قید ہونے سے پہلے تھا۔ یہی نہیں بلکہ محاذ رائے شماری وغیرہ کو میں نے ہی زندہ رکھا ہے کوئی اور حکومت ہوتی تو اس جماعت کا وجود بھی نہ ہوتا۔"

جان کار لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ محاذ رائے شماری اور پولٹیکل کانفرنس وغیرہ کو باقاعدہ بخشی صاحب اپنے عہد حکومت میں خفیہ فنڈ سے روپے دیتے تھے تاکہ یہ جماعتیں زندہ رہیں۔ اور حکومت ہندان کی وجہ سے خوف زدہ رہے اور بخشی صاحب کو من مانی کرنے دے۔ کیا بخشی صاحب صاف اور واضح الفاظ میں، جن کے دو معنی نہ نکلیں، اس کی تائید یا تردید کریں گے؟

☆

مارچ ۱۹۶۵ء

اسمبلی میں تعلیم بالغاں

چراغ بیگ نے حکومت کے اس اعلان کو بڑی دلچسپی سے سنا کہ اس سال تعلیم بالغاں کے لیے حکومت پندرہ لاکھ روپے خرچ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ چراغ بیگ کی دلچسپی کا سبب اعلان کا مضمون نہیں بلکہ اعلان کا پس منظر ہے۔ جموں میں اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا اور بخشی صاحب ایک مرتبہ ایک ہزار روپے ضرب ڈبل خرچ کروا کے اپنے وفادار اسمبلی ممبروں سے بینچ بجوا چکے تھے کہ حکومت کو تعلیم بالغاں کا خیال آیا۔ ہماری حکومت کو جن حالات میں یہ اقدام اُٹھانا پڑا ہے، اُس کے لیے چراغ بیگ بقول کسے ''مونچھ کے نیچے ہنسنے'' کے سوا اور کچھ نہیں کر سکا۔ سونے کی زنجیریں جتنی تھیں، صرف ہو چکیں۔ اب باقی اسمبلی ممبروں کو کس طرح سے ایک کھونٹے پر باندھا جائے۔ بخشی صاحب ہوتے تو زر وزیور کے انبار لگا دیتے (ویسے رُوٹ پرمٹ کے خیال کی پہلی اختراع کرنے والے کو عبدالرشید بخشی پرائز ملنا چاہیے) لیکن ہماری حکومت کو اس طرح کے ہتھکنڈے آزمانا نہیں آتے۔ (بعض راویوں کا خیال ہے کہ آئینگر کمیشن کا تصور کر کے اس قسم کے تمام اقدامات کے منصوبوں پر خود بخود پانی پھر جاتا ہے) چناں چہ اپنی کتاب ڈسک سے نکال کر انہوں نے اس نئی صورت حال سے نپٹنے کی تدبیر سوچی ہے (ہماری حکومت کو چھینک آنے پر

بھی کتاب دیکھنے کی عادت ورثے میں ملی ہے) اس تازہ کتابی فارمولے کا ثمرہ یہ اعلان ہے کہ ریاست میں تعلیم بالغاں کو عام کر دیا جائے۔ عام لوگ بے چارے اس اسکیم سے فائدہ اُٹھا سکیں یا نہیں، لیکن ہمارے اسمبلی ممبروں کو واقعی اس اسکیم کے دائرہ کار میں لانے کی فوری ضرورت ہے بلکہ چراغ بیگ کا بس چلتا تو اسمبلی کے ایوان میں تب تک قانون سازی کا کام ملتوی کر دیتا جب تک ان بالغ ناخواندہ حضرات کو اپنی مادری زبان میں الف بے لکھنے کی سُدھ بُدھ آجاتی (بخشی صاحب کا خیال تھا کہ جس روز انہیں یہ سُدھ بُدھ آگئی تو قوم کا بیڑا پار ہو یا نہ ہو، اُس کا بیڑا ضرور بیچ منجدھار ہوگا) چناں چہ چراغ بیگ فوراً ایوان میں بلیک بورڈ لگوا دیتا اور سپیکر صاحب کو پہاڑے کی گرد ان کا مانیٹر مقرر کر دیتا۔ تعلیم بالغاں کی اسکیم سے سُنا ہے کہ ہمارے اسمبلی ممبران گھبرا گئے ہیں اور انہوں نے حکومت سے اس اقدام کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ وجوہات یہ دی گئی ہیں کہ جو چیز ہمارے پیارے والدین ہم کو نہ سِکھا سکے، اب بوڑھے ہو کے صادق صاحب کیا سِکھوائیں گے اور فی المثل اگر ہمیں پڑھنے لکھنے کی سُدھ بُدھ آگئی تو پھر ہم تو ند بڑھانے کی بجائے کیا جھک مار کر کتابیں پڑھا کریں گے۔ سُنا ہے کہ جب کانگریس پارلیمانی پارٹی کے وہپ (بہ معنی کوڑا) نے ممبران کو بتا دیا کہ جو ممبران تعلیم بالغاں کی اس مہم میں شامل نہ ہوں اُنہیں چلتا کر دیا جائے گا تو بہت سے اسمبلی ممبروں نے گڑگڑا کر پناہ چاہی "مائی باد شاہو! کیوں ایسا ظلم کرتے ہو۔ ہماری چڑھتی جوانی پر رحم کیوں نہیں کھاتے جو کام ہمارے دادا، پردادا نے نہیں کیا، اُس پر

کیوں ہمیں مجبور کرتے ہو۔ آخر تمہیں ہر چیز کے لیے عکس انگوٹھا چھاپ کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ ہم نے کب انکار کیا ہے۔ اس لیے ہم پر کیوں ظلم کرتے ہو۔ بعض ممبروں نے اس دُرگت سے گھبرا کر اسمبلی کی نشستوں سے مستعفی ہونے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ جو بات ترکِ موالات نہ کرسکا وہ ''کتاب'' کے عقل نمانے کر دکھائی...... ہمیں مظلوم ناخواندوں سے واقعی بڑی ہمدردی ہے۔ کہاں بخشی صاحب کا زمانہ جب ناخواندگی میں کمال کو اعتبار اور اعتماد کی معراج نصیب ہوتی تھی......... اور کہاں یہ بُرے دن، جب میاں مٹھو کو تعلیم حاصل کرنے کو کہا جارہا ہے۔

بہرکیف ! اسمبلی ممبران کو اُن کے آنسوؤں میں ہی چھوڑ دیجیے۔ چراغ بیگ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ حکومت کس طرح اُن ناخواندوں کو خواندہ کرے گی جو ہاتھ میں بڑی بڑی سرٹیفکیٹیں تو لیے پھرتے ہیں لیکن کتاب دیکھ کر جن کے ذہن سے علم اُسی طرح غائب ہوجاتا ہے جس طرح گدھے کے سر سے سینگ، یقین نہ ہو تو کشمیر یونیورسٹی کی ہندی ڈیپارٹمنٹ کی طالبات کو لیجیے۔ اگر پی، ایچ، ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کی یہی رفتار رہی تو چند برسوں کے بعد ہر مڈل پاس خاوند ایک عدد پی، ایچ ڈی بیوی کا خاوند ہوگا۔ لیکن ان زنانہ ''ڈاکٹروں'' کے مبلغ علم کا اندازہ کرنا ہو تو ان سے کبھی اُس سبجیکٹ پر گفتگو کیجیے جس پر انہیں پی، ایچ، ڈی کی ڈگری عطا ہونے والی ہو۔ بغلیں جھانکنا تو آپ نے محاورے میں سُنا ہوگا۔ ان سے ملاقات ہوئی تو آپ اس کی زندہ تفسیر بھی دیکھ لیں گے۔ زندہ رہو ہمارے

ہندی ڈیپارٹمنٹ والو! علم کی سند کو اس قدر گھٹیا بنا دینا تمہارا ہی کرشمہ ہے۔ تمہیں تو کاغذ کا ایک پرچہ ہی دینا ہے۔ باقی رہا قوم کے لیے تم جو دردِ سر پیدا کر رہے ہو، اُس کا تمہیں کیا ڈر۔ وہ تو بڑا قومی مسئلہ ہے!

تعلیم کی بات چلی ہے تو محکمہ تعلیم کے سدا بہار موضوع یعنی مسٹر لکشمی کانت رمبال کی بات بھی آن چلی ہے۔ لکشمی کانت رمبال یہاں سے عورت بن کر بمبئی گئی تھیں لیکن وہاں سے مرد کے روپ میں لوٹے۔ مگر جب سے لوٹے ہیں تب سے سرینگر کی سڑکیں اُن کی پیاری پیاری صورت کو ترستی ہیں۔ چراغ بیگ کے خیال میں اُن کی یہ گمشدگی دراصل زندہ دِلانِ سرینگر کی مردہ دلی کے خلاف ایک خاموش احتجاج کی حیثیت رکھتی ہے جنہوں نے ان کی آمد پر سواگت کا خیال کیا نہ عقیدت کے مظاہرے کا۔ آخر کشمیر کی تاریخ میں جہاں ہرا یرے غیرے کا ایک ایک الگ ''مکان'' بن جاتا ہے۔ اُن کا تو خاص مقام ہے۔ وہ اپسراؤں کی سرزمین کی پہلی دختر ہیں جنہوں نے فرزند بننے کا بھی شرف حاصل کر لیا ہے جنہوں نے نسوانی دُنیا کی خوبصورتیوں کی سیر بھی کی ہے اور جواب مردانگی کے بانکپن سے بھی لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ کشمیر کی تاریخ میں اُن کا کارنامہ اپنی نوعیت کا پہلا کارنامہ ہے۔ اس لحاظ سے وہ ایک تاریخی حیثیت کے حامل ہیں اور جب یہاں مولوی فاروق سے لے کر اصلی مجرم تک کے جلوس نکل سکتے ہیں تو لکشمی کانت رمبال کو نظر انداز کرنا کیا معنی؟

لیکن چراغ بیگ کے بعض احباب کی اطلاع ہے کہ لکشمی کانت صاحب کی گمشدگی میں تاریخی اسباب کی کارفرمائی سے زیادہ اُن کی ذاتی وجوہات کی ذمہ داری ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے سرینگر کی سڑکوں پر

ایک عدد خوب رُو محبوبہ کے بغیر نکلنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ اس ڈرامے کی شدت تاثیر کو مکمل کرنے کے لیے چاہتے ہیں کہ وہ اپنی محبوبہ کی باہوں میں باہیں ڈال کر سڑکوں پر نکلیں اوراس غرض کے لیے آج کل خلوتوں میں رومان کی مشق کر رہے ہیں۔ بہر حال! معاملہ کچھ بھی ہو، لکشمی کانت جی کے قدر دان انہیں فوراً سرینگر کی جلوتوں میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ آخر ہمارے خشک معمولات میں رنگینی کی ایک شمع تو روشن ہو۔

چراغ بیگ کی ڈائری سے!

۱۔ شیخ صاحب کے باہر جانے کے بعد محاذ رائے شماری کی حالت نوجوان بیوہ کی سی ہوگئی ہے جو ہر بات پر آہ سرد بھر کے کہتی ہے...... ''وہ ہوتے تو آپ بھی میرا راج دیکھ لیتے......اب کیا رکھا ہے مجھ میں!

۲۔ کانگریسی کارکنوں نے اپنے بلوں سے باہر آکر اپنی مقبولیت کی شیخیاں بگھارنا شروع کردی ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ جاڑے میں وہ عوام کی نیند حرام نہیں کرنا چاہتے تھے۔

۳۔ مولوی محمد فاروق حکومت سے اس لیے ناراض ہیں کہ انہیں گرفتار نہ کر کے ان کے رُتبے کی توہین کی گئی ہے۔ انہوں نے وزیر داخلہ کے نام ایک مراسلے میں اس امتیازی سلوک پر احتجاج کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے اپنے اس مراسلہ میں وزیر داخلہ کے حضور میں استدعا کی ہے کہ اگر اور کچھ نہیں تو میرے اظہارِ خیال پر ہی پابندی لگادی جائے تا کہ میں چپ کر کے گھر میں آرام کروں اور روز روز کی تقریر بازی سے مجھے چھٹکارا مل جائے۔

تیرے در پر آیا سوالی خیرات دے دینا

اس اخبار کی ۵ نومبر کی اشاعت میں ''مدیر آئینہ'' نے قوم کی حالت زار پر آنسو بہاتے ہوئے لکھا تھا'' ....عادات اور اطوار کے اعتبار سے ہم بھکاریوں کی ایک ایسی قوم بن کر رہ گئے ہیں جو صرف بھیک مانگ کر ہی زندہ رہ سکتی ہے ہم ہر بات کے لیے بھیک مانگتے ہیں۔ اور بھیک مانگنے کے ساتھ شرم، ذلت اور رسوائی کا جو تصور وابستہ تھا، وہ اب اس درجہ محترم بن گیا ہے کہ اعلا اور ادنیٰ کسی کو بھیک مانگتے ہوئے شرم محسوس نہیں ہوتی'' چراغ بیگ کو پچھلے ہفتے ''مدیر آئینہ'' کے اس بیان کی صداقت پر کھنے کا ایک نہیں کئی مواقع مل گئے اور وہ یوں کہ پچھلے ہفتے وزیر اعلا خواجہ غلام محمد صادق نے وادی کے کچھ علاقوں کا دورہ فرمایا اور چراغ بیگ کو اخبار نویس برادری کے ہمراہ ان کے تعاقب میں جانا پڑا، کہ شاید کہیں وہ کوئی ایسی بات کہہ جائیں کہ جس کا بتنگڑ بن سکے۔ صادق صاحب نے اپنی متعدد تقریروں میں کوئی ایسی بات نہیں کہی، جو خبر، کے اعتبار سے اہم ہو اور اِس لحاظ سے اخبار نویسوں کے لیے یہ دورہ کافی مایوس کن تھا۔ لیکن چراغ بیگ کے لیے چوں کہ بڑی بڑی

خبروں سے زیادہ چھوٹی چھوٹی باتیں زیادہ اہم اور دلچسپ ہوتی ہیں۔ اس لیے وہ اپنے ہم عصروں اور ہم سفروں کی طرح مایوس نہیں ہوا۔ اس کے تجربات، مشاہدات اور تاثرات کی دنیا زیادہ وسیع اور اِس کی نظر زیادہ تیز ہوگئی ہے اور وہ اپنی بصیرت عام کر کے اپنے قارئین کی بصارت میں اضافہ کر سکتا ہے۔

صادق صاحب کے اس دورے سے دو ایک باتیں بالکل واضح ہوگئیں۔ ایک یہ کہ صادق صاحب اچھے اداکار نہیں ہیں۔ بلکہ سرے سے اداکار ہیں ہی نہیں۔ دوسری بات یہ کہ کشمیری عوام کی عادتیں، اتنی خراب ہو چکی ہیں کہ کوئی مہذب حکومت ان کا اعتماد حاصل نہیں کر سکتی (کہیں آپ اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں، کہ میں صادق صاحب کی حکومت کو مہذب حکومت سمجھتا ہوں، حاشا کلا) ان لوگوں کو بھیک مانگنے کی وہ بری لت پڑ گئی ہے، کہ جب تک وہ اپنا دستِ سوال دراز نہ کریں انہیں اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔ اس سال خدا کے فضل سے شالی کی فصل توقعات سے کہیں بڑھ کر ہوئی ہے۔ خاص طور پر ضلع اننت ناگ میں کریش پروگرام کی بدولت اتنی پیداوار ہوئی ہے کہ پچھلے بیس تیس برسوں میں کبھی نہ ہوئی تھی۔ اور حق بات یہ ہے کہ پیداوار میں اِس غیر معمولی اضافے میں کیمیاوی کھاد اور تقاوی قرضوں کا بھی بڑا اہم رول ہے۔ بحیثیت مجموعی کسان کی خوشحالی میں اضافہ ہوا ہے اور کم از کم اب کی بار اُسے اگر حکومت کا نہیں تو رب العالمین کا شکر گزار ہونا چاہیے تھا کہ جس کی رحمت نے اس کی محنت اور مشقت کو ساحلِ مراد تک پہنچایا۔

لیکن ہر جگہ کسان اپنی عادت سے مجبور واویلا کرتا ہوا نظر آیا اور عین اس وقت جب صادق صاحب "نیا کشمیر" کے بلند اصولوں کی بات کرتے ہوئے کسان بھائیوں کو زیادہ محنت اور مشقت کی تلقین کرنے لگتے، جلسہ گاہ کے مختلف کونوں سے "کھاد کے پیسے معاف کر دیجیے" کھاد معاف کیجیے" خدا کے لیے ہمارے حال پر رحم کر کے کھاد کی وصولی معاف کیجیے" کی آوازیں بلند ہونے لگتیں اور پھر یہ آوازیں اتنی بلند ہو جاتیں کہ کھاد کے سوا کوئی آواز سنائی نہ دیتی۔ کولگام کے جلسے میں جہاں اِس سال سب سے زیادہ شالی پیدا ہوئی ہے یہ مطالبہ اس شدت کے ساتھ کیا گیا کہ جب صادق صاحب نے "معافی" کا اعلان کرنے سے انکار کر دیا تو کسان بھائی احتجاجاً جلسہ گاہ سے اُٹھ کر چلے جانے لگے اور ناراض کسانوں کو بڑی مشکل سے صادق صاحب کا بھاشن سُننے پر راضی کیا گیا۔ اس کے باوجود وہ ہر دو منٹ کے بعد کھاد کی وصولی معاف کرو کے نعرے بلند کرتے رہے۔ شیخ صاحب اور مرزا محمد افضل بیگ کو یہ سُن کر شاید افسوس ہو، کہ صادق صاحب کے جلسے میں موجود ہزاروں لوگوں میں کسی نے بھی نے حق خود ارادیت رائے شماری یا شیخ صاحب کی رہائی کا مطالبہ نہیں بلکہ سب لوگ یک زبان ہو کر "کھاد معاف کرو" کا مطالبہ کر رہے تھے۔ بخشی صاحب کو بھی یہ سُن کر بڑی تکلیف ہوگی کہ کولگام، اننت ناگ، سوپور اور اوڑی میں کسی نے ان کو یاد نہیں کیا۔ ہر جگہ لوگ صادق وزارت زندہ باد کے نعروں کی گونج میں "کھاد معاف کرو" کا مطالبہ کر رہے تھے۔ لیکن چراغ بیگ کو یہ کہتے ہوئے بے حد مسرت ہو رہی ہے کہ وزیر اعلا

خواجہ غلام محمد صادق نے کسانوں کے اِس بے ہودہ مطالبے کے سامنے سر جھکانے کے بجائے اسے بڑی سختی سے ٹھکرا دیا۔ سوپور اور کولگام کے جلسوں میں کسانوں کی ''بغاوت'' نے بڑی نازک صورت حال پیدا کر دی، ہزاروں لوگ بیک وقت جلسہ گاہ سے اُٹھ کر چلنے لگے۔ مقامی کھڈ پنچوں اور سرکاری افسروں کے چہروں پر ہوائیاں اڑ۔نے لگیں۔ میرے قریب بیٹھے ہوئے ایک سرکاری افسر نے کہا کہ بخشی صاحب ہوتے تو ایسے حالات میں فوراً معافی کا اعلان کر دیتے۔ لیکن صادق صاحب کے چہرے پر کسی قسم کے تردّد یا پریشانی کے آثار ظاہر نہیں تھے۔ وہ کہتے جا رہے تھے ''بھیک مانگنے کی یہ عادت چھوڑ دیجیے'' محنت اور مشقت کی عادت پیدا کیجیے، کھاد کی وصولی معاف نہیں ہوسکتی'' کسان بھائیوں کو صادق صاحب کی یہ ضد بہت بُری لگی۔ لیکن چراغ بیگ کو ان کی یہ ادا بہت پسند آئی۔ صادق صاحب اچھے اداکار نہیں ہیں۔ اچھے اداکار ہوتے تو اپنے سامعین کو خوش کرنے کے لیے ''معافی'' کا اعلان کر دیتے۔ ان کے گھر سے کچھ نہیں جاتا۔ صادق صاحب زندہ باد کے فلک شگاف نعرے لگتے لیکن وہ چٹان کی طرح اپنے فیصلے پر ڈٹے رہے اور بار بار یہی کہتے رہے کہ ''کھاد معاف نہیں ہوگی'' ہاتھ پھیلانے کی عادت ترک کیجیے۔

گزشتہ چودہ برس میں کشمیر کی آتما کو بھیک دے دے کر سلا دیا گیا ہے اور کشمیر کا رواں رواں قرضے میں جکڑا ہوا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ صادق صاحب نے خیرات بانٹنے سے اِنکار کر دیا ہے اور سستی مقبولیت حاصل

کرنے کے لیے کسانوں کو کورپٹ کرنے کا آزمایا ہوا نسخہ ترک کر دیا ہے۔

یہ راستہ بہت پُر خطر ہے خدا خیر کرے؟

ہندوستانی جمہوریت کا رقصِ بسمل :-

''روس کی حیرت انگریز ترقی کے لیے کمیونزم سے زیادہ روسیوں کی قوت ارادی، جفاکشی اور ان کا ایثار ذمہ دار ہے۔ کمیونزم کیا کوئی بھی سسٹم ہوتا، روسی اپنے کردار کی خصوصیات کی بناء پر اپنے ملک کو آگے لے جانے کی کوشش جاری رکھتے۔ یہ ایک مشہور سیاسی مفکر کی رائے ہے اور میں نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ سسٹم چاہے کچھ بھی ہو۔ اگر لوگ دیانتدار، محنتی، جفاکش اور بلند کردار کے مالک ہوں تو ترقی اور خوشحالی کے عمل کو کوئی نہیں روک سکتا۔

کمیونسٹ دوست اگر روس کی ترقی کو کمیونزم کا معجزہ قرار دیں تو جاپان، جرمنی اور امریکہ کی حیرت انگیز ترقی کی توجیہہ کیوں کر ہو سکتی ہے۔ دراصل ان ممالک میں رہنے والے لوگوں کی بنیادی خصوصیات نے انہیں وہ بنا دیا ہے جو وہ آج ہیں۔ اب اس بظاہر غیر متعلق تمہید کے بعد اِس بات پر غور کیجیے کہ ہمارے ملک نے اپنے لیے جمہوریت کا نظام منتخب کر لیا ہے۔ پارلیمانی جمہوریت کا ادارہ دنیا کے بہت سے ممالک میں بڑی کامیابی سے چل رہا ہے۔ اور اپنی بعض خامیوں کے باوجود اِسے دوسرے نظاموں پر فوقیت حاصل ہے۔ دنیا کے اکثر ممالک رفتہ رفتہ جمہوریت کو اپنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جن ممالک میں رہبروں کی رہزنی کی وجہ سے

جمہوریت کا چراغ بُجھ گیا ہے۔ وہاں اسے دوبارہ روشن کرنے کی سعی کی جارہی ہے۔ اپنے وطن ہندوستان میں یہ چراغ ابھی تک بجھا نہیں ہے اور نہ مستقبل قریب میں اس کے بجھنے کا کوئی اندیشہ ہے لیکن پارلیمانی جمہوریت کے مسلمہ اور مروجہ نظام کا ہمارے ہاں کے اہل سیاست نے ایسا حلیہ بگاڑ کے رکھ دیا ہے کہ بالکل ایک نئی جمہوریت کی داغ بیل پڑ گئی ہے اور بڑے بڑے پولیٹیکل سائنٹسٹ اس چکر میں پڑ گئے ہیں کہ ہندوستانی جمہوریت کو کون سا نیا نام دیا جائے۔ یو-پی، ہریانہ، پنجاب، بنگال اور بہار میں جو نئے تجربے ہو رہے ہیں ان کی وجہ سے پارلیمانی جمہوریت کی دنیا میں ایک انقلاب رونما ہوا ہے۔ اور برطانیہ کے بڑے بڑے سیاستدان حیران و پریشان ہیں۔ کہ ظالم ہندوستانیوں نے جمہوریت کو کیا سے کیا بنا دیا۔ برطانوی پارلیمنٹ کو دنیا میں ''مادرِ مہربان'' کا درجہ حاصل ہے اور ہندوستان جو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اس پارلیمنٹ سے اکتساب فیض کرتا رہا ہے۔ لیکن ۱۹۶۷ء کے عام انتخابات کے بعد ہندوستانیوں نے برطانوی جمہوریت کو سامراجی جمہوریت قرار دے کر خالص ہندوستانی جمہوریت کی داغ بیل ڈالی ہے۔ ہندوستانی جمہوریت کی لغت میں ہر ممبر اسمبلی کی ایک قیمت مقرر ہے اور جو کوئی یہ قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہو وہ ممبر اسمبلی کو خرید سکتا ہے۔ بعض ممبروں کی قیمت چھ سو روپے، بعض کی آٹھ سو اور کچھ خوش قسمتوں کی ایک ہزار روپے قیمت مقرر ہے۔ اس لیے جب بھی کوئی خریدار ممبر کی قیمت میں اضافے کا وعدہ کرتا

ہے۔ ممبر صاحب اِسی تڑا کے اس کی جانب بھاگ نکل آتے ہیں۔ جمہوریت کا یہ رقصِ بسملِ ہریانہ، پنجاب، یوپی اور بنگال میں اب کلاسیکی رقص کی حیثیت حاصل کر گیا ہے اور وہاں پر کھلے بندوں ممبرانِ اسمبلی کا نیلام ہوتا ہے۔ ممبر صاحبان کی قیمت چکائی جاتی ہے اور انہیں دن میں کئی مرتبہ ایک کھونٹے سے کھول کر دوسرے کھونٹے پر باندھ دیا جاتا ہے۔ ہریانہ کے ایک ممبر صاحب ابھی تک چار مرتبہ کھونٹا بدل چکے ہیں۔ یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ یہ ان کا آخری کھونٹا ہے۔

☆

فروری ۱۹۶۵ء

گولوالکر اور محاذ کی ساجھے داری

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گرو گولوالکر جی کا جی جنوبی ہند کے حالیہ فسادات سے نہیں بھرا ہے اور اس لیے انہوں نے اب جموں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے۔ گرو جی کو ہماری ریاست میں ماضی میں جو مایوسیاں ہوئی ہیں اس کے داغ ان کے دل پر چاند کی طرح چمک رہے ہیں۔ ان کی ہر تھیوری کشمیر میں آ کر نقش بر آب ثابت ہوئی اور گرو جی کو بہت کم ہماری ریاست کے ساتھ محبت رہی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پرانے داغ مندمل ہو گئے ہیں اور وہ نئے سرے سے کشمیریوں سے پیار کرنے کے لیے آمادہ ہوئے ہیں۔ شاید ان کی آمد کا ہی یہ اثر تھا کہ جموں کے جن سنگھی بھی جیسے کسی بھوت کے شاپ سے متاثر ہو گئے اور انہوں نے مطالبہ کر دیا کہ صدر ریاست، ریاستی اسمبلی میں اپنا خطبہ اردو میں پڑھنے کی بجائے ہندی میں پڑھیں۔ جواب نہیں اس ہندی دوستی کا، جن سنگھی رہنماؤں کو یہ بات بھول ہی گئی کہ ابھی تک انہوں نے خود بھی ہندی نہیں سیکھی ہے اور آل انڈیا ریڈیو کے ہندی خبروں کے بلیٹن کے وقت وہ اس کا سوئچ ایک دم بند کر دیتے ہیں انہیں یہ بات بھی یاد نہیں رہی کہ جموں میں ساٹھ کے قریب جو اخبار نکلتے ہیں ان میں

سے ایک بھی ہندی زبان میں نہیں نکلتا اور گرو گولوالکر کی تقریریں انہیں "پرتاپ" میں اردو رسم الخط میں ہی پڑھنا پڑتی ہیں۔ انہیں یہ بات بھی یاد نہیں رہی کی پوجیہ پریم ناتھ ڈوگرہ تک ہندی زبان سے واقف نہیں ہیں اور اسمبلی میں ان کی تقریریں اردو میں ہی ہوا کرتی ہیں۔ لیکن یہ باتیں تو اس شخص کی سمجھ میں آسکتی ہیں جو اپنے دماغ سے سوچ رہا ہو۔ جن سنگھیوں نے تو اپنے دماغ کرایے پر دے رکھے ہیں اور پھر گرو گولوالکر جی نے ان کے حواس پر شاپ پھیر دیا ہے۔ گرو جی سے عرض ہے کہ ان کی عنایت کے بغیر بھی ہم بڑی اچھی طرح سے جی رہے ہیں۔ وہ ہم پر صرف اتنی دیا کریں کہ ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دیں۔ کشمیر میں ہندو، مسلم، ہندی، اردو کا کوئی جھگڑا نہیں ہے وہ اپنی دکان بڑھالیں، ہم اپنی فکر آپ کرلیں گے اُدھر محاذ والوں کو گرو جی کی سرگرمیوں سے بڑی تکلیف پہنچتی ہے لیکن محاذ والوں سے استدعا ہے کہ وہ ذرا اپنے دامن میں بھی جھانک کر دیکھیں۔ ترک موالات کی تحریک کا مرکز جس طور مساجد کو بنایا جارہا ہے اس سے وہ اگر کسی شخص کے ہاتھ مضبوط کررہے ہیں تو وہ گرو گولوالکر ہیں نہ معلوم ان دودھڑوں کو اس بات کا علم بھی ہے کہ نہیں کہ دونوں کے درمیان ایک فطری مماثلت پائی جاتی ہے اور دونوں ایک دوسرے کو مضبوط کرنے کے لیے نادانستہ طور پر کام کررہے ہیں۔ جموں میں گرو جی کی سرگرمیوں سے یہاں محاذ کے بجھے ہوئے چراغ میں تیل پڑ جاتا ہے اور یہاں محاذ کی سرگرمیوں سے جموں کے جن سنگھیوں کے مردہ چہروں پر صحت کی سرخی آجاتی ہے محاذ اور گرو جی منہ

سے ایک دوسرے کو کوس رہے ہیں لیکن حقیقت میں ایک دوسرے کو زندگی کی قوت بخش رہے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اس محبت کی دلالی اب بخشی صاحب کے حصے میں آ گئی ہے۔ دہلی میں وہ کٹر جن سنگھیوں کی زبان بولتے ہیں اور دہائی دیتے ہیں کہ کشمیر پر ہند دشمن عناصر کا قبضہ ہو گیا ہے لیکن کشمیر میں وہ محاذ کے لیڈروں کے پیر چوم لیتے ہیں اور اُن سے کہتے ہیں کہ آپ تو اپنے مسلمان بھائی ہیں اصل دشمن تو بھارت ہے بھارت، کمال یہ ہے، کہ جن سنگھی اور محاذ دونوں ساون کے اندھوں کو اس تضاد بیانی میں کوئی عیب محسوس نہیں ہوتا۔

☆

اپریل ۱۹۶۵ء

چور کا بھائی گرہ کٹ

مثل مشہور ہے ''چور کا بھائی گرہ کٹ'' یہ بہت پرانی مثل ہے۔ کم سے کم ریاست جموں وکشمیر میں مثل یوں ہونا چاہیے ''چور کی بہن جموں وکشمیر پولیس۔'' پولیس ایسا محکمہ ہے جو چوروں اور بدمعاشوں کو پکڑنے اور شہری زندگی کو پُر امن رکھنے اور قانون کی عمل داری برقرار رکھنے کے لیے ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ چوروں اور بدمعاشوں سے پولیس کا ساز باز ہوتا ہے۔ چور کی یہی بہن شہری زندگی کے امن میں رخنہ ڈالتی ہے اور قانون اس سے اسی طرح بھاگتا ہے جیسے مہذب ملکوں میں اشتہاری مجرم پولیس سے۔ ایک چھوٹی سی مثال لیجیے۔ جموں وکشمیر کی پولیس کی ساری سرگرمیاں اس بات کے لیے وقف ہیں کہ ایڈیٹر ''آئینہ'' جو خط اپنی اہلیہ اور دوسرے عزیزوں یا منیجر ''آئینہ'' کو لکھے ان کو اُڑا لے۔ اس کو وہ سینسر شپ کہتے ہیں۔ ریاست کے وزیر اعظم خواجہ غلام محمد صادق کے علم میں جب یہ بات آئی تو انہیں حیرت ہوئی اور انہوں نے اس بے ہودگی کو ختم کرنے اور اس کے بارے میں رپورٹ پیش کرنے کی ہدایت کی۔ اس چھوٹی سی ریاست کا جو رقبہ ہے اور جتنی یہاں آبادی ہے، اس کی ضرورت کے مطابق یہاں صرف ایک سینئر

سپر نٹنڈنٹ پولیس، ایک سپر نٹنڈنٹ پولیس دو ڈی، ایس، پی چار انسپکٹر بیس سب انسپکٹر اور زیادہ سے زیادہ چار سو سپاہی کافی تھے، لیکن پولیس کی مد پر دو کروڑ روپے سے زیادہ روپیہ ہر سال برباد کیا جارہا ہے اور اس دو کروڑ روپے سے عوام کو صرف یہ فائدہ ہے کہ ان کی ڈاک سینسر ہوتی ہے۔ یا پھر اصلی مجرموں کی حفاظت کی جاتی ہے۔ چور کی بہن یعنی جموں و کشمیر پولیس کا ریکارڈ کافی دلچسپ ہے۔ آزادی کے بعد اس کی داغ بیل بخشی غلام محمد کی نگرانی میں ڈالی گئی تھی۔ کیوں کہ اُس وقت موصوف جناب شیخ محمد عبداللہ کے داہنے ہاتھ تھے۔ ۱۹۵۳ء میں اسی داہنے ہاتھ نے شیخ محمد عبداللہ کو قید کرایا اور پولیس کے محکمہ میں سیاہ وسفید کرنے کا اختیار انہیں ملا۔ اب یہ بات کوئی راز نہیں رہی ہے کہ بخشی صاحب کے بعد ڈی، پی صاحب موصوف کو پولیس کے محکمہ سے عشق ہے اور یہ عشق اس قدر پختہ ہے کہ لوگوں کو بڑے شکوک ہونے لگے ہیں۔ چراغ بیگ نے بہت سے سمجھ دار لوگوں کی زبان سے یہ بات سنی ہے کہ موصوف ریاستی سرکار کو گڑیا گڈے کا کھیل سمجھتے ہیں۔ اس زمانے میں بھی جب آپ جمہوری نیشنل کانفرنس میں تھے اور آپ کی بات مرکز میں اُس وقت بھی قابل اعتماد سمجھی جاتی تھی۔ چناں چہ آپ نے بخشی غلام محمد سے نبرد آزمائی کی اور آخر کار بخشی غلام محمد کو کامرا جا گیا اور آج موصوف موجودہ وزارت میں اس طرح با اختیار ہیں جس طرح بخشی غلام محمد شیخ صاحب کی وزارت میں با اختیار تھے۔

چراغ بیگ کو ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت گرفتار کرنے کی دھمکی دی

گئی ہے۔الزام یہ ہے کہ چراغ بیگ نے شاعر نہ ہونے کے باوجود اسی تیسرے صفحے پر ایک نظم شائع کی تھی جس میں موصوف سے بھی کچھ چھیڑ چھاڑ کی گئی تھی۔ چھیڑ چھاڑ دوسروں سے بھی تھی۔ لیکن صرف ایک کلین شیو کو اپنی داڑھی میں تنکا چبھتا ہوا محسوس ہوا۔ اور اتنا کہ ابھی تک اس کی کھٹک ہو رہی ہے۔ دوسروں نے اپنے بارے میں شعر مسکرا کر پڑھے۔ چراغ بیگ کی اطلاع کے مطابق علی محمد طارق اور پیر غیاث الدین نے اپنی زندہ دلی کا ثبوت یوں دے دیا کہ یہ نظم خود پڑھ کر دوسروں کو سنائی۔ لیکن اپنے موصوف غضبناک ہو گئے اور ایڈیٹر ''آئینہ'' کو ستانے کا لمبے عرصے کا پلان بنایا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ریاست کی پولیس کا دو کروڑ روپے سے زیادہ کا بجٹ صرف اسی بات پر خرچ ہو رہا ہے کہ ایڈیٹر ''آئینہ'' کی ڈاک سنسر ہو اور پولیس والے ہر جگہ یہ دریافت کرتے پھریں کہ ایڈیٹر ''آئینہ'' اور اس کے عزیزوں کے درمیان تعلقات کیسے ہیں۔ چراغ بیگ یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ ایڈیٹر ''آئینہ'' ہرگز دو کروڑ روپے سالانہ کی توجہ کا مستحق نہیں ہے۔ چراغ بیگ وزیر داخلہ کو ان کے محکمہ کی نا اہلیت کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے اور یہ بتانا چاہتا ہے کہ ان کا محکمہ بھی ہر سال عوام کے خون پسینے کی کمائی میں دو کروڑ روپے سالانہ کا ہرگز مستحق نہیں۔ ابھی تک اصلی مجرم پیش نہیں کیا جا سکا۔ کاوسہ کی موت ابھی تک پُر اسرار بنی ہوئی ہے۔ سرینگر میں دن دہاڑے شاہراہوں کے کنارے پولیس کی نگرانی میں غنڈوں کے گروہ چاقو چھری دکھا کر نہیں بلکہ تاش کے پتے دکھا کر لوگوں کو لوٹتے ہیں۔ ان باتوں کا احساس

وزیر داخلہ کے علاوہ سب کو ہے۔ چراغ بیگ صدق دلی کے ساتھ اس بات کا اعلان کرسکتا ہے کہ اگر اس کے محکمہ کی یہ کارکردگی ہوتی تو وہ وزارت داخلہ سے مستعفی ہو کر کوئی اور دھندا کرتے۔ جموں وکشمیر پولیس کے بارے میں ایک بنیادی سوال بھی کرنا ہے۔ اُمید تو نہیں ہے کہ وزیر داخلہ اس کا جواب دیں گے!

سوال یہ ہے:-

ہماری ریاست کو دو کروڑ روپے سالانہ والی جموں وکشمیر پولیس کی کیا ضرورت ہے؟ سرحدوں کی حفاظت فوج اور دوسرے صوبوں کی ہتھیار بند پولیس کررہی ہے اور شہروں، قصبوں، دیہاتوں میں لا اینڈ آرڈر کی ذمہ داریاں پنجاب پولیس اور سی، آر، پی کے ذمہ ہیں۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ جموں وکشمیر پولیس صرف اس لیے ہے کہ وہ وزیروں کو سلامی دے۔ چوروں، اُچکوں اور اصلی مجرموں کی حفاظت ہو اور ایڈیٹر ''آئینہ'' کی ڈاک سنسر کی جائے۔ یہ چاروں باتیں اتنی اہم نہیں کہ ان پر ہر سال دو کروڑ روپے سے زیادہ کی رقم خرچ کی جائے۔

بخشی کانگریس مصالحت اپریل ۱۹۶۵ء:-

بخشی صاحب کی کانگریس کے ساتھ مصالحت کی خبر سن کر انہوں نے کیا کچھ محسوس کیا ہوگا وہ تو بس انہیں ہی معلوم ہے۔ لیکن سرینگر میں اُن کے بعض بہی خواہوں کے تو وارے نیارے ہوگئے۔ انہوں نے جو رنگ دکھلائے وہ تو کچھ اُن ہی لوگوں کا دل گردہ جانتا ہے جنہوں نے انہیں نازوانداز سے اتراتے دیکھا ہے۔ نئے سُوٹ سلوائے گئے۔ گھروں میں گھی

کے چراغ جلے۔ چہروں پر غازہ چڑھا، رات کو مے خانوں میں مینا و جام کے دور چلے اور بخشی صاحب کی صحت کے جام پیے گئے۔ کسی صاحب کے ذہن میں وہ نیا محل اُبھرنے لگا جس کا سنگ بنیاد اُسی وقت پڑے گا جس دن بخشی صاحب وزارت عظمیٰ کا قلمدان سنبھالیں گے۔ کہیں اس بات پر جھگڑا چل رہا تھا کہ بخشی صاحب برسر اقتدار آئیں تو اُن سے کیا مانگا جائے۔ بعض دوست تجویز کرر ہے تھے اُن سے کوئی بڑا سا ٹھیکہ طلب کیجیے۔ بعض دوستوں کی رائے اس کے موافق یہ تھی کہ ٹھیکے کا پاپڑ کیا بیلنا ہے تین عدد روٹ پرمٹ لے لیجیے اور عافیت سے گھر بیٹھ کر موج منائیے۔ ایک اور صاحب کہہ رہے تھے کہ پرمٹ میں کیا رکھا ہے اُن سے ''آسمان بلی'' کی نشست حاصل کر لیجیے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ مے کدے میں ہی پلان بنائے گئے کہ بخشی صاحب کی شہنشاہی کا اعلان ہوتے ہی کہاں کہاں دشمن کو کیا کیا سزا دی جائے لیکن آخر میں جھگڑا اس بات پر ہو گیا کہ مراعات تقسیم کرنے کا معیار کیا ہو۔ اسی عالم کیف و سرور میں یہ لوگ اپنے بستروں پر جا لیے اور چراغ بیگ کی اطلاع کے مطابق بلی کی طرح ان کو خواب میں چھیچھڑے نظر آئے۔ ان چھیچھڑوں سے خواب میں لذت لے کر جب وہ صبح بیدار ہوئے تو اُن کی حالت اُس لڑکے کی سی تھی جو خواب میں اپنی ہتھیلی میں پیسے بند کرتا ہے لیکن آنکھ کھلنے پر ہتھیلیاں تو بند سی ہوتی ہیں لیکن خالی۔ ...... شیخ صاحب کی جلاوطنی کی خبر سن کر اور اُن کے خلاف سنگین کاروائی کا شہرہ سن کر بڑے بڑے مجاہدین آزادی اور احرار قسم کے لوگوں نے اپنی مونچھوں کی نوکیں بیک قلم

زمین بوس کر دی ہیں۔ ان لوگوں نے اب قسمیں اُٹھانا شروع کر دیا ہے کہ حاشاو کلا شیخ صاحب سے ہمارا سروکار ہی کیا۔ اس کے علاوہ اب انہوں نے ایک اور تدبیر یہ نکالی ہے کہ جب کہیں گفتگو چل پڑی تو جھٹ سے بول اُٹھے۔ ارے بھائی ہمارا سیاست سے کیا واسطہ۔ سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو آباد کر رہے ہیں۔ اور ہم خوامخواہ تباہ ہو رہے ہیں۔ چھوڑو جی ...... سب غرض کے بندے ہیں۔ کچھ اپنی بات کرو۔ اس کے علاوہ معلوم ہوا ہے کہ اس خبر کے سنتے ہی ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت نظر بند قیدیوں نے اب قلم کاغذ کے لیے ہول سیل آرڈر دے دیے ہیں۔ تا کہ فرصت سے اعتذار نامے لکھ کر اپنی رہائی کا کچھ بندوبست کریں۔ بعض احرار صاحبان نے شیخ صاحب کے فوٹو اپنے کمروں اور دکانوں سے اُٹھوائے ہیں۔ اور اس کے علاوہ "محاذ" کے ہاکر کو تاکید کر دی ہے کہ وہ آئندہ سے اُن کے نام یہ اخبار نہ لایا کرے۔

☆

جون ۱۹۶۵ء

کشمیری نیشنلزم کو نظر انداز نہ کیجیے

اس وقت کشمیر کی اُلجھن کو حل کرنے کے لیے دو مختلف اور متضاد قوتیں ایک دوسرے سے نبرد آزما ہیں۔ ان میں سے ایک کی رہنمائی شیخ محمد عبداللہ کر رہے ہیں جو کشمیر کی موجودہ حیثیت کو ناقابل قبول تصور کر کے مکمل علاحدگی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ دوسری قوت کی نمائندگی خواجہ غلام محمد صادق کر رہے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ کشمیر کی ہندوستان سے علاحدگی خودکشی کے مترادف ہوگی اور اس کی تمام اُلجھنوں کا حل یہ ہے کہ Integration کے عمل کو تیز تر کر دیا جائے۔ یہ دونوں قوتیں ایک دوسرے کی ضد بھی ہیں اور ردِ عمل بھی اور یہی وجہ ہے کہ ان میں ''انتہا پسندی'' کا عنصر روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ نتیجہ کے طور پر کشمیر کی موجودہ حیثیت سے غیر مطمئن تمام عناصر کو مجبوراً شیخ محمد عبداللہ کی قیادت کے سائے میں پناہ لینا پڑتی ہے اور شیخ صاحب کے علاحدہ پسند رجحانات سے اختلاف رکھنے والے ہر فرد کو خواجہ غلام محمد صادق سے Identify ہونا پڑتا ہے۔ نظریات کی اس Polari sation کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ''مکمل ادغام'' اور ''مکمل علاحدگی'' کے نعروں کی گونج میں وہ تمام آوازیں دب کر رہ گئی ہیں جو ان سے مختلف ہیں یا جنہیں کسی دیو قامت شخصیت کا سہارا نصیب نہیں ہو سکا ہے لیکن

جو نحیف اور کمزور ہونے کے باوجود غور و فکر کی مستحق ہیں۔

میں ذاتی طور پر کشمیر کو ہندوستان کا ایک حصہ سمجھتا ہوں ۔ میرے نزدیک ۱۹۴۷ء میں ہماری قومی قیادت نے ہندوستان کے ساتھ وابستگی کا فیصلہ کر کے ایک صحیح قدم اُٹھایا۔ میرا عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے تعلق کو سیکولرازم اور جمہوریت کے استحکام کے لیے ایک موثر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ میرا ایمان ہے کہ کشمیر کے مسلمان اُن پانچ کروڑ مسلمانوں کے تحفظ اور خوش گوار مستقبل کی ضمانت بن سکتے ہیں جنہیں پاکستان بنانے والوں نے نفرت اور بربریت کی آگ سلگا کر اپنے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ ہندوستان کی اکثریت نے اپنے لیے ایک سیکولر جمہوریت کا راستہ اپنا کر میرے عقائد، میرے ایمان اور میری توقعات کو تقویت بخشی ہے۔ ہندوستان کی ہندو اکثریت بغیر کسی مخالفت یا مزاحمت کے اپنے لیے ''ہندو راج'' یا رام راج'' کا راستہ منتخب کر سکتی تھی ۔ لیکن یہ ہندوستانی رہنماؤں کی بالغ نظری، وسیع القلبی اور گہرے سیاسی شعور کا کرشمہ ہے کہ ہندوستانی عوام نے ''جذباتیت'' کا شکار ہوئے بغیر اپنے لیے غیر مذہبی جمہوریت کا کٹھن اور دُشوار گزار راستہ منتخب کیا۔ کشمیریوں کے لیے اپنی تمدنی اور تہذیبی روایات کی روشنی میں ہندوستان سے وابستگی کا فیصلہ ایک اہم تاریخی فیصلہ تھا اور چراغ بیگ کسی ایسی قوت کا حلیف نہیں ہو سکتا جو اس فیصلہ کو بدلنے کے لیے کوشاں ہو لیکن اُس کے باوجود چراغ بیگ کی نگاہوں میں کشمیر کی تمام اُلجھنوں کا حل مکمل ادغام یا مکمل آئینی ہم آہنگی نہیں ہے اور

اس قسم کی تمام کوششیں بالواسطہ طور پر اُن قوتوں کو تقویت پہنچاتی ہیں جو مکمل علاحدگی کا مطالبہ کرتی ہیں۔

میں نے ''آئینہ'' کی پچھلی دو اشاعتوں میں وضاحت کے ساتھ کشمیر کے اصل مسئلے کو اُبھارنے کی کوشش کی ہے۔ میرے نزدیک مسئلہ Integration کا نہیں بلکہ کھوئے ہوئے اعتماد کو بحال کرنے کا ہے یا دوسرے الفاظ میں آئینی الحاق کا نہیں، جذباتی الحاق کا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کشمیر آئینی اور اخلاقی اعتبار سے ہندوستان کا حصہ ہوتے ہوئے بھی ابھی تک جذباتی طور پر ہندوستان کا حصہ نہیں بن سکا ہے۔ ہماری ہر کوشش الحاق کے آئینی اور قانونی پہلو کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے میں صرف ہوئی ہے اور ہم نے ابھی تک ایک بار بھی سنجیدگی سے مسئلے کے جذباتی پہلو کو سنوارنے کی کوئی کوشش نہیں کی ہے۔ اس لیے میں خواجہ غلام محمد صادق اور اُن کی جماعت کے اس مفروضے سے شدید اختلاف رکھتا ہوں کہ یہاں کے تمام مسائل کا حل مکمل آئینی ادغام ہے۔ میرا ایمان ہے کہ گزشتہ ایک سال کے دوران صادق صاحب کی قیادت میں کشمیر کو ہندوستان سے قریب تر کرنے کے لیے Integration کے نام سے جتنے آئینی اقدامات کیے گئے ان سے وہ جذباتی خلیج زیادہ وسیع ہو گئی ہے جو کشمیر اور ملک کے دوسرے حصوں کے درمیان موجود ہے۔ صادق صاحب نے ہندوستانی نیشنلزم کو مطمئن کرنے کے لیے کشمیری نیشنلزم کو کلی طور پر نظر انداز کر دیا ہے اور اس طرح انہوں نے مرض کی تشخیص کیے بغیر مرض کا علاج کرنے کی کوشش کی ہے۔ کشمیری

عوام کے دلوں میں یہ شبہ پیدا ہوگیا ہے کہ ہندوستان کا فرقہ پرست ہندو کشمیر کی انفرادیت کو ختم کر کے اس کی آزادی کو غصب کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ اُسے یہ وہم ہے کہ ہندوستان میں فرقہ پرست قوتیں سر اُٹھا رہی ہیں، اور ان کے عزائم خطرناک ہیں اُسے یہ اندیشہ ہے کہ اس کی سیکولر روایات اور اس کی مخصوص حیثیت خطرے میں ہیں اور یہ اندیشے اب اُسے دور دراز نہیں بلکہ قریب تر نظر آتے ہیں اور اب آپ سے کیا چوری کہ ان اندیشوں اور ان وسوسوں کو تقویت پہنچانے میں ہندوستانی فرقہ پرستوں کا بہت بڑا Contritbution ہے۔ آپ جب وہی کچھ کرتے ہیں جس کا مطالبہ پرکاش ویر شاستری اور بلراج مدھوک کرتے ہیں تو آپ کشمیری مسلمانوں کے جائز اندیشوں کو نظر انداز کرتے ہیں۔

علاقائی نیشنلزم بہت ہی نقصان دِہ رُجحان ہے لیکن اس کا کیا کیجیے کہ یہ ایک بہت بڑی حقیقت بھی ہے۔ ہندوستان ایک ملک ہوتے ہوئے بھی جنوب اور شمال کے چکر میں اُلجھا ہوا ہے جنوب کے لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے آئین میں ترمیم کرنا پڑتی ہے۔ مہاراشٹریوں کے اندیشوں کو دُور کرنے کے لیے پارلیمنٹ کے فیصلوں کو بدلا جاتا ہے۔ ناگا قبائلیوں کو اپنی نیک نیتی کا یقین دِلانے کے لیے اندرونی خود مختاری کا وعدہ دیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوتا ہے کہ علاقائی نیشنلزم ایک بُری چیز ہوتے ہوئے بھی ایک بہت بڑی حقیقت ہے لیکن بدقسمتی سے کشمیری نیشنلزم کے ہر اظہار کو بغاوت اور غداری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کے آئین نے ہر علاقے

اور ہر قومیت کے مخصوص کلچر، زبان اور تہذیب کو پنپنے اور آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کرنے کے بنیادی اصول کو تسلیم کیا ہے۔ زبانوں کی بنیاد پر صوبوں کی از سرِ نو تنظیم اسی بنیادی اصول کی عملی شکل تھی۔

میں ایمان داری سے محسوس کرتا ہوں کہ اگر کشمیری عوام کو اس بات کا یقین دِلایا جائے کہ ہندوستان سے وابستگی کے باوجود ان کی اپنی تہذیب ان کا اپنا تمدن اور اپنی روایات نہ صرف محفوظ ہوں گی بلکہ انہیں آگے بڑھنے کے وہ تمام مواقع میسر ہوں گے جن کی ضمانت ہندوستان کے آئین میں موجود ہے تو کشمیر کا ہندوستان کے ساتھ جذباتی الحاق بھی مکمل ہو جائے گا اور کشمیر میں علاحدگی پسند رجحانات بھی ختم ہو جائیں گے۔ کشمیر نے مسلم اکثریت کے باوجود ہندوستان کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کر کے اپنے لیے ایک امتیازی مقام پیدا کر لیا ہے۔ ہمیں اس امتیازی شان کو اس لیے برقرار رکھنا چاہیے کہ یہ تعصب، تنگ نظری اور فرقہ پرستی پر انسان کی بلند نظری اور علو ہمتی کی فتح کا اعلان ہے۔ بقول شاعر ؎

ایں سعادت بزورِ بازُو نیست

اس کے لیے ہمارے کئی سو سال کی تاریخ، ہماری سیاسی جدوجہد اور ہماری قومی قیادت کی شان دار روایات ذمہ دار ہیں۔ جس طرح امتحان میں اوّل آنے والے طالب علم سے اس کا حاصل کیا ہوا تمغہ چھیننا صریح ناانصافی ہے اسی طرح ہندوستان کے آئین میں کشمیر کی امتیازی پوزیشن کو ختم کرنے کی کوشش کرنا کشمیری عوام کے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہے اور اہلِ

کشمیر ہر اُس کوشش وکاوش کو شک وشبہ کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں، جوان کی اس امتیازی حیثیت کو ختم کرنے کے لیے کی جاتی ہے، چاہے یہ کوششیں اندرونِ ریاست سے ہوں یا بیرونِ ریاست سے !موجودہ حالات میں ہندوستانی رہنماؤں اور مرکزی سرکار کو سب سے زیادہ توجہ اس بات پر دینی چاہیے کہ کشمیری عوام کے دلوں میں کسی قسم کی کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو۔ان کے شکوک اور شبہات دور ہوں اور اس طرح ہندوستان کے خلاف گمراہ کُن پروپگنڈہ کرنے والوں کے منصوبے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔اس مقصد کے حصول کا ایک بہترین ذریعہ یہ ہے کہ کشمیری نیشنلزم کو ایک اہم Factor کی حیثیت سے تسلیم کرلیا جائے اور اس کی آسودگی کے لیے اعلا سطح پر کشمیری قوم پرستوں سے بات چیت کی جائے۔ جولوگ مکمل علاحدگی کا مطالبہ کرتے ہیں اُن سے کسی قسم کی بات چیت کرنا فضول ہے لیکن جولوگ ہندوستان کے ساتھ وابستگی کو قبول کرنے کے بعد اس وابستگی کی جزئیات یا اس کے مختلف پیرایوں پر بحث کرنا چاہتے ہوں اُن کے لیے مرکزی سرکار اور مرکزی قیادت کے دروازے بند نہیں ہونے چاہئیں۔ اگر ملک کی سالمیت اور ایکتا کو برقرار رکھنے کے لیے جنوب میں رہنے والوں کو آئینی ضمانت دینا ضروری ہے، ناگا قبائیلوں کی خواہشات کا احترام کرنے کے لیے آئین میں ترمیم کرنا ناگزیر ہے تو کشمیر کے لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے مرکز کے ساتھ ریاست کے تعلق کو بہتر بنانا بھی غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے اور اس کے لیے ہندوستانی فرقہ پرستوں کے مطالبات سے زیادہ کشمیری عوام کی خواہشات کا احترام کرنا ضروری ہے۔

۱۹۶۵ء

رنگ ساز ......قِرمزی باز اور سِتار نواز

چراغ بیگ جب اسکول میں پڑھتا تھا (وہ کبھی اسکول کے پُلِ صراط کو پار نہ کرسکا۔ کیونکہ اُس میں خواجہ محمد عمر بٹ المعروف پرجاسوشلسٹ پارٹی المشہور ''پیام انقلاب'' کا سا حوصلہ نہ تھا کہ بارہ بار Try again کر کے یہ کھائی پھاند لیتا) تو اُس نے ایک انگریزی محاورہ سُنا تھا کہ بعض لوگ منہ میں چاندی کا چمچہ لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ (اپنے ہاں یہ حقیقت ذرا بدلی ہوئی ہے یعنی چاندی کے چمچے کی بجائے یہاں گھاس کا تنکہ منہ میں رہتا ہے) لیکن چراغ بیگ کا خیال ہے کہ اس محاورے کو کشمیر کی طبیعت کے موافق بنانے کے لیے ڈکشنری میں تھوڑی سی تبدیلی کردی جائے۔ یعنی ''ہاتھ میں رنگ سازی کا بُرش لے کر پیدا ہونا'' الفاظ کی اتنی سی تبدیلی پر آپ کی نگاہوں میں نئے نئے معنی ''لباس مجاز'' پہن کر صف بستہ کھڑے نظر آئیں گے۔ وہ ہیں جناب پسٹن جی صاحب! شیخ صاحب کے چہیتے، بخشی صاحب کے لاڈلے، صادق صاحب کے ہم نوالہ اور ڈی، پی صاحب

کے ہم پیالہ، جب تک رنگ سازی کا مقررہ کوٹا دِن میں ختم نہ کرلیں، تب تک انہیں ایک کروٹ چین نہیں آتا اور کمال یہ ہے کہ ان کے بغیر صاحبانِ اقتدار بھی اپنے جاہ وحشم کو بجھا بجھا سمجھتے ہیں۔ انہیں چند خاص فقرے یاد ہیں...... وہی ہر ایک صاحب کے رٹتے ہیں اور جادو کا سر چڑھ کر بولنا تو دیکھیے...... ہر ایک صاحبِ باتدبیر اس افسون سے کچھ اس طرح سے بے خود ہو کر زمین پر لوٹنے لگتا ہے جیسے بنگال کا جادو مجسم بن کر انہیں لگا دیا گیا ہو۔ اتنا ہی نہیں، ایک دن کا رٹا ہوا فقرہ دوسرے دِن پھر دہرایا جاتا ہے۔ لیکن تیر پھر نشانے پر بیٹھ جاتا ہے اور وزیر باتدبیر یقین کر لیتے ہیں کہ یہ فقرہ صرف اُن ہی کی شانِ دل نوازی کا پَرتو بن کر وجود میں آ گیا ہے۔

خیر بے چارے پسٹن جی تو بے ضرر آدمی ہیں۔ خواہ مخواہ چراغ بیگ کی توجہ میں پھنس گئے۔ ایسی تو ایک پوری فوج ہے اپنے یہاں۔ مسٹر ست لال (ستار جیسے لطیف ساز سے شوق کرنے والے) نے اس فنِ لطیف کو معراج کمال تک پہنچا دیا تھا۔ صفا کدل کی گلیوں میں پلنے والے بخشی غلام محمد کو ''پادشاہم'' پُکار پُکار کے اس حیوانِ ظریف نے اُن کا دماغ ہی بگاڑ دیا اور اس طرح سے ''تارانواس'' محل کی منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے اُن کا کام آسان بنا لیا۔ لیکن نہ معلوم چراغ بیگ کو آج ان درویش قسم کے لوگوں سے ہی کیوں پیار ہو گیا ہے جن کے لیے ''رنگ سازی'' فن برائے زندگی نہیں بلکہ فن برائے فن کی حیثیت رکھتی ہے اور جنہوں نے اسے عبادت کے درجے تک پہنچا دیا ہے۔ یار لوگوں کی تو بات ہی دوسری ہے۔ جو رنگ سازی

کے فن سے اپنی زندگی کے کھوکھلے گیندوں پر روغن چڑھاتے ہیں۔ ان ترقی پسند فنکاروں کی ایک پوری نسل پیدا ہوگئی ہے جو شیخ صاحب کے گیت بھی اُسی لگن سے گاتے تھے جس لگن سے بخشی صاحب کا سنگیت بجاتے تھے اور اب اتنے ہی خلوص سے صادق صاحب کے آگے پیچھے، باادب، باملاحظہ ہوشیار!'' کا نعرہ لگاتے پھرتے ہیں۔ (میر راجپوری تو اُستادوں کے اُستاد ٹھہرے۔ انہوں نے اکیلے غلام قادر گاندربلی کے پاؤں داب داب کر منسٹری کی نازنین حاصل کی) زمانہ لاکھ کروٹیں بدلے اور آسمان ہزار گردشیں کرے، ان لوگوں کا ستارہ ہمیشہ عروج پر رہتا ہے دو ایک ماہ گہن میں رہ کر یہ پھر کچھ اتنی شدت سے نئے حکمران کے ذوقِ سماعت و بصارت پر دھاوا بول دیتے ہیں کہ وہ ساری پٹی بھول جاتا ہے اور مسمریزم کے عالم میں ان کی زُلفِ گرہ گیر کا اسیرِ بے تدبیر ہو جاتا ہے۔ صادق صاحب بڑے سخت جان نکلے، پورے چھ ماہ تک میسرز وانچو اینڈ کو کی عشوہ طرازیوں کی مزاحمت کرتے رہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان مچھندروں نے بھی اب ''بٹھنڈہ کے راستے'' سے پوری شدت کے ساتھ حملہ شروع کر دیا ہے۔

ایک صاحب ہیں جن سے کبھی ایک ستم ظریف نے اُن کا کشمیر کا ایڈریس پوچھا تھا، تو وہ بولے تھے...... معرفت وزیر اعظم ورنہ معرفت سپرنٹنڈنٹ جیل......'' (دوسرا مصرعہ تو بروزنِ شعر ہے۔ البتہ پہلا انہوں نے ثابت کر کے دکھایا ہے) آج کل ڈی، پی صاحب کی مہربانیوں کے سیلاب اور اُن کی مسکراہٹ کی دھوپ میں آگے آگے بڑھ رہے ہیں۔ بلکہ ایک اطلاع

کے مطابق تو ڈی پی صاحب کے جاری کردہ پاسپورٹ پر اب صادق صاحب کے ایوانوں میں بھی پہنچ گئے ہیں۔ اب دِل تھام لیجئے اور انتظار کیجیے کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ کس دراڑ میں سے ''مہِ کامل'' کی صورت میں جلوہ بار ہو جاتا ہے۔ دراصل چراغ بیگ پورے غور وفکر کے ساتھ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ یہ لوگ صاحبانِ اقتدار کے ہی پیارے نہیں بلکہ اُن کے کرم فرما ہیں۔ یہ تو معاملہ نقد کا ہے۔ اس ہاتھ دے، اُس ہاتھ لے، حاکموں کو اسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان سوداگروں کی گرہ میں مال موجود ہوتا ہے۔ سودا طے ہو گیا۔ میاں بیوی راضی، تو مفتی شہر (یعنی میاں چراغ بیگ) شہر کے اندیشے میں کیوں دُبلے ہونے لگے؟ پچھلے دنوں چراغ بیگ کو محاذ رائے شماری (مانگ ہماری ہائے بچاری) کے سالانہ اجلاس میں تشریف آوری کا موقع ملا۔ اُس نے ایک عجیب تماشہ دیکھا۔ پہلے تو اُس کا خیال تھا کہ وہ عالم خواب میں ڈبکیاں کھا رہا ہے لیکن جب اپنی چھنگلی کو دانتوں سے کاٹنے اور لہولہان کرنے کے بعد اُس نے اپنی جگالی کی تصدیق کر لی تو ذرا دھیان سے تماشہ دیکھا۔ یعنی اسٹیج پر دو آدمی بات کر رہے ہیں لیکن تیسرے آدمی کو اس کھسر پسر سے باہر رکھتے ہیں، اس قسم کے درجنوں جوڑے کانوں میں کان ڈالے بیٹھے تھے۔ لیکن کسی دوسرے کو اپنے نزدیک پھٹکنے نہیں دیتے تھے۔ چراغ بیگ بے چارہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سارا تماشہ دیکھتا رہا۔ آخر اُس سے رہا نہ گیا تو اُس نے اپنی بغل میں بیٹھے ہوئے ایک رہنما سے دریافت فرمایا......اجی حضرت یہ کیا کھسر پھر ہو رہی ہے۔ کچھ ہمیں تو بتائیے؟

چراغ بیگ کے تو اُس وقت ساتوں طبق روشن ہو گئے۔ جب یہ رہنما دوسرے ایسے ہی رہنما کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے...... "بھائی آہستہ ! یہ جو تمہارے سامنے لیڈر بنا بیٹھا ہے، سی آئی ڈی ہے، سی آئی ڈی۔ تنخواہ پاتا ہے سرکار سے......" چراغ بیگ کی سمجھ میں بات مشکل سے آئی۔ لیکن جب آئی تو آتی ہی چلی گئی۔ یعنی پھر ایک اور صاحب ان ہی رہنما صاحب کی طرف (جنہوں نے چراغ بیگ کی معلومات میں اضافہ کیا تھا) اشارہ کر کے فرمانے لگے...... "کیوں بھئی ! یہ تنخواہ دار جاسوس تمہیں کیا کہہ رہا تھا۔ اس کی بات کا باور نہ کر لینا۔ پکا سی آئی ڈی ہے۔" اور پھر چراغ بیگ گنتا گیا۔ گنتا گیا (اُس کے گننے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی تسبیح کے دانے گھماتا ہے) شام تک تین سو تیرہ (۳۱۳) دانے گھمائے جا چکے تھے اور جاسوسوں کی اس صف میں محاذ کے اعلا پائے کے لیڈروں سے اس کے چھوٹے چھوٹے کارکن تک آ گئے تھے۔ ایک گورنمنٹ آف انڈیا کا جاسوس، ایک حکومت کشمیر کا سی آئی ڈی ایک بخشی کا مال کھانے والا۔ ایک ڈی پی کا ایجنٹ، ایک مولوی فاروق کے لقمے توڑنے والا وغیرہ وغیرہ۔ اسی عالم میں چراغ بیگ پر ایسی وحشت طاری ہوئی کہ بے چارہ تھر تھر کانپنے لگا۔ اُسے تو کچھ ایسا لگا کہ وہ بھی کسی کا ایجنٹ ہے اور اگر نہیں ہے تو بالکل گدھا ہے۔ سلام ہو تار انو اس کے اس قیدی پر جس نے اپنی ساری قوم پر اپنی سایہ دار شخصیت کی ایسی گہری چھاپ ڈال دی ہے جس نے روٹ پرمٹوں کی بارش کر کے، ٹھیکوں کی کھاد ملا کر اور نوکریوں کا کیمیا چھڑک کے جاسوسوں کی ایک پوری پود تیار کر دی۔

جو اپنی خلوت گاہ میں صرف جاسوسوں کے لیے دروازے کھلے چھوڑتا تھا۔ جس کی چھوٹی چھوٹی تیز آنکھیں عوام کے جمگھٹوں میں فقط ایک جاسوس کو تاک لینے کے لیے بے قرار ہو کر ناچتی رہتی تھیں۔ جسے تب تک قرار نہیں آتا تھا جب تک کہ وہ ایک اچھے بھلے آدمی کو سی آئی ڈی بنا کر نہیں چھوڑتا تھا اور جو تارانواس کی کھڑکیوں پر ایک جاسوس کی آمد کے انتظار میں گھنٹوں راستہ تکتا رہتا ہے۔ اُسے کیا معلوم کہ اُس کا لگایا ہوا ننھا سا پودا کیا برگ و بار لایا ہے۔ اب بیوی خاوند کی سی آئی ڈی اور باپ بیٹے کا جاسوس بن گیا ہے ایک بے چارہ چراغ بیگ بھیڑ میں دھکے کھا رہا ہے اور اُسے کوئی دو ٹکے کو بھی نہیں پوچھتا۔ لیکن اس مال کی اتنی زبردست مانگ دیکھ کر تو اُس نے بھی فیصلہ کر لیا ہے ؎

اے ذوق کوچۂ یار میں گر بھیڑ بھاڑ ہو
تم بھی گھسڑ گھماڑ کے گھسڑم گھساڑ ہو

☆

چالیس لاکھ ضرب چار

چراغ بیگ کی اصلی عمر کا حال خود اُسے بھی معلوم نہیں ہے۔ لیکن اُس نے کشمیری محاورے کے مطابق اپنی عمر میں "سات سیلاب" دیکھے ہیں (یہ ہمارے اجداد کے لیے عمر ماپنے کا میٹرک پیمانہ تھا) اس ساری عمر میں اُس نے جب بھی کسی لیڈر کو تقریر کرتے ہوئے سنا ہے (اور یہ تقریریں سُن سُن کر تو اُس کچھتا تیکان بھی پک گئے ہیں) تو وہ دو چیزوں کی رٹ ضرور لگاتا ہے۔ "ہم کشمیر کے چالیس لاکھ باشندے ہیں۔" اور میں چالیس لاکھ کشمیری عوام کی طرف سے اعلان کرتا ہوں۔" نہ معلوم کشمیر میں ایسی کون سی نسل بستی ہے کہ آج سے تیس سال قبل بھی، جس کی تعداد چالیس لاکھ تھی اور آج بھی بس اُسی نقطے پر جمی ہوئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کشمیریوں کے خون میں کوئی گرمی ہے ہی نہیں، جو آبادی میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔ خیر چھوڑیے اس معاملے کو بیرون ریاست سے شائع ہونے والے اُس چیتھڑے کی رنگین بیانیوں کے لیے جس پر وزارت داخلہ کے حاکم صرف اس لیے پابندی نہیں لگاتے، کیوں کہ جنسی بھوک اور فحاشی کی ان داستانوں کو پڑھ کر خود اُن کی بھوک مٹتی ہے اور وہ عالمِ کیف میں چٹخارے لینے لگتے ہیں۔

بہرکیف مطلب کلام کا یہ ہے کہ ہمارے چالیس لاکھ عوام جب ہوتے ہیں تو ہر کسی لیڈر کے ساتھ ہوتے ہیں۔ محمد علی جناح کشمیر آئے تو ''چالیس لاکھ'' کشمیری عوام نے اُن کا استقبال کیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو یہاں پدھارے تو ''چالیس لاکھ'' باشندگانِ کشمیر نے اُن کا استقبال کیا۔ ماسٹر تارا سنگھ یہاں سدھارے تو ''چالیس لاکھ'' کشمیری سکھوں نے اُن کو ست سری اکال کہا۔ ۱۹۵۲ء میں آئین ساز اسمبلی بنی تو ''چالیس لاکھ'' کشمیری عوام نے اُسے منتخب کیا۔ ۱۹۵۳ء میں شیخ صاحب کو اُس اسمبلی سے نفرت ہوگئی تو ''چالیس لاکھ'' کشمیری عوام اُس کے خلاف ہوگئے۔ ۱۹۵۳ء میں بخشی صاحب نے شیخ صاحب کی جگہ سنبھالی تو چالیس لاکھ کشمیری عوام کے محبوب لیڈر بن گئے۔ علیٰ ہذاالقیاس۔ ۱۹۵۵ء میں مارشل بُلگانن اور مسٹر کروشچیف کشمیر آئے تو چالیس لاکھ کشمیری عوام نے ہند کشمیر الحاق کے حق میں نعرہ بلند کر کے سوویت لیڈروں (جنہیں عمر میں پہلی بار اس قدر جمہوری اور آزادانہ فضا سے روشناس ہونے کا موقعہ ملا تھا) سے الحاق پر عکسِ انگوٹھ چپ نصب کرالیا۔ پھر جب ۱۹۵۸ء میں شیخ صاحب رہا ہوکر آگئے تو یہی چالیس لاکھ عوام حاشا وکلا کہہ کر قسم کھانے لگے کہ ہند سے کشمیر کا الحاق کیا معنی۔ بُلگانن اور پنڈت نہرو کے جلوسوں میں شرکت کے لیے چالیس لاکھ عوام ہندوستان سے درآمد کیے گئے تھے۔ آج کل شہری آزادی کی برکت سے چالیس لاکھ عوام کو یہ اجارہ داری حاصل نہیں کہ وہ کسی چیلنج کے بغیر صرف ایک ہی جلسے میں جایا کریں اور شہری آزادی کے غصب کرنے کا رونا روئیں۔ آج کل

بخشی صاحب کے مشٹنڈے بیگ صاحب، فاروق صاحب، رشی کمار کوشل صاحب، سنت سنگھ تیغ صاحب وغیرہ وغیرہ ہا کے جلسوں میں شریک ہونے پر اُن کی ہڈی پسلی ایک نہیں کرتے لیکن اس کے باوجود یہ ''چالیس لاکھ'' عوام ہیں کہ بیک وقت چار جگہوں پر براجمان ہیں۔ شیخ صاحب اپنا مطالبہ دوہراتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ وہ چالیس لاکھ کشمیری عوام کی آواز کی ترجمانی کرتے ہیں اور جلسے سے ''ضرور ضرور'' کی کان پھٹی آوازیں گرجنے لگتی ہیں۔ پھر مولوی فاروق صاحب جلوس میلاد نکالتے ہیں تو اُس کے ساتھ کشمیر کے چالیس لاکھ عوام کے چیدہ چیدہ نمائندے ہوتے ہیں۔ رشی کمار کوشل تقریر کرتے ہیں تو رٹ لگاتے ہیں کہ چالیس لاکھ عوام صرف یہ چاہتے ہیں کہ یہاں شہری آزادیوں کا خاتمہ ہو۔ صادق صاحب نکلتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ چالیس لاکھ عوام تو نیشنل کانفرنس کے پرچم تلے جمع ہیں اور اُن کی خواہش فقط یہ ہے کہ موجودہ سرکار قائم ودائم رہے۔ یہاں تک تو خیر غنیمت تھا۔ اس کے بعد سابق خالدِ کشمیر ہند کی باری آتی ہے جن کے حامیوں کے نزدیک کشمیری عوام کا صرف ایک مطالبہ ہے اور وہ ہے بخشی صاحب کی رہائی بلکہ مسندِ اقتدار پر جامہ نمائی۔ پچھلے دنوں بخشی صاحب کے تازہ دم پہلوان (جو کبھی بیگ صاحب کے رستمِ داستان تھے) عبدالغنی گونی نے مرکزی پارلیمنٹ میں ایک پھلجڑی چھوڑی ہے۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ ''چالیس لاکھ عوام'' کا مطالبہ بس ایک ہے............ دفعہ ۳۷۰ کی تنسیخ، گونی صاحب جس مچھندر کی روٹیاں توڑ رہے ہو، جس کے خزانوں کی کنجیاں جیب میں لے

کر گنتور، دہلی، جے پور وغیرہ کے چکر لگا رہے ہو، اُس کا ایک سال پُرانا یہ قول بھول گئے کہ ''دفعہ ۳۷۰ صرف میری لاش پر ختم کیا جا سکتا ہے۔'' یہ آپ اور آپ کے ولی نعمت کے دل میں دفعہ ۳۷۰ سے کیسے محبت پیدا ہو گئی؟ اور پھر جب چالیس لاکھ کشمیری عوام اس کی پشت پر ہیں۔ تو تم نے پارلیمنٹ کے محفوظ ہال کو کیوں اس مطالبے کی بازگشت کے لیے چنا ہے۔ آؤ کشمیر آؤ! تمہارے شیدائی کشمیری عوام، تمہارے مُنہ سے اپنے اس محبوب مقصد کی ترجمانی سن کر تمہیں آنکھوں پر بٹھائیں گے۔ تمہارے گرو گھنٹال کو بلائیں گے اور تمہارا وزارتِ عظمیٰ کا وہ خوب پورا ہو جائے گا جو تم نے ۲۱ ستمبر ۱۹۶۴ء کی شام کو سابق خالدِ کشمیر المعروف لکھ لٹ کی چھتر چھایا میں دیکھا تھا...... آؤ کشمیر آ جاؤ...... کشمیری عوام تمہارا راستہ دیکھ رہے ہیں۔ مگر تم یہاں کیسے آؤ گے؟ بخشی صاحب نے اقتدار کی ''لیلیٰ'' کشمیر کی جھونپڑیوں میں حاصل نہیں کی تھی بلکہ دہلی کے ایوانوں میں اس معشوقہ پر شب خون مار کر اُسے اپنے پہلو کی زینت بنا لیا تھا۔ سو اب تک انہیں سیاست کا یہ عظیم سبق یاد ہے۔ انہیں کشمیری عوام کی ناداری اور مفلسی کا پورا پورا علم ہے اور انہیں معلوم ہے کہ اقتدار کی معشوقہ کی شبستان کی چابیاں دہلی کے ایوانوں میں ہی ہیں۔ اسی لیے انہوں نے اپنی ''یاجوج ماجوج'' کی ساری فوج وہیں متعین کر دی ہے۔ ست کچی سے لے کر عبدالغنی گونی تک .... تمام دیوانے دہلی، جے پور اور گنتور کے صحراؤں میں پھر رہے ہیں۔ چابی برداروں کی منتیں کر رہے ہیں۔ کشمیر سے ناطہ توڑے ہوئے ہیں۔ پردیس سے رشتہ جوڑے ہوئے ہیں اور

چالیس لاکھ کشمیری عوام کا پاسپورٹ ہاتھ میں لیے پھرتے ہیں۔ اُس دستاویز کی شکل میں جو انہوں نے بخشی صاحب کی رہائی کے متعلق دستخطی مہم کی صورت میں بنالیا ہے (چراغ بیگ کی اطلاع ہے کہ بخشی صاحب کا ''حلوہ'' کھانے والے ہر منابر اسمبلی نے اس دستاویز پر ہاتھ کی دس انگلیوں کے علاوہ پاؤں کی دس انگلیوں کے نشانات بھی ثبت کر لیے ہیں) تازہ اطلاع ہے کہ اب تار انواس سے ملنے والی خاص ہدایات کے تحت ان منابرین نے منسٹروں کے جمعداروں کو ''بخشیانا'' شروع کر دیا ہے۔ اُن میں ایمبر ائڈری اور کشمیری زعفران کے تحفے دیے جاتے ہیں۔ تا کہ جس وقت منسٹر صاحب آئیں تو اگر اُن سے ملاقات کا شرف حاصل نہ بھی ہو، تب بھی دروازے پر اُن کے حضور میں ناک رگڑنے کی سعادت حاصل ہو جائے۔ چراغ بیگ کی ایک اور اطلاع کے مطابق جب یہ لوگ منسٹر صاحبان کے گھروں کو جاتے ہیں تو وہاں منسٹر صاحب کے نجی کُتے اُن کا استقبال کرتے ہیں۔ لیکن یہ مجنون لیلےٰ کے ''کتوں'' کی اس چھیڑ خانی پر بھی کافی مطمئن ہیں۔ یہ معاملات تو بس عاشقوں کی سمجھ میں آسکتے ہیں۔

چراغ بیگ بے چارے کی عقل تو موٹی ہے ہی لیکن بعض اوقات کچھ ایسے معمّے اُس کے سامنے چھوڑ دیے جاتے ہیں جن کی طرف دیکھ کر اُس کا دماغ واقعی چکرا اُٹھتا ہے۔ تار انواس میں بخشی صاحب کی ناک میں جو اچانک درد ہوا اور انہیں بمبئی کی یاد ستانے لگی۔ وہ ایک ایسا ہی معمہ ہے۔ چراغ بیگ کی بھونڈی عقل میں یہ بات نہیں آئی کہ اُن کی ناک کو حراست

کے بس ایک ہی مہینے میں کیا ہو گیا۔ اس سے قبل ایک سال سے وہ ہر روز ناک کے آپریشن کے لیے سرینگر سے بوریا بستر ہ لے کر جاتے تھے۔ لیکن دہلی میں رگھوناتھ سنگھ کے دروازے پر ناگ رگڑ کر پھر واپس آجاتے تھے۔ خیر یہ تو ایک معمہ تھا۔ دوسرا معمہ محاذ رائے شماری نے میدان میں اپنے جھنڈے کی صورت میں چھوڑا ہے یا تو چراغ بیگ کی عقل میں ہی فتور ہے ورنہ محاذ کے لیڈروں کے دماغ میں پرچھائیاں ہیں۔ ڈنڈے کے نزدیک تھوڑی تھوڑی زردی، غیر مسلموں کا نشان، پھر وسیع سبز زمین، مسلمان اکثریت کی نمائندہ۔ پھر ہلال، ہلال مسلمانوں کا نشان بن گیا ہے۔ یقین نہ ہو تو معرکہ صلیب وہلال پڑھ لیجیے۔ لیکن بیگ صاحب کا اصرار ہے کہ وہ ہلال نہیں، بلکہ ہلالِ اُمید ہے۔ چلیے صاحب یہی سہی، پھر چنار کا پتہ۔ کشمیر کی خصوصیت اور انفرادیت کا نشان ہے لیکن اس کے یہ غیر مبہم معنی محاذ کے لیڈروں کو پسند نہیں ہیں۔ بلکہ انہوں نے اس پر بھی اپنی مصلحت پسندی کا روغن چڑھا دیا ہے۔ یعنی یہ پتہ کشمیر کے سبز کھیتوں کا نشان ہے۔ ارے صاحب اگر کھیتوں کو ہی پیش کرنا ہے آپ نے تو پھر دھان کا خوشہ کیوں نہیں رکھا جو پاکستان اور ہندوستان ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ یہ چنار ہی کیوں جو صرف کشمیر میں پایا جاتا ہے۔ ''آزاد کشمیر'' کو ان اصطلاحوں میں پیش کر کے آپ پھر شرمائے کیوں ہیں۔ یہ تو سیاسی نظریے کا معاملہ ہے اور اُس سلسلے میں آپ کو بھی اتنی ہی آزادی ہے جتنی چراغ بیگ کو۔ اچھا صاحب! اس کے بعد مصافحہ کی باری آتی ہے۔ ہند پاک، ہندو مسلم اور کشمیر کے دو حصوں کا

مصافحہ۔ واقعی جھنڈا نہ ہوا پوری ڈکشنری ہوگئی۔ انسائیکلوپیڈیا ہوگیا۔ چراغ بیگ کو تو بس فکر یہ ہے کہ جس وقت اُسے یہ جھنڈا لہرانے کی فکر سوار ہو جائے گی اُس وقت وہ کیا کرے گا۔ چنار کا پتہ تو خیر جوں توں کر کے بنایا ہی جا سکتا ہے لیکن یہ مصافحہ، یہ چیز نہ کشمیر کے درزی اور نہ ہی چراغ بیگ کے بس کی بات ہے۔ چلیے ابھی سے اس فکر میں دُبلا ہونے کی ضرورت کیا ہے۔ پانچ دسمبر آئے گا تو دوسروں کی دیکھا دیکھی چراغ بیگ بھی اس مشکل کا کوئی نہ کوئی حل ضرور ڈھونڈ ہی لے گا۔

☆

۱۵/ اگست ۱۹۶۸ء

چراغ بیگ کا خط

(وزیر اعظم کے نام)

بحضور عالی جناب وزیر اعظم قلمرو جموں و کشمیر و علاقہ ہائے لداخ ہا

جناب عالی!

یہ چند معروضات آپ کی خدمت میں ''آئینہ'' کے ذریعے سے اس لیے پیش کر رہا ہوں کہ ایک اطلاع کے مطابق ''آئینہ'' سبھی پڑھتے ہیں۔ اگر کسی وجہ سے یہ شمارہ آپ کی نظر سے نہیں گزرے گا تو محکمہ اطلاعات اس خط کے اور اس شمارے میں شائع ہونے والے دوسرے مضامین کے تراشے آپ کی خدمت میں ضرور بھیجے گا اور اس طرح ''آئینہ'' کا پورا شمارہ آپ کو پڑھنا پڑے گا۔ بہت ممکن ہے کہ آپ یہ کھلی چھٹی ''آئینہ'' میں بھی ملاحظہ فرمائیں اور پھر اس کے تراشے کا بھی مطالعہ فرمائیں۔ اس طرح جو باتیں یہ خاکسار چراغ بیگ تحریر کر رہا ہے وہ دوبار آپ کی توجہ حاصل کریں گی اور اس طرح آپ کی یاددہانی بھی ہو جائے گی۔ آپ کو چھٹی لکھنے میں اس بات کا شدید اندیشہ تھا کہ لفافے پر پورے ٹکٹ لگے ہوتے لیکن وہ آپ کے دفتر نہیں پہنچتا اور پہنچتا بھی تو آپ کا دفتر اس چھٹی کو آپ کے علم میں لائے بغیر ضابطے کی کاروائی کے لیے متعلقہ محکمہ کے پاس بھیج دیتا اور متعلقہ محکمہ کسی

مجسٹریٹ سے وارنٹ گرفتاری حاصل کیے بغیر چراغ بیگ کو گرفتار کرتا اور بعد میں اُسے سپرد عدالت کر کے اُسے اصلی مجرم کے کپڑے پہناتا۔

حضور والا! کشمیر کی پچھلی حکومتوں کے بارے میں یہ دُرست کہا جاتا ہے کہ وہ پولیس کے اعلانیہ اور خُفیہ ڈنڈوں، غنڈوں کی غنڈہ گردی رسوائے زمانہ پیس برگیڈ کی مجرمانہ دہشت پسندی کے بل بوتے پر مطلق العنانی کرتی رہیں۔ شہری آزادیاں سرے سے ناپید تھیں، کسی کو اتنی جرأت نہیں تھی کہ منظّم غنڈہ گردی کے خلاف آواز اُٹھائے۔ کیوں کہ آواز اُٹھانے والے کی بیوی جوان ہو تو وہ اور بیٹیاں جوان ہوں تو وہ دن دہاڑے اُٹھالی جاتی تھیں اور پولیس نہ صرف کھڑی تماشہ دیکھتی تھی بلکہ سیاسی بدمعاشوں کی مدد کرتی تھی، آپ نے حکومت کی باگ دوڑ سنبھالتے ہی شہری آزادیاں بحال کرنے، پیس برگیڈ اور سیاسی غنڈہ گردی ختم کرنے کا اعلان کیا۔ یہ ایک بہت مُبارک قدم تھا۔ آپ نے واقعی نہایت سنجیدگی اور خلوص سے اس پالیسی کو عملی جامہ پہنایا۔ آپ کو آرام دِہ کُرسی کا سیاست دان کہنے والے اذیّت پرست سابقہ حکمران یہ کہہ کر ہنستے تھے اور ہنس ہنس کر کہتے تھے کہ چند روز ہی میں شہری آزادیاں آپ کی حکومت کو مفلوج کر کے رکھ دیں گی اور اس کے بعد پھر دوبارہ تجربہ کار ''حکمرانوں'' کو حکومت کی باگ دوڑ سنبھالنے کے لیے زحمت دی جائے گی۔ انہوں نے اپنے غنڈوں کو اس توقع پر صبر سے کام لینے کی تلقین کی۔ لیکن جب شہری آزادیوں کے بحالی سے کوئی سیاسی زلزلہ نہیں آیا بلکہ آپ نے نیشنل کانفرنس کو غنڈوں سے پاک وصاف کرنے کی مہم بھی

شروع کردی تو اُن مفادِ خصوصی رکھنے والوں کے ہاتھوں کے اُلّو (جو طوطے نہیں رکھتے تھے) اُڑ گئے۔

جناب عالی!

لیکن چند روز ہوئے شہر میں ایک ایسی واردات ہوئی ہے اور دن دہاڑے، شہر کے سب سے بڑے چوک میں، جس نے آپ کی حکومت کو سابقہ حکومتوں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ لوگ یہ سوچ رہے ہیں کہ آپ کی حکومت نے پچھلی حکومتوں کے آلۂ کار غنڈوں کو تو ختم کر دیا ہے لیکن نئے غنڈوں کے دستے تیار کرنے کا عمل بھی دھیرے دھیرے شروع ہو رہا ہے۔

جناب والا! چند روز ہوئے ایک طالب علم اسکول سے چھٹی ہونے کے بعد اپنے گھر جا رہا تھا۔ شہر کے سب سے بڑے بارونق چوراہے کے قریب جب وہ پہنچا تو ایک جیپ سے تین شخص اُترے اور انہوں نے اس طالب علم کو اس طرح پیٹا، جیسے پیس برگیڈ والے پہلے لوگوں کو پیٹتے تھے۔ جب وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا تو اتفاق سے اسی وقت اس اسکول کے کچھ اُستاد وہاں پہنچے۔ ان کے پہنچتے ہی حملہ آور جیپ میں بیٹھ کر بھاگ گئے۔ لیکن ان اُستادوں نے خاص مُجرم کو پہچان لیا۔ ایک ''پورے'' وزیر کے صاحبزادے تھے۔ زخمی طالب علم زندگی اور موت کے درمیاں ایک سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔ اس کو ہسپتال لے جایا گیا۔ اس کے بعد پولیس کو اس واقعہ کی اطلاع دی گئی۔ پولیس نے بڑی مستعدی دِکھائی۔ لیکن جیسے ہی پولیس افسر کو معلوم ہوا کہ یہ کارنامہ پورے وزیر کے صاحب زادے کا ہے۔ پولیس کی مستعدی کو

بے موسم کٹھ کشو لگ گیا اور اُس نے یہ کیس رجسٹر نہیں کیا۔ شاید اس مجروح طالب علم کو ''ضرب شدید'' کا سرٹیفکیٹ بھی سرکاری ہسپتال سے نہ مِلے۔ کیوں کہ اس بدقسمت کو ''پورے'' وزیر کے صاحبزادے نے بہ نفس نفیس پیٹا ہے اور ہسپتال کے عملے کی نوکریاں آپ کے ان ساتھی کے اختیار میں ہیں جنہوں نے پچھلے فرعونوں کی خالی نشست کو پُر کرنے کا خواب دیکھا ہے۔

بندہ پرور: اگر اس مُجرم کو اس وجہ سے چھوڑ دیا گیا کہ وہ کابینہ کے ایک رُکن کا لڑکا ہے تو پھر آپ کی حکومت میں اور سابقہ حکومت میں کوئی فرق نہیں۔ ابھی یہ ہوا ہے کل سے دِن دھاڑے سنگین تروارداتیں ہونا شروع ہو جائیں گی اور پولیس کی ریکارڈ میں کوئی اندراج نہیں ہوگا۔

حضور والا بات ذرا تلخ ہے۔ لیکن سچ بات آپ سے زیادہ کون جانتا ہے یہ تلخ ہی ہوتی ہے، پولیس نے یہ کیس رجسٹر نہیں کیا ہے تو اس کی ذمہ داری ان پر ہے:۔

(۱) علاقہ کے تھانے کا عملہ سرینگر
(۲) ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس سرینگر
(۳) سپرنٹنڈنٹ پولیس سرینگر
(۴) ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سرینگر
(۵) ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس سرینگر
(۶) کمشنر کشمیر
(۷) انسپکٹر جنرل پولیس

(۸) وزیر داخلہ جموں و کشمیر

چراغ بیگ کو پبلک ایڈمنسٹریشن کا کوئی تجربہ نہیں ہے لیکن آپ گستاخی نہ سمجھیں تو ایک تجویز پیش خدمت ہے۔ علاقہ کے پولیس عملے کو معطل کر کے، ایک ایک درجہ اُن کا رُتبہ کم کر دیا جائے۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کو نااہلی پر وارننگ دی جائے۔ آج سے دس برس کے لیے اُن کی ترقیاں روک دی جائیں اور اُنہیں ایک مہینہ بغیر تنخواہ کی رخصت پر بھیجا جائے۔ ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس کو کوئی دفتری کام سونپا جائے اور اُن کی سالانہ رپورٹ میں لکھا جائے کہ وہ پولیس کے عملے کی نگرانی کے اہل نہیں ہیں۔ کمشنر کی گھر خدمات شکریہ کے ساتھ حکومت ہند کو واپس کر دی جائیں۔ انسپکٹر جنرل پولیس کو ہدایت کی جائے کہ وہ مجروح طالب علم اور اس کے والدین سے اسی جگہ سب کے سامنے معافی مانگیں جہاں اُس کو پیٹا گیا تھا۔ وزیر داخلہ کو ہدایت کی جائے کہ وہ ریڈیو کشمیر سے ایک تقریر نشر کریں۔ جس میں اس واقعہ پر ندامت کا اظہار کریں اور اس بات کا یقین دلائیں کہ پولیس اس کیس کو رجسٹر کرے گی اور چالان عدالت میں پیش کرے گی۔

کرم گستر:-

جس روز یہ واقعہ ہوا ہے، اور جس روز تک پولیس اس کی رپورٹ درج نہیں کرتی۔ کیا یہ مُناسب نہیں کہ آپ اتنے روز کی تنخواہ نہ لیں اور اپنی رہائش گاہ کا کرایہ اور بجلی، پانی وغیرہ کی فیس خود دیں۔

یہ واقعہ آپ کے لیے ایک بہت بڑی آزمائش ہے۔ اگر کابینہ کے

وزیر کے لڑکے کے خلاف موثر کارروائی نہیں ہوئی تو دنیا یہی سمجھے گی کہ باقاعدہ غنڈہ گردی کی رسم افتتاح انجام دی جا چکی ہے اور وہ دن دور نہیں جب انہیں باتوں کا دور دورہ ہوگا جو سترہ سال سے کشمیر میں دستور کی حیثیت رکھتی تھیں۔ چراغ بیگ کا مشورہ آپ قبول کریں تو یہ نہ صرف آپ کا جرأت مندانہ اقدام ہوگا بلکہ یوم آزادی پر عوام کو آپ کا وہ تحفہ ہوگا جسے سب یاد رکھیں گے۔ تاریخ بھی، عوام بھی، اقربا بھی، وزیر بھی اور آپ سے کیا عرض، خود آپ بھی!!

آپ کا مخلص، چراغ بیگ

☆

نومبر ۱۹۶۶ء

چھوٹی چھوٹی باتیں

(تیسرا صفحہ)

قومی اور بین الاقوامی موضوعات پر لکھتے لکھتے چراغ بیگ کی طبیعت اُکتا گئی ہے۔ اس لیے آج فیصلہ کیا ہے کہ اب کی بار تیسرے صفحے پر کچھ چھوٹی چھوٹی باتوں کا تذکرہ کیا جائے تا کہ مُنہ اور قلم کا ذائقہ بھی بدل جائے۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں بظاہر بہت چھوٹی معلوم ہوں گی لیکن ان کے پیچھے جو ذہنیت کارفرما ہے، اس سے ان کی بڑائی یا بُرائی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

پہلی بات:-

چراغ بیگ، ایس پی کالج سرینگر کا طالب علم رہ چکا ہے۔ اسی کالج سے وہ ایف، ایس، سی میں پاس اور بی، ایس، سی میں فیل ہوا ہے۔ اسی کالج کی گود میں اس کے قلم نے شوخیاں اور اس کی بے زبانی نے تکلّم کا حوصلہ پایا۔ یہیں وہ فزیکس اور کیمسٹری کی جماعتوں میں غالبؔ اور فیضؔ سے فیض اُٹھاتا رہا اور اپنے اُستادوں کی محبت، شفقت اور نفرت کا سزاوار رہا۔ یہیں اس نے پہلی بار ایک ''کافرادا'' سے محبت بھی کی تھی۔ یہ اُن ہی دِنوں کی بات ہے کہ کالج کے بڑے ہال میں مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تصویروں کے ساتھ ساتھ شیخ محمد عبداللہ اور ڈاکٹر کرن سنگھ کی

تصویریں بھی آویزاں تھیں۔ غالباً ان ہی دِنوں کسی مصوّر نے شیخ صاحب کی ایک قد آدم تصویر بھی بنائی تھی۔ جو کسی مسکے باز نے شیخ صاحب کو خوش کرنے کے لیے اس ہال میں نصب کی تھی۔ یہ قدِ آدم تصویر مجھے کبھی اچھی نہیں لگی۔ کیوں کہ یہ تصویر سے زیادہ ایک پوسٹر معلوم ہوتی تھی۔ اگست ۱۹۵۲ء میں جب شیخ صاحب وزیر اعظم نہ رہے تو کسی حقیقت پسند اور صاحبِ ذوق نے اس قدِ آدم تصویر کو غائب کر دیا۔ لیکن مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد اور دیگر رہنماؤں کی تصویروں کے ساتھ شیخ صاحب کی تصویر بدستور آویزاں رہی۔ ۱۹۵۳ء کا زمانہ بڑا قیامت خیز زمانہ تھا۔ نئے حکمران شیخ صاحب کے نام کو لوگوں کے ذہن سے محو کرنے کے لیے عجیب عجیب حرکتیں کرتے تھے۔ ایک رات ''شیر کشمیر پارک'' کا بورڈ چرایا گیا اور کچھ دن بعد اس پر نیا کشمیر پارک کا بورڈ نظر آیا۔ سرکاری دفاتر سے ان کی تصویریں اُتارنا تو ٹھیک ہی تھا۔ سیاسی لیڈروں نے اپنے ذاتی البموں سے بھی ان کی تصویریں نِکال باہر کیں اُن درسی کتابوں میں فوراً تصحیح کا حکم دیا گیا جن میں شیخ صاحب کا ذِکر خیر تھا۔ غرض شیخ صاحب کی ذات اور ان کے نام سے وابستہ ہر چیز کو مٹنے کا حکم دیا گیا۔ اُن دنوں پروفیسر جیالال کول کالج کے پرنسپل تھے۔ مجھے یاد ہے کہ بعض ابن الوقتوں نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ وہ کالج ہال سے شیخ صاحب کی تصویر اُتار کر اس جگہ کوئی نئی تصویر لگا دیں۔ لیکن پروفیسر کول نے یہ کہہ کر اس تجویز کو رد کر دیا کہ شیخ صاحب وزیر اعظم اور وزیر تعلیم نہیں رہے لیکن کشمیر کی تاریخ میں ان کا رول تو زندہ ہے۔ جب تک یہ

تاریخ نہیں مرے گی، شیخ صاحب کی یہ تصویر بھی وہاں موجود رہے گی۔ اس کے بعد کسی کو ''مُفت مشورہ'' دینے کی ہمّت نہیں ہوئی۔ کول صاحب کے بعد کئی پرنسپل بدلے اور ہم جب بھی کالج گئے، ہم نے ہال میں لگی ہوئی تصویروں کے ہجوم میں شیخ صاحب کی تصویر کو مُسکراتے ہوئے دیکھا۔ اس ہجوم میں اب وزیرِاعظم خواجہ غلام محمد صادق، سابق وزیرِاعظم بخشی غلام محمد اور سابق وزیرِ تعلیم شری شیام لال صراف بھی شامل ہو گئے ہیں۔ لیکن پچھلے دِنوں جب ''کوشر مرکز'' کے اجلاس میں شرکت کرنے کے لیے یہ خاکسار کالج گیا تو تصویروں کی اس گیلری میں شیخ صاحب کی تصویر کو نمایاں طور پر ''غائب'' پایا۔ میرا شمار شیخ صاحب کے عقیدت مندوں میں نہیں ہوتا۔ میں ان کا بڑا ہی بے رحم اور بے مروت نقاد ہوں لیکن اس کے باوجود مجھے کالج کی گیلری سے اُن کی تصویر اُتارے جانے سے شدید دُکھ ہوا ہے۔ کیوں کہ اس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہمارے اُستاد اپنی وفاداریوں کا یقین دلانے کے لیے کیا کچھ کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔ کالج کے موجودہ پرنسپل تاریخ کے طالب علم ہیں۔ انہیں شاید معلوم ہوگا کہ گیلریوں سے تصویریں اُتار اُتار کر تاریخ کو بدلا نہیں جا سکتا۔ اس گیلری میں اگر شری شیام لال صراف کی تصویر موجود رہ سکتی ہے تو شیخ محمد عبداللہ کی تصویر اس کی زینت کیوں نہیں ہو سکتی؟ میں جانتا ہوں کہ کسی تاریخی شخصیت کو صرف اس کی تصویریں ہی زندہ نہیں رکھ سکتیں لیکن صرف تصویریں اُتارنے سے ہی اُسے ختم بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ صریح تنگ نظری اور ابن الوقتی ہے!

دُوسری بات:-

پچھلے دِنوں پیرس کی ایک خاتون کی طرف سے پنڈت روگھناتھ ویشنوی ایڈوکیٹ کے نام ایک پارسل موصول ہوا۔ اس پارسل میں چھوٹے بچوں کے لیے ۲۶ جوڑے کپڑے تھے۔ اور ویشنوی صاحب کو ہدایت کی گئی تھی کہ یہ کپڑے کشمیر میں غریب اور مستحق بچوں میں تقسیم کیے جائیں۔ بات چھوٹی سی ہے لیکن اس قابل ہے کہ فُرصت کے اوقات میں اس پر سوچا جائے، یہ خاتون کبھی ہندوستان نہیں آتی ہیں۔ محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتی ہیں۔ اس کے پاس جو رقم بچ جاتی ہے اُس سے بچوں کے لیے کپڑے بنا بنا کر دوسرے مُلکوں کے غریب بچوں کے لیے بھیجتی ہے۔ ہمارے مُلک میں کتنے ایسے لوگ ہیں جو اس قسم کے ''سڑی پن'' میں مُبتلا ہیں۔ ہمارے پاس فالتو پیسہ ہو تو ہم جوا کھیلتے ہیں، لاٹری کے ٹکٹ خرید تے ہیں۔ یا شراب پی کر تیز موٹر چلاتے ہیں اور راہگیروں کو زخمی کرتے ہیں۔ ہم میں سے کسی کو یہ توفیق نہیں ہوتی کہ ہم مذہب، قوم، نسل اور رنگ روپ سے بے نیاز انسان کے دُکھ درد کو کم کرنے کا کوئی مشغلہ اختیار کریں!

تیسری بات:-

شہر کے ایک سینما ہال میں پچھلے سات ہفتوں سے، ''پھول اور پتھر'' نامی فلم دکھائی جا رہی ہے۔ سرینگر میں جب ایک فلم دو ہفتوں سے زیادہ چل جائے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ فلم یا تو انتہائی بے ہُودہ ہے یا اس میں کوئی اور غیر معمولی خصوصیت ہے اور اگر فلم مُسلسل پانچ چھ ہفتے چلتی رہے تو

پھر اس فلم کو ضرور دیکھ لینا چاہیئے کہ دراصل معاملہ کیا ہے۔ یہی ''معاملہ'' دیکھنے کے لیے ناچیز چراغ بیگ نے پچھلے ہفتے ٹکٹ خریدا! فلم شروع ہوئی۔ بڑی معمولی سی روایتی فلم، وہی گھسی پٹی کہانی، سانچوں میں ڈھلی ڈھلائی اداکاری، خالص فلمی ڈائیلاگ، غرض ہر چیز خالص ہندوستانی فلم کے عین مطابق۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ فلم میں سات ہفتوں والی کیا بات ہے۔ اِنٹرول کے کچھ دیر بعد ''معاملہ'' سمجھ میں آ گیا۔ ایک منظر میں جب فلم کا ہیرو (جو پیشے کے اعتبار سے چور ہے) آگ کے شعلوں سے جھلس جاتا ہے تو اس کی سلامتی کے لیے ہندو، مُسلمان، سکھ سبھی دُعا کرتے ہیں۔ اس دوران میں کئی مرتبہ قرآن پاک کی ایک جھلک سامعین کو دکھائی جاتی ہے۔ بات چھوٹی سی ہے لیکن اس سے فلم سازوں کی عیاری اور برادران اسلام کی سادگی کا اندازہ ہو جاتا ہے!

☆

اگست ۱۹۶۲ء

کشمیر کو بچاؤ

جب سے سرینگر میں اسٹیڈیم بنا ہے یوم آزادی اور یوم جمہوریہ کی ہر پریڈ یہیں ہوتی ہے۔ اب کے بھی یوم آزادی کی پریڈ سرینگر اسٹیڈیم میں ہوئی قومی پرچم لہرایا گیا اور وزیر اعظم جناب غلام محمد صادق نے سلامی لی اور حاضرین سے خطاب فرمایا۔ لیکن اب کی جتنے لوگ پریڈ دیکھنے آئے اتنے پہلے کبھی نہیں آئے۔ واقعی تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ اس تقریب کی ایک اچھی خصوصیت یہ تھی کہ صادق صاحب نے صاف ستھری، مختصر مگر جامع تقریر کی۔ چراغ بیگ کو چوں کہ دعوت نامہ نہیں بھیجا گیا تھا، اس لیے وہ عوام کے ساتھ پتھر کی سیڑھیوں پر بیٹھا تھا اور دور سے خواص کو پویلینوں میں دیکھ رہا تھا۔ اگر چہ وہ دوری کی وجہ سے بالشتے نظر آرہے تھے۔ ایک بار یہ خیال آیا کہ واقعی خواص بالشتے ہیں۔ لیکن پھر نہ جانے کیوں یہ خیال مضحکہ خیز لگا۔ پھر سوچا تو یہ اتنا مضحکہ خیز بھی نہیں لگا۔ ہو سکتا ہے پویلینوں میں بیٹھنے والوں کو چراغ بیگ اور دوسرے سیڑھیوں پر بیٹھنے والے عوام بالشتے نظر آتے ہوں۔ اگر ایسا ہے تو یہ ان کی آنکھوں کا ہی نہیں عقل کا (بلکہ بے عقلی کا) قصور ہے۔ کیوں کہ چراغ بیگ ایک بات پوچھنا چاہتا ہے۔ اور لوگ تو نہیں صادق صاحب ضرور اس بات سے اتفاق کریں گے (اگر چہ گزیٹیڈ افسران اس کی

مخالفت کریں گے) کہ جس تقریب پر خزانہ عامرہ سے روپیہ خرچ ہو اس میں سرکاری ملازموں کو خاص مراعات عوام کی قیمت پر نہ دی جائیں۔ پویلنوں میں سرکاری ملازموں کو بیٹھنے کی اجازت بھی نہ دی جائے۔ انہیں سیڑھیوں پر بیٹھنے والوں کو پانی پلانے کی خدمت سونپ دی جائے۔ اسی طرح ''ایٹ ہوم'' پر صرف سرکاری افسروں اور کھڈ پنچوں کو مدعو کیا جاتا ہے۔ عوام کو اپنی حکومت منتخب کرنے کا حق ہو یا نہ ہو حکومت کھڈ پنچ خود منتخب کرتی ہے۔ جب ریڈیو سے یہ خبر عوام سنتے ہیں کہ ''ایٹ ہوم'' میں اعلیٰ سِول اور فوجی افسر اور معززینِ شہر نے شرکت کی تو وہ سوچتے ہیں کہ جن لوگوں کو مدعو نہیں کیا گیا ان کو حکومت معززین میں شمار نہیں کرتی۔ پتا نہیں حکومت نے کس بُنیاد پر شہر کے لوگوں کو ''معزز'' اور ''رذیل ک خانوں میں بانٹا ہے۔ اگر شہر میں صرف چند معزز لوگ ہیں باقی غیر معزز۔ تو پھر اس حکومت کے بارے میں کیا خیال ہے جو عوام کی نمائندہ ہونے کا دم بھرتی ہے۔ وزیرِ اعظم نے یوم آزادی کے نشری پیغام میں دیہاتوں اور شہروں کی محنت کش مردوں اور عورتوں کی محنت کو سماج اور سماجی رشتوں کا خالق قرار دیا تھا اور خاص طور سے ان کو مخاطب کر کے ان کو اُن کے اہم سماجی رول کا احساس دِلایا تھا۔ لیکن ان ہی پر نہ صرف سرکاری تقریبات کے دروازے بند ہوتے ہیں بلکہ ان کو بلواسطہ طور سے رذیل (غیر معزز) کہا جاتا ہے چراغ بیگ مطالبہ کرتا ہے۔

(۱) جو سرکاری افسر اس شام کے ایٹ ہوم میں شریک تھے اُن کی تنخواہوں سے ایٹ ہوم پر خرچ ہونے والی رقم وضع کر کے خزانہ عامرہ میں جمع کی جائے۔

(۲) سرکاری افسروں کے علاوہ جن لوگوں کو مدعو کیا گیا تھا اور جن کو ریڈیو نے معززین شہر بتایا اُن کی فہرست شائع کی جائے تاکہ عوام کو پتا چلے کہ یہ معزّز لوگ کون ہیں۔

(۳) کچھ لوگوں کو معززین شہر کہہ کر بالواسطہ طور سے ریڈیو نے عوام کی دلِ آزاری ہی نہیں، ہتک بھی کی ہے۔ حکومت کو اگر عوام کا درد ہے تو اس کا نوٹس لے اور عوام کی توہین کرنے والے (یا والوں) کو قرار واقعی سزا دے۔

(۴) حکومت ''معزّز'' اور ''غیر معزّز'' کی کسوٹی کا اعلان کرے۔ چراغ بیگ تو سمجھتا ہے کہ سڑک کے کنارے بیٹھ کر جوتوں پر پالش کر کے اپنی روزی کمانے والا، قالینوں کی تجارت کرنے والے بے ایمان لکھ پتی تاجر کے مقابلے میں ''معزّز'' ہے۔

(۵) آئندہ سرکاری ایٹ ہوم اس اصول پر کیے جائیں کہ جو شریک ہو، وہ اخراجات میں شریک ہو اور اس کے دروازے سب کے لیے کھُلے ہوں۔

یہ تو تھیں فلسفیانہ باتیں۔ اب چراغ بیگ کچھ غیر فلسفیانہ باتیں کرنا چاہتا ہے جو اس نے عوام (بے چارے عوام) میں بیٹھ کر پویلینوں میں بیٹھنے والے بالشتوں کو کرتے دیکھا۔

پہلی بات تو یہ تھی کہ کسی مسخرے کو دُور کی سُوجھی کہ پریڈ ''مووی'' ہے اسے ''ٹاکی'' بنایا جائے چناں چہ معلوم نہیں کہاں سے یہ لوگ ایک بکّی کو پکڑ لائے اور اس کو مائیکروفون کے آگے بٹھا دیا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے مُنہ کھول دیا اور بک بک کر کان کھالیے۔ صادق صاحب بنچ پر کھڑے ہوئے تو

اس نے کہا تشریف فرما ہیں۔ حالاں کہ دور سے چراغ بیگ دیکھ رہا تھا کہ وہ کھڑے ہیں، بیٹھے نہیں ہیں۔ جب اس نے ایک بار نہیں، کئی بار تشریف فرما کی رٹ لگائی تو چراغ بیگ کو خیال آیا کہ یہ ضرور کوئی زبانوں کا ماہر ہوگا۔ کیوں کہ اپنی ریاست میں بھونڈی غلطیاں صرف ماہر ہی کرتے ہیں۔ یہ تو خیر زبان کی غلطی تھی، معاف کی جا سکتی ہے۔ لیکن جو بات معاف نہیں کی جا سکتی ہے وہ یہ ہے جب پریڈ نے سلامی دی اور قومی ترانہ بجا تو اُس وقت بھی آپ نے چوبیس (۱۲+۱۲) گز کی زبان بند نہیں کی بلکہ عوام کو بتاتے رہے کہ یہ قومی ترانہ بج رہا ہے۔

چراغ بیگ اس بکی کو بھی معاف کرنے کے لیے تیار ہے لیکن اُن لوگوں کو معاف کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہے جنہوں نے اس تقریب کے لیے پروگرام مرتب کیا تھا۔ پریڈ کے بعد بکی صاحب نے اعلان کیا کہ اب لوک ناچوں کی گہما گہمی ہوگی یہ گہما گہمی برپا کرنے کے لیے کوئی مقامی باشندہ اجازت حاصل نہ کر سکا بلکہ دور دراز سے تین اسکول بُلوائے گئے اور انہوں نے لوک ناچوں کی گہما گہمی کی۔ پروگرام مرتب کرنے والوں کا شاید یہ خیال ہے کہ سرینگر کے بیچاروں کے پاس کوئی ثقافتی ورثہ نہیں ہے اور نہ ان کی کوئی ثقافتی روایات ہیں۔ اگر ان لوگوں کا بس چلتا تو یہ پریڈ کی سلامی لینے کے لیے بانہال سے کسی کو پکڑ لاتے۔ چراغ بیگ نے اس سلسلے میں خاص تحقیق کی۔ تب جا کے یہ راز کُھلا کہ پروگرام مُرتب کرنے والوں نے کچھ اپنے لوگوں کو مُفت کشمیر کی سیر کرانے کے لیے اور کچھ نقدی بھی دلوانے

کے لیے تفریحی پروگرام میں (جس کو غلطی سے کلچرل پروگرام کہتے ہیں) کسی کشمیری کو پروگرام نہ دینے کا فیصلہ کر کے یہ طے کیا کہ صرف باہر سے طالب علم بُلوائے جائیں۔ چراغ بیگ اس تماشے کے دلالوں کی طرح کم نظر اور تنگ نظر نہیں۔ جموں اور لداخ سے پارٹیاں آپ ضرور بُلواتے اور کشمیری پارٹیوں کے ساتھ یہ سب پروگرام پیش کرتے تو رنگا رنگی آتی اور معلوم ہوتا کہ ہمارے فن میں کتنا لوہا ہے۔ یہ زیادتی اور بھی گہری ہوتی ہے جب انعامات تقسیم کیے جاتے ہیں۔ چراغ بیگ نے ایک بات اور نوٹ کی۔ بانگڑے کی پارٹی ہری سنگھ ہائی سکول جموں کی تھی۔ اس میں ایک نوعمر لڑکی اور باقی ۲۵، ۳۰ سال کی عمر کے لوگ تھے۔ سب نہیں تو آدھے سے زیادہ اصلی طالب علم نہیں تھے۔ (اور پھر یہ تو اصلی بانگڑہ بھی نہیں تھا) یہ بدترین بدعنوانی تھی جو اسٹیڈیم میں دیکھنے میں آئی اور یوم آزادی کی سرکاری تقریب پر۔ چوں کہ اس بدعنوانی پر خزانۂ عامرہ سے روپیہ خرچ ہوا ہے اس لیے حکومت جواب دہ ہے کہ اس کی ذمہ داری کس پر ہے حکومت اگر اس بدعنوانی کے مرتکب لوگوں کو سزا نہیں دے سکتی تو سدا چار سمتی اس کا نوٹس لے اور وہ بے چاری ہندوستانی ناری کی طرح صرف دُکھ سہہ سکے اور کچھ نہ کر سکے تو یہ معاملہ سید میر قاسم کو سونپ دیا جائے جنھوں نے نیشنل کانفرنس سے غنڈوں اور بددیانت عناصر کو نکال دینے کی مہم کا آغاز کر دیا ہے۔ حکومت میں بدعنوانی کرنے والے عناصر نیشنل کانفرنس کے گندے عناصر سے کم گندے نہیں ہیں۔ حکومت کے محکموں کو ایسے افسروں سے جلد از جلد پاک کرنے کی

ضرورت ہے، ورنہ یہ نئی وزارت کو رفتہ رفتہ اپنے رنگ میں رنگ لیں گے۔
یوم آزادی کو ایک ستم ظریف نے اپنی کمپنی کی مشہوری کے لیے بھی استعمال کیا۔ جنہوں نے اپنا ایک ذاتی اسکول کھول رکھا ہے۔ غیر معیاری اسکول کا نام اس کے برعکس رکھا ہے اور اس کو اسکول نہیں بلکہ کلچرل اکادمی کی چوٹ پر اکادمی کہتے ہیں۔ یہ ماہر تعلیم کی حیثیت سے بے خبر لوگوں کو "مُفت" مشورے دیتے رہتے ہیں کہ صاحب جب سے حکومت نے تعلیم مُفت کر دی ہے سرکاری اسکولوں میں تعلیم کا معیار گر گیا ہے۔ میں تو آپ کو یہ مشورہ نہیں دوں گا کہ آپ اپنے بچے (یا بچی) کا نام سرکاری اسکول میں لکھا کر اس کا مستقبل خراب کریں۔ ویسے آپ چاہیں تو جس اسکول میں کہیں داخلہ کے لیے لکھ دوں۔ میرا برادارانہ مشورہ ہے (برادرانہ مشورہ صرف مردوں کو) آپ فلاں اکادمی میں اپنے بچے کو داخل کر دیجیے۔ یوم آزادی کی تقریب پر اس اکادمی کی ایک لڑکی آئی تھی اور یہ اپنے سکول کا پلے کارڈ ساتھ لائی تھی جو اس طرح اُٹھائے پھر رہی تھی جیسے سگریٹ والے اپنی مشہوری کے لیے مسخروں کا جلوس نکالتے ہیں۔ جن کے ہاتھوں میں تختیاں ہوتی ہیں۔ کسی اور اسکول نے یہ حماقت نہیں کی تھی جو اس اکادمی نے کی تھی۔ ضروری ہو گیا ہے کہ اسٹیڈیم کے باہر ایک بورڈ پر یہ عبارت ہونی چاہیے۔ "اسٹیڈیم کی دیواروں پر اشتہار لگانا اور اسٹیڈیم کے اندر اشتہار لانا منع ہے۔

☆

جون ۱۹۶۴ء

نیشنل کانفرنس کا کچّا چِٹھا

چراغ بیگ آسکر وائلڈ کی ہمسری کا دعوٰی تو نہیں کر سکتا لیکن کبھی کبھی اس کے اندازِ بیان میں آسکر وائلڈ یت آ ہی جاتی ہے۔ پچھلے سال کامراج پلان کے دھماکے کے بعد جب کشمیر میں ایک ''مزاحیہ وزارت'' قائم ہوئی تو چراغ بیگ اپنے مخصوص انداز میں نئی وزارت کے متعلق اپنے زرّیں خیالات کا اظہار کر رہا تھا۔ ایک نیشنل کانفرنسی کارکن کو میرے تنقیدی ردِ عمل پر بڑا تاؤ آیا۔ کہنے لگے کہ ''آپ نیشنل کانفرنس کو سمجھتے کیا ہیں؟ میں نے تاؤ کھائے بغیر نیشنل کانفرنسی کارکن کو اعتماد میں لیا اور اُسے بتایا نیشنل کانفرنس کی تعریف کیا ہے۔ میں نے کہا کہ ہر ریاست میں پولیس کے پاس عادی اور پیشہ ور مُجرموں کی ایک مکمل فہرست ہوتی ہے۔ اپنی ریاست میں اس فہرست کو نیشنل کانفرنس کا مہذب نام دیا گیا ہے۔ یہ چوروں، ڈاکوؤں، بے ایمانوں، جواریوں اور اس نوع کے پیشہ ور مجرموں کا ایک گروہ ہے۔ میرے اس جواب پر میرے نیشنل کانفرنسی دوست سیخ پا ضرور ہو گئے، لیکن میرے دعوے کی تردید میں وہ کچھ کہہ نہ سکے۔ کیوں کہ میں نے فوراً بعد چند حلقہ پر

پریزیڈنٹوں اور ''منابرینِ اسمبلی''، (ممبران کی یہ جمع گول باغ کے جلسوں میں وضع کی گئی ہے) کے نام لیے جن کے جرائم کی فہرست خود انہیں بھی ازبر یاد تھی ۔ اس کے بعد ایک اور نیشنل کانفرنسی دوست (جو وزیر بھی رہ چکے تھے) نے بڑے جوش و خروش سے دعویٰ کیا ہم اب نیشنل کانفرنس کو عوام تک لے جائیں گے ۔ میرے اندر کا آسکر وائلڈ خاموش نہ رہ سکا اور میں نے کہا ''آپ کسی طوائف کو مسجد میں نہیں بسا سکتے گو میرے منہ سے یہ فقرہ برجستہ نکلا لیکن اس کی معنویت پر غور کیجیے تو اس میں ایک گہری تاریخی حقیقت پوشیدہ ہے۔

نیشنل کانفرنس کا ماضی بہت شاندار رہا ہے اتنا شاندار کہ دُنیا کی کوئی بھی سیاسی جماعت اس کے ماضی پر رشک کر سکتی ہے۔ آزادی کی جدوجہد میں نیشنل کانفرنسی رہنماؤں کا خلوص اور ایثار ہماری قومی تحریک کا قابل فخر سرمایہ رہا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستانی حملہ آوروں کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے نیشنل کانفرنس نے ایک ترقی پسند رول ادا کیا۔ لیکن یہیں سے اس کی موت کا عمل شروع ہوتا ہے، جب کسی سیاسی جماعت کے کارکن اقتدار کی چچوڑی ہڈیاں چوسنے لگ جائیں تو نظریات اور عقائد کی موت بھی شروع ہو جاتی ہے۔ نیشنل کانفرنس کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ اقتدار سنبھالنے کے ساتھ ہی عوامی قوت کا یہ سرچشمہ سوکھنے لگا۔ رہنما اقتدار کے تحفظ میں اتنے مصروف ہو گئے کہ انہیں عوام سے رابطہ قائم کرنے کی فرصت ہی نہیں مل سکی یا انہوں نے اس کی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔ چند سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے نیشنل کانفرنس کے سنجیدہ اور پُختہ کار سیاست داں، جو پوری طرح نیشنل

کانفرنس پر گرفت رکھتے تھے۔ فسطائی رُجحانات کی طرف سے چشم پوشی کرتے رہے۔ ۱۹۵۳ء کے سیاسی بحران نے نیشنل کانفرنس کا شیرازہ بکھیر دیا۔ بڑے بڑے جغادری قسم کے نیشنل کانفرنسی ذہنی انتشار اور نظریاتیخلفشار کا شکار ہوئے۔ ان کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ وہ دیوار کے اس پار رہیں یا اُس پار ہو جائیں۔ کچھ لوگ نظریاتی تصادم کی تاب نہ لا کر گوشہ نشین ہو گئے۔ بہر کیف نیشنل کانفرنس کے نام سے ایک جماعت ''شیرازہ بند'' ہو گئی۔ اس جماعت میں عقائد، نظریات اور اصول پرستی کی کوئی قید نہیں تھی۔ یہ چوں کہ ایک بُحرانی کیفیت کی پیداوار تھی، اس لیے اس کے رہنما اور سیاسی کارکن دونوں نفسیاتی طور پر اپنے آپ کو ایک نارمل عمل کی پیداوار تصور کرنے میں دقت محسوس کرتے رہے۔ نفسیاتی محرکات اور سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر نیشنل کانفرنسی کارکنوں کو ''ترقی پسند'' تحریک کو آگے لے جانے کے لیے کھلی ڈھیل دی گئی۔ رفتہ رفتہ حلقہ پریزیڈنٹ ظلم، رشوت، بددیانتی اور لوٹ کھسوٹ کا سب سے بڑا اسمبل بن گیا۔ مہذب لوگوں میں حلقہ پریزیڈنٹ کا عہدہ گالی بن گیا۔ اگر کسی آدمی نے کسی شریف آدمی کو حلقہ پریزیڈنٹ کہہ کر پُکارا تو اس کی بھویں تن جاتیں۔ وہ ماں بہن کی گالی برداشت کر سکتا تھا لیکن اس نئی گالی کو برداشت کرنا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ دیکھتے دیکھتے نیشنل کانفرنس غنڈوں کی جماعت بن گئی۔ شرفا اس سے ڈرنے لگے، عوام اس سے کانپنے لگے۔ پولیس اور مجسٹریٹ اس کے غنڈوں کے سامنے پالتو کُتوں کی طرح دُمیں ہلاتے دیکھے گئے۔

یہ سلسلہ سیاسی حریفوں کو دبانے کے نام پر شروع ہوا۔ لیکن جلد ہی نیشنل کانفرنسیوں کو سارا کشمیر سیاسی حریف نظر آنے لگا۔ ان کے ظلم کی داد تھی نہ فریاد۔ جتنا بڑا شورہ پُشت غنڈہ تھا اتنا ہی بڑا مقام اُسے نیشنل کانفرنس میں حاصل تھا۔ جہالت، بدچلنی اور بدقماشی نیشنل کانفرنس کا نصب العین ہو کر رہ گئی۔ حکومت کی مشینری کو یہ نصب العین حاصل کرنے کے لیے بڑی فراخ دلی سے استعمال کیا گیا۔ نیشنل کانفرنس میں موجود کچھ صالح عناصر نے قومی سطح پر منظّم اس غنڈہ گردی کے خلاف احتجاج کیا۔ لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا؟

۱۹۵۷ء میں غلام محمد صادق، درگا پرشاد در، سید میر قاسم، گردھاری لال ڈوگرہ (غلام رسول رینزو؟) نیشنل کانفرنس سے الگ ہوئے اور انہوں نے ڈیموکریٹک، نیشنل کانفرنس کی داغ بیل ڈالی۔ ریاست کے لوگوں کو اُمید ہوئی کہ شاید اب یہ لوگ ایک صالح سیاسی تنظیم کو طاقتور بنائیں گے اور غنڈوں کی نیشنل کانفرنس رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گی۔ لیکن اس غنڈوں کی تنظیم کی پشت پر بھارت سرکار کا پیسہ تھا۔ اس کو ایک ضروری لعنت سمجھ کر نئی دِلّی کے لیڈروں اور سرکاری افسروں (کشمیر لابی بخشی لابی؟) نے زندہ رکھنا ضروری سمجھا۔

ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس سے جو توقعات وابستہ کی گئی تھیں وہ پوری نہ ہو سکیں۔ اس کی وجہ کانفرنس کے رہنماؤں میں خلوص کی کمی نہ تھی بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ مرکز کو یقین دلایا گیا تھا کہ صرف سیاسی بلیک میل سے کشمیر کو

ہندوستان کے ساتھ رکھا جا سکتا ہے۔ مرکز نے مداخلت کی اور بالآخر ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس توڑ کر نیشنل کانفرنس میں مدغم کر دی گئی۔ جو صالح عناصر تھے، وہ پھر بدی کے تابع ہو گئے اور اس طرح ''اتحاد'' قائم کیا گیا۔ مصنوعی اتحاد کے پردے میں کشمیر پر بیداد کا سلسلہ پوری شدت کے ساتھ جاری رہا اور اس طرح دس سال تک کشمیر کے حالات آہنی پردے میں رہے۔ ہندوستان کی رائے عامہ کو اس سے بے خبر رکھا گیا۔ اس دوران میں یہاں، عام انتخابات بھی ہوئے اور چراغ بیگ نے اپنی آنکھوں سے مرکزی الیکشن کمیشن کی آبروریزی ہوتے دیکھی۔ چراغ بیگ کو بھی ایک انتخابی مرکز کی نگرانی پر مقرر کیا گیا تھا اور اُسے آج بھی یاد ہے کہ نگران کمیشن کے ایک افسر نے اُسے یہ ہمدردانہ مشورہ دیا تھا کہ وہ حلقہ پریزیڈنٹ صاحب کو ناراض نہ کر دے۔ یہ ایک طویل اور ہوش رُبا داستان ہے۔ ''آئینہ'' کے محدود صفحات پر گنجائش نہیں کہ اسے تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ اسے بیان کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہ ہوتی اگر آج کچھ لوگ نیشنل کانفرنس کی روش کو سینے سے لگا کر اُسے ایک بار پھر ہم پر مسلط کرنے کی کوشش نہ کرتے۔ آج تاریخی تسلسل، روایات اور مصلحتوں کے نام پر اس گلی سڑی لاش کو پھر ہمارے کندھوں پر سوار کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کچھ ''وفاداران ازلی'' نیشنل کانفرنس کے تعفن کو نیشنل کانگریس کا عطر لگا کر چھپانا چاہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ نیشنل کانفرنس صرف اس لیے مر گئی کہ غنڈوں کو حکومت کے وسائل سے محروم کر دیا گیا ہے۔ ان کا دعوٰی ہے کہ اگر پیس بریگیڈ اور حلقہ

پریزیڈنٹوں کی خفیہ تنخواہیں بحال کردی جائیں تو نیشنل کانفرنس کا مردہ پھر زندہ ہوسکتا ہے۔ لیکن مسٹر چھاگلہ نے مُردے کوزندہ کرنے کے طلسمِ پر یقین لانے سے انکار کردیا۔ اُنہوں نے یہاں کے سیاسی خلا کو دیکھا، محسوس کیا اور وہ اِسی نتیجے پر پہنچے کہ نیشنل کانفرنس نام کی کوئی جماعت کشمیر میں اپنا وجود نہیں رکھتی ۔اس لیے انڈین نیشنل کانگریس کو بھی یہاں ایک شاخ قائم کرنا چاہیے۔ چراغ بیگ، چھاگلہ صاحب کی اس حقیقت پسندی کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ صدر آنجہانی نیشنل کانفرنس کی اس مضحکہ خیز تجویز کو قبول نہیں کرسکتا کہ نیشنل کانفرنس ہی کو نیشنل کانگریس میں تبدیل کیا جائے۔ اس دور میں مردے زندہ نہیں ہوسکتے۔

☆

اکتوبر ۱۹۶۶ء

کشمیری کلچر کے ٹھیکے دار

صدیوں کی غلامی، جہالت اور پس ماندگی نے ہمیں ایک عجیب طرح کے احساس کمتری میں مبتلا کر دیا ہے اور یہ احساس نئے نئے پیکر تراشتا ہے من حیث القوم ہم میں ایک بُرائی یہ پیدا ہو گئی ہے کہ ہم ہر چیز کو مذہب کا درجہ دینے لگے ہیں۔ اب رفتہ رفتہ ہم نے اپنے احساس کمتری کو بھی مذہب بنا دیا ہے۔ اس کی تازہ مثال مہجور پر بننے والے فلم کے متعلق کشمیری کلچر کے ٹھیکیداروں کی ہنگامہ آرائی ہے۔ جب بھی کوئی فلم ساز کشمیر کے کسی تاریخی یا تمدنی پہلو پر فلم بنانے کا ارادہ ظاہر کرتا ہے تو بعض گلا پھاڑ قسم کے صحافی اور ادیب ایک غُل غپاڑہ مچا دیتے ہیں کہ کشمیری کلچر کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ کشمیر کی تاریخی شخصیات کو غلط رنگ میں پیش کیا جائے گا وغیرہ وغیرہ۔ آج سے کئی سال پہلے جب فلم ساز محبوب (مرحوم) نے سردار جعفری کے اشتراک سے حبّہ خاتون فلمانے کا اعلان کیا تو کشمیری کلچر کے ٹھیکے داروں نے قبل از مرگ واویلا کے مصداق فلم ساز پر ایسی ایسی تہمتیں تراشیں کہ وہ فلم کاغذی منصوبوں سے آگے نہ بڑھ سکی۔ پھر ایک فلم ساز نے ''مائزِہ رات'' کے نام سے اوّلین کشمیری فلم بنانے کا اعلان کیا تو ان پیشہ ور نعرہ بازوں نے

ایک بار پھر ''کشمیری کلچر خطرے میں'' کا نعرہ لگایا۔ اب بالکل یہی صورت مہجورؔ پر بنائی جانے والی فلم کے ساتھ پیش آرہی ہے۔ اخبارات میں مضامین چھپ رہے ہیں کہ کشمیری کلچر کو مسخ کیا جارہا ہے۔ مراسلات شائع ہورہے ہیں کہ مہجورؔ کے کردار کو غلط رنگ میں پیش کیا جارہا ہے۔ ستم ظریفی یہ کہ مہجورؔ کی بیوہ سے وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی کی خدمت میں ایک یادداشت بھی پیش کروائی گئی کہ ان کے شوہر کی زندگی کے ساتھ ناانصافی نہ ہونے پائے۔ چراغ بیگ کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ہورہا کس لیے ہے! مہجورؔ ہمارے بہت بڑے شاعر تھے۔ ان کی شاعری، ان کا تغزّل اور ان کے گیت ہمارے ادبی سرمایے کا ایک بیش قیمت حصہ ہے۔ انہوں نے جنگِ آزادی کے دوران ہمارے ذوقِ آزادی کو ہمیشہ جوان رکھا۔ یہ سب کچھ صحیح ہے لیکن وہ نہ کوئی مذہبی پیشوا تھے اور نہ روحانی رہنما۔ پھر ان کی زندگی پر فلم بنانے میں کسی کو کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ وہ کشمیری زبان کے کتنے بڑے ہی شاعر کیوں نہ ہوں، ریاست سے باہر دس بیس آدمی بھی ان کے نام سے واقف نہیں۔ اگر ان کی زندگی فن اور شخصیت کے پس منظر میں ایک فلم بنائی جارہی ہے تو اس سے وہ ساری دُنیا سے متعارف ہوجائیں گے۔ اس پر غم و غصّے اور چیخ وپُکار کی کیا ضرورت ہے۔ اس سے کشمیری زبان، کشمیری کلچر اور کشمیر کی عظیم ''روایات'' کا کیا بگڑے گا! آخر مہجورؔ کون سے ایسے دیوتا اور پارسا تھے کہ ان کی زندگی کے متعلق فلم بنانے سے پہلے یہاں کے ہر تیسرے درجے کے ادیب سے منظوری حاصل کی جائے۔ وہ پٹواری رہے ہیں اور پٹواری کو زیادہ پارسائی کا

موقع نہیں ملتا۔ جن لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ مہجورؔ کا کردار مسخ کیا جارہا ہے۔ اُن کی خدمت میں عرض ہے کہ پہلے یہ جاننے کی کوشش کیجیے کہ ان کا کردار تھا کیسا؟ اور پھر یہ جاننے کی کوشش کیجیے کہ فلم میں کس طور یہ کردار پیش کیا جارہا ہے؟ اکثر معترضین ان دونوں ہی باتوں سے ناواقف ہیں۔ جن لوگوں کو ''کشمیری کلچر'' کا غم کھائے جارہا ہے اُن سے بصد ادب یہ عرض ہے کہ کلچر موم کی ناک نہیں ہوتا کہ ایک فلم کی تپش سے پگھل کر بہہ جائے! کشمیری کلچر اور زندگی کو مسخ کرنے والی درجنوں فلمیں ہر سال بمبئی میں بنتی رہتی ہیں۔ ان کے خلاف میں نے کسی ''ٹھیکے دار'' کو احتجاج کرتے نہیں دیکھا (بلکہ یہ فلمیں وہ بڑے شوق سے دیکھتے ہیں) لیکن مہجورؔ پر فلم ابھی بن ہی رہی ہے، ابھی اس کو مکمل ہونے میں چھ سات ماہ صرف ہوں گے۔ ہمارے ہاں کشمیری کلچر کے خودساختہ علم برداروں نے شوروغل مچانا شروع کر دیا ہے۔ ہم پربھات مُکرجی سے گزارش کریں گے کہ وہ اس مصنوعی غُل غُپاڑے کی پروا کیے بغیر مہجورؔ پر فلم مکمل کرلیں۔ شرط یہ ہے کہ فنی اور تکنیکی اعتبار سے فلم اچھی ہو۔ اب رہی بات مہجورؔ کے کردار اور کشمیری کلچر کی چراغ بیگ اُن لوگوں میں سے ہے جو ان دونوں کے متعلق کسی حُسنِ ظن میں مُبتلا نہیں!

یہ مسکے باز، یہ نادان دوست!:-

پچھلے ہفتے ٹیگور میموریل ہال میں طبّی کالج کے سالانہ دِن کے موقعہ پر ایک تفریحی (تمدّنی) پروگرام پیش کیا گیا۔ اس سلسلے میں ۸/ اکتوبر کو چھ بجے شام پروفیسر صاحبان اور ڈاکٹر صاحبان نے اپنے دوستوں، عزیزوں اور

رشتہ داروں کو بھی مدعو کیا تھا۔اس کے علاوہ کچھ ایسے افسران اور معززین شہر بھی مدعو تھے جو ہر تقریب میں بُلائے جاتے ہیں اور بُلائے جاتے رہیں گے۔ ہال میں کچھ اِکادُکا ''عوام'' بھی نظر آئے مگران کی تعداد دس بیس سے زیادہ نہ تھی۔ پروگرام کے ناظم اعلا ہمارے ہاں کے ایک مشہور ڈاکٹر سیّد نصیر احمد تھے جو ہماری بدقسمتی سے ڈاکٹر کم اور سیاست دان زیادہ ہوتے جارہے ہیں۔اس تقریب کا ذکر ''تیسرے صفحے'' پر اس لیے نہیں کیا جارہا ہے کہ آپ کو اس دلچسپ تمدّنی پروگرام کے بارے میں کچھ بتایا جائے بلکہ اپنے ہاں کے میڈیکل کالج کے پروفیسروں اور ڈاکٹروں کی بدانتظامی ہی نہیں ''بدمعاملگی'' سے صادق صاحب اور عوام النّاس کو رُوشناس کرنا چاہتا ہوں۔

دعوت نامے کے مطابق پروگرام چھ بجے شروع ہونا تھا۔ چائے کی دعوت اور تمدّنی پروگرام میں شرکت کے لیے شائقین عام طور پر وقت سے پہلے ہی پہنچ جاتے ہیں اس لیے پونے چھ بجے ٹیگور ہال کی اگلی تین نشستوں کے علاوہ پورا ہال بھر چکا تھا۔توقع تھی کہ ٹھیک چھ بجے پروگرام شروع ہوگا۔ لیکن جوں جوں چھ بجتے گئے،توقعات کا دَم بھی گھٹنے لگا۔ پورے ساڑھے چھ بجے تک منتظمین اور ڈاکٹر صاحبان کے کُنبے بالا قساط آتے رہے۔ ساڑھے چھ بجے ایک بہت بڑے ڈاکٹر صاحب کو یاد آیا کہ ان کی چچا زاد بہن کے پھوپھی زاد بھائی کالڑکا ابھی نہیں آیا ہے اس لیے پروگرام تب تک ملتوی کیا جائے جب تک برخوردار تشریف نہ لائیں۔ پونے سات بجنے لگے اور حاضرین کی بے چینی بڑھتی گئی۔ دوست عزیز بھی اضطرار کی حالت میں

دیکھے گئے اور اس مرحلے پر سامعین کے زخموں پر یہ کہہ کر مرہم رکھنے کی کوشش کی گئی کہ صادق صاحب تشریف لانے والے ہیں۔ چراغ بیگ نہیں جانتا کہ صادق صاحب اس تقریب میں شامل ہونے کے لیے آرہے تھے یا نہیں لیکن بالفرض محال اگر وہ آنے والے بھی تھے تو چراغ بیگ یہ جاننا چاہے گا کہ صادق صاحب وقت پر کیوں تشریف نہیں لائے اور اگر وہ وقت پر تشریف نہیں لائے تو اس کے باوجود پروگرام وقت پر کیوں شروع نہیں کیا گیا۔ بات بظاہر معمولی سی ہے لیکن اگر صادق صاحب کو معلوم ہو کہ ایک گھنٹے کی تاخیر جوان کے نام سے منسوب کی گئی ہے دوستوں دُشمنوں کو کتنی باتیں کرنے کا موقع ملا تو وہ چراغ بیگ کی طرح چراغ پا ہو جائیں گے۔ دس پندرہ منٹ کی تاخیر سمجھ میں آسکتی ہے لیکن پورے ایک گھنٹے کی تاخیر کا کوئی جواز نہیں۔ اگر صادق صاحب غیر معمولی مصروفیات کی بناء پر نہیں آسکتے تو میڈیکل کالج کے ارباب اختیار کو وقت پر پروگرام شروع کر دینا چاہیے تھا۔ یہ تمدّنی پروگرام تھا، کسی مذہبی کتاب کی تلاوت نہیں تھی کہ مولوی صاحب یا پنڈت جی کے بغیر اسے شروع نہ کیا جاسکتا۔

یہ بڑی افسوس ناک بات ہے کہ ایک معمولی سی بات کے لیے صادق صاحب کو نکتہ چینی اور اعتراضات کا مرکز بنایا گیا۔ خُدا کا شُکر ہے کہ سات بجے جب پروگرام شروع ہوا۔ صادق صاحب تشریف نہیں لائے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے مشروط طور پر آنے کے لیے ہاں کر دی تھی لیکنمسکے بازوں نے اپنی کارکردگی دِکھانے کے لیے پورے ایک گھنٹے تک حاضرین کو

انتظار کی زحمت دی۔

صادق صاحب کا وقت بڑا قیمتی ہے لیکن چراغ بیگ اور دوسرے بیگوں کا وقت بھی کچھ کم قیمتی نہیں ۔ خاص طور پر ڈاکٹروں کو یہ بات بخوبی ذہن نشین کر لینا چاہیے۔

''مخصوص پوزیشن'' کے فوائد :۔

ریاست جموں و کشمیر کی ''مخصوص پوزیشن'' پر ہندوستانی فرقہ پرستوں، تنگ نظر قوم پرستوں اور بعض کانگریسی جن سنگھیوں کو سخت اعتراض ہے ان کا خیال ہے کہ اس مخصوص پوزیشن کی بناء پر اہل کشمیر کو غیر معمولی مراعات حاصل ہیں اور وہ عیش کر رہے ہیں ۔ پچھلے دِنوں چراغ بیگ اپنے حلقہ انتخاب کا دورہ کرنے کے لیے گیا تھا تو وہاں ایک بہت ہی معصوم ووٹر نے ایک معصوم سا سوال کیا۔ کہنے لگا۔ ''بیگ صاحب یہ مخصوص پوزیشن کیا ہوتی ہے اور یہ ہمیں عام ہندوستانیوں سے کس طرح ممتاز کرتی ہے؟''

چراغ بیگ نے اپنے ووٹر کو مطمئن کرنے کے لیے بڑی تابڑ توڑ قسم کی سیاسی اصطلاحیں استعمال کیں ۔ لیکن اس کی سمجھ میں خاک نہ آیا۔ بالآخر محفل میں بیٹھے ہوئے ایک اور دیہاتی نے ''مخصوص پوزیشن'' کی بڑی دلچسپ تعریف کی۔ جو اس قابل ہے کہ تحفہ درویش کے طور پر قارئین کی نذر کی جائے۔

پورے ملک بھر میں انتخابات آزادانہ، غیر جانبدارانہ اور ایماندارانہ ہوتے ہیں۔ ہماری ریاست کو چوں کہ مخصوص پوزیشن حاصل ہے۔ اس لیے یہاں ''گھپلا'' ہوتا ہے۔

پورے ملک کے لوگوں کو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ حکومت کے خلاف جلسے کریں۔ جلوس نکالیں اور ہر قسم کے احتجاجی طریقے استعمال کریں ۔اس کے باوجود ان کی حب الوطنی اور قوم پرستی پر شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ مخصوص پوزیشن کی بناء پر ریاست میں اس قسم کی تمام سرگرمیوں کو وطن دشمنانہ قرار دیا گیا ہے۔

☆

سرینگر کی لڑائی

(۱)

۹ جنوری ۱۹۷۱ء کو شیخ محمد عبداللہ، میرزا محمد افضل بیگ اور غلام محمد شاہ کے ریاست میں داخلہ پر پابندی اور پھر چار دن بعد محاذِ رائے شماری کو خلاف قانون قرار دینے کا اعلان، میرے لیے غیر متوقع نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ ریاستی حکومت آزادانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات کا ''صدمہ'' برداشت نہیں کرسکتی۔ اور اسی لیے انتخابات سے پہلے ایسے حالات پیدا کیے جائیں گے، کہ جن میں شیخ محمد عبداللہ اور محاذِ رائے شماری کے لیے انتخابات میں حصہ لینا ناممکن بنایا جائے۔ میرا اندازہ یہ تھا، کہ عوامی رائے دہندگی کے قانون میں ترمیم کر کے آئین کے ساتھ ساتھ امیدواروں کے لیے ہند کشمیر الحاق کے حتمی ہونے کا حلف اٹھانا بھی ضروری قرار دیا جائے گا۔ اور اس طرح محاذ کے لیڈروں اور کارکنوں کے لیے مشکلات پیدا کی جائیں گی۔ لیکن ریاستی حکومت کو اس بات کا احساس ہو چکا تھا، کہ محاذ رائے شماری نے ہر قیمت پر انتخابات لڑنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اور وہ کڑی سے کڑی شرط پوری کرنے کے لیے بھی آمادہ ہے۔ اس لیے ارباب حکومت پریشان تھے، کہ اس مصیبت سے کیوں کر چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ مسز گاندھی کے پارلیمنٹ

توڑ کر وسط مدتی انتخابات کے اعلان نے ان کے لیے فوری مشکلات پیدا کر دی تھیں۔ اور وہ یہ سوچ رہے تھے کہ اگر محاذ رائے شماری نے پارلیمانی انتخاب میں حصہ لیا، تو وادی کی تین پارلیمانی نشستوں میں سے کانگریس کے لیے ایک نشست حاصل کرنا بھی ممکن نہ ہوگا۔ اِدھر محاذ کے لیڈروں نے پارلیمانی انتخابات کی تیاریاں شروع کر کے حکومت کی پریشانیوں میں مزید اضافہ کر دیا۔ شیخ محمد عبداللہ اور ان کے ساتھیوں پر ریاست میں داخل ہونے پر پابندی کا فیصلہ اسی بدحواسی کا نتیجہ تھا، اور یہ فیصلہ اتنی جلدی میں کیا گیا، کہ ۸؍ جنوری کو جب شیخ صاحب دہلی سے ہوائی جہاز میں بیٹھ کر سرینگر آنے والے تھے۔ تو ایک فرضی خطرے کا ہوا کھڑا کر کے اس دن جہاز کی اڑان ہی منسوخ کر دی گئی۔ مقصد یہ تھا کہ انہیں ہر قیمت پر سرینگر آنے سے روک دیا جائے۔ میرزا محمد افضل بیگ کو اسی دن شام بٹوٹ کے قریب ریاست میں داخلے پر پابندی کا حکم سنایا گیا۔ اور اس طرح ریاستی حکومت نے مرکزی حکومت کے مشورے سے پارلیمانی انتخابات میں حکمران جماعت کی کامیابی کے لیے راستہ صاف کر دیا۔ اب اِس بات کا اندیشہ باقی رہ گیا تھا، کہ شیخ صاحب اور بیگ صاحب کی عدم موجودگی میں، محاذ کا کوئی دوسرا لیڈر، انتخاب لڑنے کے لیے تیار ہو جائے، تو اس خطرے کا یوں سدّ باب کیا گیا، کہ شیخ صاحب، بیگ صاحب اور شاہ صاحب کے داخلے پر پابندی کے ساتھ ہی محاذ کے تمام لیڈروں اور سرکردہ کارکنوں کو گرفتار کر کے چار دن بعد محاذ رائے شماری کو خلاف قانون قرار دیا گیا۔ شیخ صاحب اور ان

کے ساتھیوں کے خلاف ریاستی اور مرکزی حکومت کی اِس سازش کو ہندوستان کے تمام جمہوریت پسند اور باضمیر لوگوں نے جائز طور پر جمہوریت کا قتل قرار دیا۔ اور جن سنگھ جیسی فسطائی جماعت نے بھی اُسے ایک فسطائی حکم قرار دیتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا کہ اس کا واحد مقصد پارلیمانی انتخابات میں حکمران کانگریس کی بلا مقابلہ کامیابی کو یقینی بنانا ہے، اس طرح صادق صاحب کی نرم رو پالیسی کا محل انتخابات کا سایہ پڑتے ہی زمین بوس ہو گیا!

میں نے پارلیمانی انتخاب لڑنے کا اعلان شیخ صاحب اور محاذ پر پابندی عائد ہونے سے پہلے ہی کیا تھا۔ لیکن حکومت کے ان مجرمانہ اقدامات کے بعد کانگریس کا مقابلہ کرنے کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی۔ عام لوگوں میں اس کاروائی کے خلاف شدید ناراضگی کا جذبہ پایا جاتا تھا۔ اور وہ حکومت کے تئیں اپنی ناراضگی اور بیزاری کا اظہار کرنے کے لیے بے چین تھے، لیکن شیخ صاحب کے داخلے پر پابندی نے انہیں اتنا بے حوصلہ کر دیا تھا، کہ وہ اپنے فوری ردِ عمل کا اظہار بھی نہ کر سکے۔ انہیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ مرکزی حکومت اس ریاست میں ہر فراڈ اور بے ایمانی کو جائز سمجھتی ہے۔ اور اس نظام سے انصاف کی توقع رکھنا بے کار ہے، ریاستی حکومت نے ہر قسم کے احتجاج کو کچلنے کے لیے پولیس اور فوج کو تیار رہنے کا حکم دیا تھا۔ لیکن ارباب اقتدار کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ شہر اور دیہات میں کہیں کسی جگہ کوئی مظاہرہ نہیں ہوا، اور ریاستی حکومت کے لیڈروں نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ شیخ محمد عبداللہ بطور سیاسی قوت کے ختم ہو چکے ہیں۔ اور محاذ رائے شماری

کا کوئی وجود ہی نہیں، اُنہوں نے یقیناً مرکز میں اپنے آقاؤں کو بھی اس قسم کی اطلاعات بھیجی ہوں گی۔ حکومت کا اندازہ غلط تھا، اوراس نے لوگوں کی خاموشی اوران کے پُرامن رویے سے غلط معنی اخذ کرلیے تھے۔

ریاستی کانگریس کا مقابلہ کرنے کے لیے میں نے ضلع انت ناگ سے اپنی امیدواری کا اعلان کردیا تھا، اورکانگریس کی طرف سے مرکزی نائب وزیر محمد شفیع قریشی کو نامزد کیا گیا تھا۔ ۱۹۶۷ء کے عام انتخابات میں قریشی صاحب اُس وقت کے ڈپٹی کمشنر عبدالخالق کی مہربانی سے بلا مقابلہ کامیاب قرار پائے تھے۔ اور اب کی بار بھی انہیں یہی توقع تھی، کہ شیخ محمد عبداللہ اوران کے ساتھیوں پر پابندی کے بعد ان کا راستہ بالکل ہموار ہے، لیکن مجھے میدان میں دیکھ کرانہیں خاصی پریشانی ہوگئی۔ اپنی امیدواری کا اعلان کرنے کے بعد جب میں نے ضلع انت ناگ کا غیررسمی دورہ شروع کردیا، تو مجھے اپنی توقعات سے بھی زیادہ تعاون اور حمایت حاصل ہونے کا یقین ہوگیا، میں جہاں بھی گیا، میں نے قریشی صاحب کے خلاف ضلع انت ناگ کے لوگوں کو سخت بیزار پایا۔ ۱۹۶۷ء میں اپنی بلا مقابلہ کامیابی کے بعد اُنہوں نے اہلِ انت ناگ کو کبھی اپنی صورت نہیں دکھائی تھی۔ وہ جب بھی یہاں آتے، عبدالخالق ڈپٹی کمشنر کے پاس جاتے تھے، اور پھر وہیں سے نو دو گیارہ ہوجاتے، اب کی بار ضلع انت ناگ کے لوگوں نے انہیں مزا چکھانے کا فیصلہ کرلیا تھا اور میری امیدواری نے انہیں اپنی نفرت اور بیزاری کے اظہار کا ایک موقع عطا کیا تھا۔ سیاسی صورتِ حال کا جائزہ لے کر میں اِس نتیجے پر

پہنچا کہ کانگریس کے خلاف عام لوگوں میں سخت نفرت پائی جاتی ہے اور کانگریسی امیدوار کے خلاف کوئی بھی امیدوار کھڑا ہو جائے، اس کی کامیابی یقینی ہے، اس حقیقت کا احساس خود کانگریسی لیڈروں کو بھی تھا۔

پارلیمنٹ توڑنے سے صرف چند دن پہلے بخشی غلام محمد کو کانگریس پارلیمنٹری پارٹی میں داخل کر لیا گیا تھا۔ بخشی صاحب کی یہ عزت افزائی اس اتحادِ ثلاثہ کا پیش خیمہ تھی، کہ جو ہندنواز قوتوں کو متحد کرنے کے لیے شریمتی اندرا گاندھی کی ہدایت پر عمل میں آنے والا تھا۔ عام تاثر یہی تھا کہ کانگریس پارلیمنٹری پارٹی میں بخشی صاحب کی شمولیت کا فیصلہ وزیراعلا خواجہ غلام محمد صادق کی مرضی کے خلاف ہوا ہے۔ چند ہی دن بعد سرینگر کی پارلیمانی نشست کے لیے کانگریس کی طرف سے بخشی غلام محمد کو امیدوار نامزد کیا گیا، اور ڈرامے کے مختلف مناظر اپنے پسِ منظر کے ساتھ دکھائی دینے لگے۔ اب یہ شبہ یقین میں بدل گیا، کہ شیخ صاحب کے داخلے پر پابندی، محاذ کا خلاف قانون دیے جانے کا فیصلہ اور بخشی غلام محمد کی کانگریس پارلیمنٹری پارٹی میں شمولیت ایک ہی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ بخشی صاحب کو کانگریس میں شامل کرنے کا فیصلہ اتنی جلدی اور اتنی اونچی سطح پر ہوا تھا، کہ کانگریس کے نچلی سطح کے کارکنوں کو یہ ہضم کرنے میں بڑی مشکل محسوس ہوئی۔ ایک ماہ پہلے وہ بخشی صاحب کو بددیانتی، رشوت ستانی، کنبہ پروری اور اقربا نوازی کی سب سے بڑی علامت قرار دے رہے تھے اور اب وہی بخشی صاحب ان کے لیے سوشلزم، سیکولرزم اور جمہوریت کا سب سے روشن نشان

بن گئے تھے۔ مارکس وادی پیرغیاث الدین کے علاوہ سبھی کانگریسی لیڈروں اور کارکنوں کو اِس ناگوار سمجھوتے کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کرنے میں شرم محسوس ہورہی تھی۔ غیاث صاحب خوش تھے کہ بخشی صاحب کی ''واپسی'' کے بعد ان کا ستارہ ایک بار پھر چمکے گا۔ اب انہوں نے مارکس اور لینن کی کتابوں سے یہ ثابت کرنا شروع کر دیا کہ بخشی غلام محمد اس دور کا سب سے بڑا اشتراکی اور انقلابی رہنما ہے۔ بہرکیف، یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا، میں کہہ یہ رہا تھا کہ سرینگر کے پارلیمانی حلقے سے خود کانگریسی صفوں میں بھی انتشار پیدا ہوگیا۔ ادھر بخشی صاحب کو یہ زعم تھا کہ سرینگر سے ان کے مقابلے میں کوئی شخص انہیں ہرا نہیں سکتا۔ ان کے بعض حواری بڑے دعوے کے ساتھ کہتے، کہ سرینگر سے خود شیخ محمد عبداللہ بھی بخشی صاحب کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ اس خوش فہمی کی بنیاد سرینگر کے انتخابی حلقے میں مختلف سیاسی جماعتوں اور مذہبی فرقوں کی تقسیم اور تناسب تھا۔ بخشی صاحب کے خیال میں کشمیری پنڈتوں، مولانا فاروق کے حامیوں اور شیعوں کا ووٹ ان کے لیے بہرحال مخصوص ہے۔ اس کے علاوہ اپنے دورِ اقتدار میں انہوں نے اتنے لوگوں پر اپنی عنایات کی بارش کی ہے کہ ہزاروں لوگ آنکھیں بند کرکے انہیں ووٹ دیں گے، چاہے وہ کسی بھی سیاسی جماعت سے تعلق رکھتے ہوں۔ ۱۹۶۷ء میں کانگریسی امیدوار علی محمد طارق کے خلاف ان کی کامیابی نے ان کی اور ان کے چاہنے والوں کی خوش فہمی میں اور اضافہ کر دیا تھا۔

دہلی میں شیخ صاحب سے ایک ملاقات کے دوران مجھے اِس بات کا اندازہ ہوگیا تھا، کہ پارلیمانی انتخابات میں حصہ لینے کے حق سے محروم ہونے کے باوجود انہیں اس بات سے گہری دلچسپی ہے، کہ عام لوگ انتخابات میں حصہ لے کر حکمران جماعت کا مقابلہ کریں۔ وہ اِس بات سے مطمئن تھے، کہ میں اننت ناگ سے محمد شفیع قریشی کے خلاف لڑ رہا تھا، لیکن سرینگر سے بخشی غلام محمد کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی موزوں امیدوار نہیں تھا۔ میں نے دلی سے واپسی پر مولانا محمد سعید مسعودی سے گزارش کی، کہ وہ بخشی صاحب کے مقابلے میں کھڑے ہو جائیں۔ لیکن مولانا بڑی منت سماجت کے بعد بھی تیار نہ ہوئے۔ خواجہ غلام محی الدین قرہ صاحب نے بھی انکار کر دیا۔ دونوں بزرگوں نے کہا کہ ہم نے عہد کیا ہے کہ ہم کسی الیکشن کے لیے کھڑے نہ ہوں گے۔ مولانا نے کہا کہ میری عمر اور میری صحت دونوں ہی اِس بات کی اجازت نہیں دیتیں، کہ میں الیکشن کے لیے کھڑا ہو جاؤں۔ مولانا اور قرہ صاحب کے انکار کے بعد ایسا لگ رہا تھا کہ بخشی غلام محمد عملاً بلا مقابلہ کامیاب ہو جائیں گے۔ اس دوران میں جماعت اسلامی کے سیف الدین قاری، غلام احمد بخشی، غلام احمد میر اور پشکر ناتھ وکیل نے بھی سرینگر سے کاغذات نامزدگی داخل کر دیے۔ سیف الدین قاری جیل میں تھے اور بخشی صاحب سے ان کا مقابلہ محض ایک علامتی مقابلہ تھا۔

غلام احمد بخشی اور غلام احمد میر دونوں کے متعلق یہ مشہور تھا کہ اُنہوں نے بخشی صاحب کی شہ پر ہی کاغذات نامزدگی داخل کر لیے تھے، تا کہ وہ ان

کاغذی پہلوانوں سے لڑکر اپنی پہلوانی کا ثبوت دیں۔ بعد کے واقعات نے اس شبہ کو یقین میں بدل دیا۔ پشکر ناتھ کول کا پیشہ ہی ''امیدواری'' ہے۔ وہ سالہاسال سے انتخابات میں بطورِ امیدوار کے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہر بار اپنی ضمانت ضبط کرا کے دوسرے انتخابات کے لیے زرضمانت جمع کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ سُنا ہے، اب کی بار انہیں تجویز کنندہ بھی نہیں ملا۔ اور چارو ناچار ان کی بیوی کو یہ خدمت انجام دینا پڑی۔ سرینگر کے عام لوگوں کو اِس بات کا سخت دکھ تھا کہ کشمیر میں ظلم وتشدد اور سخت گیر پالیسی کا سب سے بڑا نمائندہ۔ بخشی غلام محمد بغیر کسی مقابلے اور مزاحمت کے اپنے مقصد میں کامیاب ہو رہا تھا۔ اور بہت سے نوجوانوں نے مجھے اننت ناگ سے دستبردار ہو کر سرینگر سے انتخاب لڑنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی، لیکن وقت کم تھا اور مجھے اس بات کا اندیشہ تھا کہ بخشی صاحب کے مقابلے میں جس تنظیم اور جن ذرائع کی ضرورت تھی وہ میرے پاس نہ تھے۔ اور پھر اننت ناگ کے لوگوں کو کانگریسی استبداد سے نجات دلانے کے لیے، میں نے وہاں کے نوجوانوں سے جو وعدہ کیا تھا، میں اس پر ہر حالت میں قائم رہنا چاہتا تھا۔

۸ فروری کو کاغذات نامزدگی داخل کرنے کی آخری تاریخ تھی، ۷ فروری کی شام تک سیف الدین قاری کے علاوہ کسی قابلِ ذکر شخصیت نے بخشی صاحب کا مقابلہ کرنے کے لیے کاغذات نامزدگی داخل نہیں کیے۔ قاری صاحب کے متعلق یہ افواہ پہلے سے ہی گشت کر رہی تھی، کہ اُن کے

کاغذات نامزدگی کسی معمولی، سقم کی بناء پر نامنظور کیے جائیں گے اور اس طرح بخشی صاحب کا ماسٹر پلان بڑی خوبصورتی کے ساتھ مکمل ہوگا۔ میں ہر صبح چار بجے اٹھ کر لکھنے پڑھنے کا کام کرتا ہوں۔ ۸/فروری کی صبح کو ٹھیک چار بجے میری آنکھ کھلی، تو میں نے بجلی کا سوئچ آن کیا دیکھا تو بجلی ندارد۔ عادت کے مطابق آنکھ کُھل گئی تو اب نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں انتخابات ہی کے مسئلے پر سوچنے لگا۔ سوچتے سوچتے دفعتاً میرے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا، کچھ دیر بعد اس خیال نے فیصلے کی صورت اختیار کر لی۔ اور میں نے اپنی بیوی کو جگا کر اپنے اس فیصلے سے آگاہ کیا۔ وہ میرے اس ''خطرناک'' فیصلے پر حیران ہوگئی اور کچھ دیر کے لیے اسے محض ایک مذاق سمجھتی رہی۔ لیکن جلد ہی اسے اس بات کا یقین ہو گیا، کہ میں نے سنجیدگی سے بخشی صاحب کا مقابلہ کرنے کا عزم کیا ہے۔ اپنے اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے میں اب میرے سامنے ایک ہی الجھن تھی اور وہ یہ کہ میں اپنے بہترین دوست میر نصر اللہ کا کیوں کر سامنا کروں۔ نصر اللہ، بخشی صاحب کے داماد ہیں۔ لیکن ان کے داماد ہونے سے پہلے میرے استاد اور میرے دوست تھے۔ بخشی صاحب سے میرے ہزار جھگڑوں کے باوجود میری اور ان کی دوستی قائم تھی۔ اور میں بطور استاد کے ان کی بڑی عزت اور بہ حیثیت دوست کے ان سے بڑی محبت کرتا ہوں۔ انہیں میرے اِس ناگوار فیصلے کا بڑا دکھ ہوگا۔ اس کا مجھے احساس تھا۔ وہ مجھے اپنے اس عزم سے باز رکھنے کی بڑی کوشش کریں گے۔ اس کا بھی مجھے اندازہ تھا، لیکن اس کے باوجود میرا ارادہ اٹل تھا۔ میں نصر سے اپنی

دوستی کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔لیکن اس دوستی کو اپنے سیاسی کردار پر اثر انداز ہونے کی اجازت دینا مجھے گوارا نہ تھا۔

صبح ہوتے ہی میں نے اپنے بعض بہت قریبی دوستوں کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا، اور ان کے ردِعمل سے میری بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔ گیارہ بجے جب میں ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں کاغذات نامزدگی داخل کرنے کے لیے گیا تو ڈپٹی کمشنر آغا افتخار احمد کے لیے بھی یہ یقین کرنا مشکل ہوگیا، کہ میں واقعی سنجیدہ ہوں۔ اُنہوں نے ''نہایت قیمتی'' مشورے دے کر مجھے اس خطرناک کام سے باز رکھنے کی کوشش کی اور میں نے انہیں یہ کہہ کر ٹال دیا، کہ میں سرینگر سے احتیاطاً کاغذات نامزدگی داخل کر رہا ہوں۔ دراصل میں اننت ناگ سے ہی لڑ رہا ہوں۔ سرینگر سے میرے کاغذاتِ نامزدگی داخل کرنے کی خبر آگ کی طرح پھیل گئی اور مختلف سیاسی حلقوں نے اس کی مختلف تعبیریں کرنا شروع کر دیں۔

☆

(۲)

میرے کاغذات نامزدگی داخل کرنے کی دیر تھی، کہ ریاستی کانگریس کے اندرونی تضادات ابھرنا شروع ہو گئے۔ بخشی غلام محمد کو اس بات کا احساس تھا، کہ اسے غلام محمد صادق اور کسی حد تک سید میر قاسم، دونوں ہی کی مرضی کے خلاف کانگریس پر مسلط کر دیا گیا ہے۔ اس لیے اسے مقامی کانگریس سے کسی امداد کی توقع نہیں تھی۔ یکم فروری کو بخشی صاحب اور میں نے دہلی سے سرینگر تک ہوائی جہاز میں ایک ساتھ سفر کیا تھا اور دوران گفتگو انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ انہیں کانگریسی کارکنوں پر کوئی بھروسہ نہیں اور وہ بذات خود اپنی انتخابی مہم کے انچارج ہوں گے۔ انہیں خاص طور پر صادق صاحب اور ان کے وفادار کارکنوں سے یہ شکایت تھی کہ وہ ان کی انتخابی مہم میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے۔ نائب وزیر نور محمد اور عبدالعزیز (ٹورسٹ) جو صادق گروپ سے تعلق رکھتے تھے، کے متعلق انہیں یہ اندیشہ لاحق تھا، کہ وہ ان کی کامیابی کے بجائے ان کی ناکامی کے لیے کام کر رہے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ بخشی صاحب کے ان اندیشوں اور وسوسوں کی کوئی بنیاد تھی یا نہیں، لیکن مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میں نے اپنی انتخابی حکمت عملی مرتب کرتے وقت ان تضادات سے بھرپور فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی اور خوش

قسمتی سے بخشی صاحب نے غیر شعوری طور پر اس میں میری مدد کی۔ کاغذات نامزدگی کی جانچ پڑتال تک تو اکثر لوگ، جن میں خود بخشی صاحب بھی شامل ہیں، میری اُمیدواری کو زیادہ اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کے خیال میں، یہ محض ایک پبلسٹی سٹنٹ تھا اور نام واپس لینے کی تاریخ تک سبھی لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا رہے، لیکن جب نام واپس لینے کی تاریخ بھی گزر گئی تو افواہوں اور قیاس آرائیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ بخشی صاحب نے اپنے کارکنوں کی ایک میٹنگ میں یہ انکشاف کیا کہ ''یہ دراصل غلام محمد صادق کی کارستانی ہے۔'' اور انھوں نے ہی مجھے مقابلے میں کھڑا کر دیا ہے۔ پیر غیاث الدین نے مجھے ٹیلی فون پر یہ اطلاع دی ہے کہ مجھے دراصل سید میر قاسم کی حمایت حاصل ہے اور انہی کے کہنے پر میں نے محمد شفیع قریشی کی بجائے اب بخشی صاحب کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی ہے۔ ایک افواہ یہ بھی اڑی کہ مجھے محمد شفیع قریشی نے بھاری رقم دے کر بخشی کے مقابلے میں کھڑا کر دیا ہے۔ تاکہ میں اننت ناگ سے دستبردار ہو کر ان کی راہ سے ہٹ جاؤں۔

میں نے جان بوجھ کر ان افواہوں اور قیاس آرائیوں کی تردید یا تائید نہیں کی اور میں خاموشی کے ساتھ سیاسی صورتِ حال کا مطالعہ کرتا رہا۔ انگریزی اخبارات میں جب یہ قیاس آرائیاں، باقاعدہ خبروں کے طور پر شائع ہوئیں تو کانگریسی حلقوں میں سخت انتشار پیدا ہوگیا۔ بالآخر غلام محمد صادق اور سید میر قاسم دونوں ہی کو اس بات کی باقاعدہ تردید کرنا پڑی کہ مجھے براہ راست یا بالواسطہ اُن کی حمایت حاصل ہے۔ ان تردیدی بیانات سے بخشی صاحب کا

شبہ دور ہوا یا نہیں، میں نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اکثر کانگریسی کارکن اس شبہ میں پڑ گئے کہ بخشی صاحب کو ان کے لیڈروں کی حمایت حاصل ہے بھی یا نہیں؟ کیوں کہ سیاسی لغت میں عام طور پر تردید کو تصدیق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان تمام مشکلات کے باوجود بخشی صاحب کو یہ زعم تھا، کہ وہ اپنی طاقت اور ''مقبولیت'' کے سہارے یہ لڑائی جیت لیں گے اور وہ اپنی کامیابی کے بارے میں اتنے مطمئن تھے کہ سرینگر میں اپنی انتخابی مہم پر توجہ دینے کی بجائے رائے بریلی پہنچ گئے اور کئی دن تک وہاں مسز گاندھی کے لیے کام کرتے رہے۔

کاغذات نامزدگی کی جانچ پڑتال کے روز بخشی صاحب کی طرف سے جماعت اسلامی کے اُمیدوار سیف الدین قاری صاحب کے کاغذاتِ نامزدگی پر کئی اعتراضات کیے گئے۔ قاری صاحب کے وکیل مسٹر روگھناتھ ویشنوی کے اپنے کاغذاتِ نامزدگی ۱۹۶۷ء میں اس لیے رد کر دیے گئے تھے کہ انہوں نے حلف نہیں اُٹھایا تھا (حالاں کہ وہ آج بھی قسمیں کھاتے ہیں، کہ انہوں نے باضابطہ اور باقاعدہ طور پر حلف اُٹھایا تھا، دراصل ریٹرننگ آفسر نے ان کا حلف نامہ اڑا دیا تھا) اس لیے انہوں نے اپنے موکل سے حلف اٹھوانے میں غیر معمولی احتیاط سے کام لیا تھا، لیکن بخشی صاحب کا اعتراض یہ تھا کہ قاری صاحب نے کاغذات نامزدگی داخل کرنے سے پہلے، بلکہ نامزد ہونے سے پہلے ہی حلف اُٹھا لیا ہے۔ جو قانونی اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔ ویشنوی صاحب نے بڑی بحث کی، بڑی حجت کی، لیکن ریٹرننگ آفسر

صاحب مطمئن نہ ہوئے اور انہوں نے فیصلہ دوسرے دن پر ملتوی کیا۔ دوسرے دن میں نے بھی قاری صاحب کی جانب سے بحث کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ کاغذات نامزدگی میں قطعاً کوئی نقص نہیں ہے۔ لیکن ریٹرننگ آفیسر نے سپریم کورٹ کی ایک رولنگ کا حوالہ دے کر قاری صاحب کے کاغذات نامزدگی رد کر دیے۔ بخشی صاحب اور ان کے وکلاء اپنی اس کامیابی پر بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ ان کے خیال میں ان کی راہ کا ایک کانٹا ہٹ گیا تھا۔

چند دن بعد میں شیخ صاحب سے صلاح مشورہ کرنے کے لیے دہلی روانہ ہو گیا اور میں نے انہیں یہاں کی سیاسی صورت حال سے آگاہ کیا۔ جے پرکاش نرائن اور ان کے ساتھیوں کی یہ زبردست خواہش تھی کہ کشمیر میں جمہوریت کو بحال کرنے کی جدوجہد جاری رکھنے کے لیے پارلیمانی انتخابات میں حکمران جماعت کا مقابلہ، بہرحال ہونا چاہیے۔ بلکہ اس مقصد کے لیے سرودیہ لیڈروں کی ایک ٹیم کچھ دن پہلے سرینگر بھی آئی تھی اور اس ٹیم نے مولانا مسعودی، قرہ صاحب اور دوسرے کئی لوگوں کو انتخابات میں حصہ لینے پر آمادہ کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ پہلی بار انہی لوگوں نے مجھے سرینگر سے لڑنے کا مشورہ بھی دیا تھا۔ لیکن اس وقت میں نے اسے ''ناقابل عمل'' قرار دے کر نظر انداز کر دیا تھا۔ اب حالات بدل چکے تھے اور میں بیک وقت اننت ناگ اور سرینگر سے مقابلے پر آمادہ تھا۔ شیخ صاحب نے میرے دلی پہنچنے کے فوراً بعد جے پرکاش نرائن کے کچھ ساتھیوں کو بلا کر انہیں تازہ ترین

صورت حال سے آگاہ کیا۔ مسٹر جے، جے سنگھ، اور مسٹر سین کا خیال تھا کہ جے پرکاش نرائن سے مشورہ کیا جانا چاہیے اس لیے دوسرے دن علی الصبح جے پی کے سیکریٹری مسٹر سین، پٹنہ کے لیے روانہ ہو گئے اور دو دن بعد جب سین پٹنہ سے آئے تو انہوں نے بتایا، کہ جے پی نے میرے اننت ناگ اور سرینگر سے بیک وقت لڑنے کے فیصلے کا خیر مقدم کیا ہے اور وہ ہر ممکن اخلاقی امداد دینے کے لیے تیار ہیں۔ انہوں نے کشمیر میں انتخابات کی دیکھ بھال کرنے والی کمیٹی کا چیرمین بننے پر بھی آمادگی ظاہر کی تھی۔ اب سوال یہ تھا، کہ شیخ صاحب کی حمایت بالواسطہ طور پر ہو یا براہ راست؟ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ شیخ صاحب بالواسطہ طور پر مدد کریں، کیوں کہ ان کے کھل کر مدد کرنے سے بڑی مشکلات پیدا ہوں گی۔ خود شیخ صاحب کی رائے یہ تھی کہ ان کی حمایت براہ راست اور غیر مشروط ہونی چاہیے تا کہ دشمن کو غلط فہمیاں پیدا کرنے کا موقع نہ ملے۔ بعد کے واقعات نے شیخ صاحب کا فیصلہ صحیح ثابت کر دیا اور مادر مہربان بیگم شیخ محمد عبداللہ کی موجودگی نے بخشی صاحب کی ہر چال کو ناکام بنا دیا۔ دلی سے واپسی پر میں نے اپنے ساتھیوں کو یہ تو بتا دیا کہ شیخ صاحب نے اننت ناگ اور سرینگر کے انتخابی معرکے میں میری مکمل، بھرپور اور غیر مشروط طور پر حمایت کا فیصلہ کیا ہے۔ لیکن حمایت کا ذریعہ اور طریقہ کیا ہو گا؟ اس سلسلے میں، میں نے کچھ نہ کہنا ہی مناسب سمجھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ اگر مرکزی اور ریاستی حکومتوں کو بیگم صاحب کی متوقع آمد کا علم ہو جائے، تو وہ ان کے داخلے پر بھی پابندی عائد کر سکتی ہیں۔ کیوں کہ کشمیر کے معاملے

میں مرکزی حکومت ہر ناجائز کاروائی کو بھی جائز سمجھتی ہے۔ سرینگر میں بظاہر کوئی انتخابی سرگرمی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ میں زیادہ تر اننت ناگ پر اپنی توجہ مرکوز کیے ہوئے تھا اور جوں جوں وہاں میری سرگرمیاں بڑھتی جارہی تھیں۔ حکمران جماعت کی بدحواسی میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ محمد شفیع قریشی جو ۱۹۶۷ء میں ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ہی ممبر پارلیمنٹ بن گئے تھے۔ ضلع اننت ناگ کے ایسے ایسے دور افتادہ دیہات کا دورہ کر رہے تھے کہ جہاں اس سے پہلے کسی حاکم کے قدم نہ پڑے تھے۔ ضلع کے سبھی کانگریسی ممبران اسمبلی (جو ۱۹۶۷ء میں سب کے سب بلا مقابلہ کامیاب قرار دیے گئے تھے) کو پردیش کانگریس کے صدر سید میر قاسم نے یہ وارننگ دی تھی، کہ جس ممبر اسمبلی کے حلقہ انتخاب سے محمد شفیع قریشی ہار جائیں، اس ممبر اسمبلی کو ۱۹۷۲ء کے عام انتخابات میں کانگریس کا ٹکٹ نہیں دیا جائے گا۔ اس لیے وہ رات دن ایک کر کے قریشی صاحب کو کامیاب بنانے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ لیکن اس تمام جدوجہد اور محنت کے بعد بھی ہر کانگریسی ممبر اسمبلی اور خود محمد شفیع قریشی کو اس بات کا یقین تھا کہ اگر انتخابات غیر جانبداری کے ماحول میں منعقد ہوئے تو قریشی صاحب کی ضمانت ضبط ہو جائے گی۔ اسی لیے ان کی انتخابی مہم کے انچارج مفتی محمد سعید یہ کہہ کر اپنے کارکنوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے کہ ووٹ چاہے مخالف اُمیدوار ہی کو ملیں، کامیاب محمد شفیع قریشی ہی ہوں گے۔ کانگریسی ممبران اسمبلی کو "ووٹ چوری" پر بے پناہ اعتماد اور سرکاری افسروں کی بے ایمانی پر غیر متزلزل اعتقاد ہے اور ۶ مارچ کو ان کا اعتماد

اور اعتقاد صحیح ثابت ہو گیا۔ سرینگر میں بخشی صاحب کو پبلک جلسہ کرنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ اس لیے وہ مختلف محلوّں میں جا کر بارسوخ آدمیوں سے رابطہ قائم کرنے میں مصروف تھے۔ ان کی طرف سے بخشی عبدالرشید، غلام قادر خان، محمد شعبان گاڈہ، ڈاکٹر جگت موہنی، ان کے شوہر نامدار ڈاکٹر اونکار ناتھ اور پیر غیاث الدین بھی سرگرم تھے۔ بخشی عبدالرشید ۱۹۶۳ء میں سانحۂ موئے مقدس کے بعد پہلی بار لال چوک میں دکھائی دینے لگے۔ کانگریسی کارکن اور لیڈر دونوں ہی خاموش اور کسی قدر بے تعلقی سے حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔ میرے بعض اخباری بیانات اور تقریروں سے یہ تاثر پیدا ہو گیا تھا کہ بخشی صاحب کے مقابلے میں مجھے شیخ صاحب اور بیگ صاحب دونوں کی حمایت حاصل ہو گی اور اس سے مخالف کیمپ میں بڑی بے چینی پیدا ہو گئی تھی۔ بخشی صاحب کو اس بات کا احساس اور اندازہ تھا کہ اگر شیخ صاحب نے بالواسطہ بھی میری حمایت کی، تو ان کی ضمانت خطرے میں پڑ جائے گی۔ اس لیے وہ ہر قیمت پر یہ تاثر زائل کرنا چاہتے تھے کہ مجھے شیخ صاحب یا بیگ صاحب کی حمایت حاصل ہے بعض مقامی اخبارات نے محاذ رائے شماری کے قریبی حلقوں کے حوالے سے ایسی خبریں شائع کرنا شروع کر دیں کہ جن کا مقصد عام لوگوں میں ذہنی انتشار پیدا کر کے انہیں انتخابات کا بائیکاٹ کرنے کی ترغیب دینا تھا، ایک مقامی روزنامے کے ایڈیٹر نے دہلی میں بیگ صاحب سے ایک خصوصی انٹرویو کے حوالے سے یہ خبر شائع کر دی کہ آئندہ پارلیمانی انتخاب میں کسی اُمیدوار کو ان کی حمایت

حاصل نہیں ہوگی......کسی اُمیدوار کا مطلب مجھ سے تھا اور مجھے بیگ صاحب کے اس بیان پر قدرے حیرت ہوئی ۔ چند دن بعد جب میں نے بیگ صاحب سے اس بارے میں دریافت کیا، تو وہ بھی حیران ہوئے اور انہوں نے یہ انکشاف فرمایا کہ ''ایڈیٹر صاحب مجھ سے ملے ہی نہیں۔ اس لیے خصوصی انٹرویو کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' عین اُس دن جب دہلی میں یہ بات طے ہوگئی، کہ سرینگر اور اننت ناگ دونوں انتخابی حلقوں میں مجھے شیخ صاحب کی حمایت حاصل ہوگی۔ انگریزی اخبار ''سٹیٹمین'' میں شیخ صاحب کے قریبی حلقوں کے حوالے سے یہ خبر شائع ہوگئی کہ شیخ صاحب نے کسی اُمیدوار کی حمایت کرنے کی خبروں کی تردید کی ہے۔ یہ سب کچھ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہو رہا تھا۔ اور بخشی صاحب کے نمک خوار صحافی اپنا حق نمک ادا کرنے کے لیے بے دردی کے ساتھ صحافت اور دیانت کا خون کر رہے تھے۔ محاذ کی مقامی لیڈرشپ کو ابھی شیخ صاحب اور بیگ صاحب کے فیصلے کا علم نہیں تھا۔ اس لیے وہ عام طور پر Confused تھے۔ لیکن جوں ہی انہیں اس فیصلے کی اطلاع مل گئی، پورا محاذ حرکت میں آ گیا اور معدودے چند افراد کے سوا ہر کارکن نے اپنے لیڈروں کے فیصلے پر آمنا وصدقنا کہہ کر ان کے حکم کی تعمیل کی۔ محاذ رائے شماری کے تمام سرکردہ لیڈر اور سینکڑوں کارکن ۸ جنوری کو ہی نظر بند کیے گئے تھے اور جو لوگ باہر تھے، انہیں ہر لمحہ گرفتاری کا اندیشہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود محاذ کے کارکنوں نے جس ضبط و نظم، ایثار اور حوصلے سے میری انتخابی مہم کے دوران کام کیا اس سے یہ اندازہ

ہو جاتا ہے، کہ اگر محاذ رائے شماری کو انتخابات لڑنے کی اجازت دی جاتی، تو حکمران جماعت کے لیے ایک نشست حاصل کرنا بھی ممکن نہ تھا۔

۲۰ فروری کو شیخ صاحب نے علی الصبّح مجھے دہلی سے فون کیا کہ میں ہوائی اڈے پر پہنچ جاؤں۔ یہ دن میری انتخابی مہم ہی نہیں، کشمیر کی سیاست اور تاریخ کا ایک اہم دن ثابت ہو گیا۔ اُس دن بیگم شیخ محمد عبداللہ جنہیں کشمیر کے عوام مادر مہربان کے محترم نام سے یاد کرتے ہیں، میری انتخابی مہم کا افتتاح کرنے کے لیے سرینگر تشریف لا رہی تھیں۔ بیگم صاحبہ عملی سیاست میں حصہ نہیں لیتیں اور ۱۹۴۶ء میں شیخ صاحب اور ان کے دوسرے ساتھیوں کی گرفتاری کے بعد پہلی بار انہوں نے ایک محدود پیمانے پر پبلک لائف میں حصہ لیا تھا۔ آج ۲۴ برس بعد وہ ایک بار پھر کشمیر کے سیاسی مطلع پر نمودار ہو رہی تھیں اور میں اپنی خوش بختی پر ناز کر رہا تھا کہ وہ میری انتخابی مہم کا افتتاح کرنے کے لیے تشریف لا رہی تھیں۔ بیگم صاحبہ جب سرینگر کے ہوائی اڈے پر اُتریں، تو میں نے ان کے باوقار چہرے پر آہنی عزم اور ان کی آنکھوں میں گہرے اعتماد کی ایک ایسی جھلک دیکھی کہ جو میں نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی! بیگم صاحبہ کی آمد کا میرے علاوہ شہر میں کسی کو علم نہ تھا ۔لیکن صورہ میں اپنی قیام گاہ تک پہنچنے سے پہلے ہی سارے شہر میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ وہ ایک اہم سیاسی مشن پر تشریف لائی ہیں اور شہر کے لوگ جوق در جوق ان سے ملنے کے لیے جانے لگے۔ شام کو کچھ مقامی صحافیوں نے بھی ان سے ملاقات کی اور ان کے غیر متوقع طور سرینگر وارد

ہونے کے متعلق ان سے سوالات پوچھے۔ بیگم صاحبہ نے نہایت محتاط اور مختصر جوابات کے ذریعے صحافیوں کو بتایا، کہ وہ بخشی غلام محمد کو ریاست کے عوام پر دوبارہ مسلط کرنے کی کوششوں کا مقابلہ کرنے کے لیے آئی ہیں۔ اسی شام یہ فیصلہ ہوا کہ بیگم صاحبہ دوسرے دن یعنی ۲۱ر فروری کو خانیار میونسپل پارک میں میری انتخابی مہم کا افتتاح کریں گی۔ بڑی جلدی میں اشتہارات چھاپے گئے اور اخبارات میں اعلان کر دیا گیا۔ لیکن باقاعدہ اعلان اور اشتہارات کے باوجود کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ بیگم صاحبہ واقعی سرینگر انتخابی مہم کا افتتاح کریں گی۔ بہت سے لوگ اس وقت تک شک وشبہ میں مبتلا رہے، کہ جب تک بیگم صاحبہ نے خانیار کے جلسۂ عام میں یہ اعلان کیا کہ میں اپنا ووٹ شمیم احمد شمیم کے حق میں استعمال کروں گی۔

☆

(۳)

۲۱ فروری کا دن میری انتخابی مہم کا سب سے اہم دن ثابت ہوا۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ میرے بہت ہی قریبی دوستوں کے علاوہ کسی کو اِس بات کا یقین نہیں آرہا تھا، کہ بیگم شیخ محمد عبداللہ خانیار کے جلسۂ عام میں، میری حمایت کا اعلان کرنے والی ہیں۔ اکثر لوگ اسے محض ایک مذاق یا زیادہ سے زیادہ ایک پبلسٹی سٹنٹ خیال کرتے تھے۔ روزنامہ ''آفتاب'' نے اپنی ۲۱ فروری کی اشاعت میں نہایت محتاط طریقے سے اس خبر کو یوں شائع کیا۔

''اس بات کا قوی امکان ہے، کہ آج خانیار میں پارلیمنٹ کے لیے ضلع سرینگر سے آزاد امیدوار شمیم احمد شمیم کا جو انتخابی جلسہ منعقد ہو رہا ہے، اس جلسے سے غالباً بیگم شیخ محمد عبداللہ بھی خطاب کریں گی، لیکن اس بارے میں ابھی تک کسی باوثوق ذریعہ سے کوئی اطلاع نہیں ملی، تاہم اِس سلسلے میں باہمی مشورہ ہو رہا ہے۔''

خانیار کے جلسۂ عام میں بہت سے لوگ اس لیے شریک نہ ہوئے کہ وہ بیگم صاحبہ کے نام کو حاضرین جمع کرنے کی ایک چال سمجھتے تھے۔ دن کے چار بجے تک موسم بہت خوشگوار تھا۔ جلسہ شروع ہونے سے صرف کچھ دیر پہلے بوندا باندی شروع ہوگئی اور دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش برسنے

لگی۔ بہت سے لوگ اسی کشمکش میں تھے کہ بھاگ جائیں یا کچھ دیر اور انتظار کریں، کہ میں بیگم صاحبہ کے ساتھ جلسہ گاہ میں نمودار ہوا۔ بیگم صاحبہ کے اسٹیج پر تشریف لاتے ہی جلسہ گاہ کی فضا بدل گئی۔ بھاگنے والے لوٹ آئے، جو ابھی تک دور تماشا دیکھ رہے تھے، وہ جلسہ گاہ پر ٹوٹ پڑے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں لوگ جمع ہو گئے۔ پانی اب بھی بڑے زوروں سے برس رہا تھا۔ لیکن اب کسی کو اس کی پروانہ تھی۔ بیگم صاحبہ کو اسٹیج پر دیکھ کر لوگوں پر دیوانگی سی طاری ہو گئی تھی اور فضا شیر کشمیر زندہ باد، اور مادر مہربان زندہ باد کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے دیوانہ وار اسٹیج کے قریب آنے کی کوشش کر رہے تھے اور اس کشمکش میں جلسہ کی کاروائی شروع کرنے میں تاخیر ہو رہی تھی۔ بالآخر بیگم صاحبہ نے اپنی تقریر شروع کر کے کشمیر کی سیاسی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ بیگم صاحبہ نے کہا کہ "اس افواہ میں کوئی صداقت نہیں ہے، کہ شیخ صاحب اور بیگ صاحب انتخابات کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں رکھتے، بلکہ انہیں انتخابات سے دلچسپی رکھنے کی بناء پر ہی ریاست بدر کر دیا گیا ہے۔ مجھے خود بھی انتخابات سے گہری دلچسپی ہے، اور میں آپ کو شیخ صاحب اور بیگ صاحب کا یہ پیغام دینے کے لیے آئی ہوں۔ کہ آپ اس انتخاب میں اپنا ووٹ شمیم احمد شمیم کو دیدیں۔ میں بھی اپنا ووٹ شمیم صاحب کے حق میں استعمال کروں گی اور آپ سب کو میرا یہی مشورہ ہے، کہ آپ بھی انہی کو اپنا ووٹ دیدیں۔ بخشی غلام محمد ظلم و تشدد اور ناانصافی کی علامت ہے، اور آپ کو اسے ناکام بنانے کے لیے

متحد اور متفق ہو کر لڑنا چاہیے"۔ مائیکروفون کی خرابی کی وجہ سے دور بیٹھے ہوئے لوگ بیگم صاحبہ کی پوری تقریر نہ سُن سکے، لیکن یہ فقرہ سب لوگوں نے سُن لیا، کہ میں اپنا ووٹ شمیم احمد شمیم کے حق میں استعمال کروں گی"۔ اور اسی ایک فقرے نے سرینگر کی انتخابی نشست کا فیصلہ کر دیا۔ ہمیں صبح ہی اس بات کی اطلاع ملی تھی، کہ بخشی غلام محمد کے کچھ زرخرید جلسے میں ناپسندیدہ نعرے بلند کر کے گڑبڑ کرنے کی کوشش کریں گے، اس لیے ہم نے ان سے نپٹنے کے لیے مناسب احتیاطی اقدامات کیے تھے۔ کچھ نوجوانوں نے الحاق اور رائے شماری کے متعلق میرا نقطۂ نظر جاننے کے لیے سوالات کرنے کی کوشش کی، لیکن شیر کشمیر زندہ باد، مادر مہربان زندہ باد اور یہ ملک ہمارا ہے، اس کا فیصلہ ہم کریں گے کے فلک شگاف نعروں میں ان کی آواز دب کر رہ گئی۔ یہ وہی نوجوان تھے کہ جو کچھ دن بعد سڑکوں پر خالد کشمیر زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے دیکھے گئے۔ بیگم صاحبہ کے بعد میں نے ایک مختصر سی تقریر میں حاضرین کو یہ بتایا، کہ میں کشمیری عوام کے احتجاج اور ان کی بغاوت کی علامت ہوں۔ اور اگر سرینگر کے عوام ظلم تشدد اور آمریت کے خلاف اپنی نفرت، بیزاری اور احتجاج کا اظہار کرنا چاہتے ہیں تو انہیں اپنا ووٹ مجھے دینا چاہیے"۔ انتخابی حکمت عملی کے نقطۂ نظر سے یہ جلسہ غیر معمولی طور کامیاب رہا، اور اس نے پورے شہر کی فضا بدل دی، شیخ صاحب کی جلاوطنی اور محاذ رائے شماری پر پابندی سے عام لوگوں کو انتخابات کے نام سے کچھ چڑ سی ہو گئی تھی اور اکثر لوگوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنے ووٹ کا استعمال

نہیں کریں گے۔

بیگم صاحبہ کی اس تقریر نے صرف سرینگر میں ہی نہیں، وادی بھر میں ایک نئی بیداری پیدا کردی اور ہر جگہ لوگوں نے انتخابات میں حصہ لے کر حکمرانوں کی عیاری کا مقابلہ کرنے کا عہد کرلیا۔ حکمران جماعت کے لیے یہ صورت حال بہت پریشان کُن تھی اور بخشی غلام محمد دوسرے ہی دن مسز اندرا گاندھی کو اپنے حال پر چھوڑ کر سرینگر لوٹ آئے۔

بیگم صاحبہ کے سرینگر تشریف لانے سے پہلے ہی کچھ سرکردہ کشمیری پنڈتوں نے بخشی صاحب کو پنڈت برادری کے مفادات کا واحد محافظ قرار دے کران کی بھرپور حمایت کا اعلان کیا تھا، مسٹر نیلہ کنٹھ ہاک، سابق سیشن جج (جو شیخ صاحب کے خلاف مقدمہٗ سازش کی سماعت کرچکے ہیں) اور شریمتی ڈاکٹر جگت موہنی کی تحریک پر شہر کے مختلف حصوں میں کشمیری پنڈت برادری بخشی صاحب کی حمایت کے لیے منظّم ہو رہی تھی۔ خود بخشی صاحب بھی اپنی انتخابی مُہم میں کشمیری پنڈت برادری پر ہی اپنی توجہ مرکوز کررہے تھے۔ مجھے اس حکمتِ عملی سے جائز طور پر تشویش پیدا ہو رہی تھی، کہ کہیں یہ انتخابی مقابلہ فرقہ وارانہ رنگ اختیار نہ کرے، جوں جوں انتخابی مہم تیز ہوتی گئی۔ بخشی صاحب اور ان کے حامی کشمیری پنڈتوں نے اسے خالص فرقہ وارانہ مسئلہ بنا کر پیش کرنے میں کوئی دقیقہ فرد گزاشت نہیں کیا اور ایک مرحلے پر جن سنگھ کے امیدوار تریلو کی ناتھ در کے متعلق یہ افواہ بھی اڑائی گئی ، کہ وہ کشمیری پنڈت برادری کے ووٹوں کو تقسیم سے بچانے کے لیے انتخاب

سے دستبردار ہو رہے ہیں، تاکہ بخشی صاحب کو پنڈتوں کے سبھی ووٹ مل سکیں۔ شری، ٹی، این در نے مجھے بتایا کہ انہیں مقابلے سے دستبردار کرانے کے لیے بہت کوشش کی گئی، لیکن اُنہوں نے صاف انکار کر دیا۔ ڈاکٹر جگت موہنی کی تحریک پر مندر باغ میں پنڈت برادری کے ایک بھاری اجتماع میں متفقہ طور پر ایک قرارداد پاس کی گئی، کہ جس میں اس بات کا اعلان کیا گیا، کہ تمام کشمیری پنڈت برادری لوک سبھا کے الیکشن میں بخشی غلام محمد کو ووٹ دے کر کامیاب بنائے گی۔ قرارداد میں بخشی صاحب کو کشمیری پنڈت برادری کا محافظ قرار دے کر انہیں ہر قیمت پر کامیاب بنانے کا عہد کیا گیا۔ ڈاکٹر جگت موہنی اپنی فرقہ پرستی، رجعت پسندی اور تنگ نظری کے لیے کافی مشہور ہیں۔ اور انہوں نے ۱۹۶۷ء کی کشمیری پنڈت ایجی ٹیشن میں کشمیری پنڈتوں کے فرقہ وارانہ جذبات بھڑکا کر کافی نام کمایا ہے، لیکن پران ناتھ جلالی، موتی لعل مصری اور دینا ناتھ نادم جیسے مارکس وادیوں کے رویے میں بھی یک لخت ایک تبدیلی پیدا ہو گئی تھی، جو میرے لیے بے حد غیر متوقع اور حد درجہ تکلیف دہ ثابت ہو رہی تھی۔ پران ناتھ جلالی، میرے پڑوسی ہیں، میرے بہت اچھے دوست بھی ہیں۔ ۱۹۶۷ء کی ایجی ٹیشن کے دوران جب پیر غیاث الدین نے ان پر کھلے بندوں فرقہ پرستی کا الزام لگایا تو میں نے غیاث الدین کو بُری طرح ٹوکا، کیوں کہ مجھے ذاتی طور پر اُن کی ترقی پسندی پر گہرا وشواس تھا۔ لیکن بخشی صاحب سے میرے اس مقابلے میں انہوں نے بھی مارکس اور لینن کی بجائے ڈاکٹر جگت موہنی کی قیادت قبول کر لی تھی۔ موتی لعل مصری

اور دینا ناتھ نادم نے میری طرف سے یوں آنکھیں پھیر لیں، کہ جیسے مجھ سے سیکولرزم، سوشلزم اور جمہوریت کے خلاف کوئی بہت بڑا جرم سرزد ہوا ہو۔ سرکردہ وکیلوں میں سے اکثر کشمیری پنڈت وکیل میرے مہربان اور میرے دوست ہیں۔ کشمیر سے ہندوستان کے الحاق اور سیکولرزم پر میرے اعتقاد کی بنا پر یہ لوگ مجھ سے بہت خوش تھے۔ ان میں بہت سے دوست میری صحافت، دیانت اور خطابت کے عاشق تھے۔ لیکن بخشی صاحب کے خلاف میرے کاغذات نامزدگی داخل کرنے کے فوراً بعد، ان کی نگاہیں بدل گئیں، ان کا لب و لہجہ بدل گیا اور ہمارے تعلقات کی نوعیت بدل گئی۔ حالاں کہ ہند کشمیر الحاق اور سیکولرزم کے متعلق میرا موقف آج بھی وہی تھا، جو کاغذات نامزدگی داخل کرنے سے پہلے تھا۔ شاعر چمن لعل چمن، افسانہ نگار، بنسی نردوش اور صحافی شیام کول، یہ سب میرے دوست تھے اور آج بھی میرے دوست ہیں، لیکن ۲۱ فروری سے ۱۳ مارچ تک نہ معلوم ہماری دوستی دشمنی میں کیوں بدل گئی تھی؟ میری زندہ دلی، بہادری، قابلیت، انسان دوستی اور حاضر جوابی کے یہ عاشق یک لخت مجھ سے بدظن ہوگئے، اور میں ان کی نگاہوں میں اوّل درجے کا فرقہ پرست اور خطرناک قسم کا مسلمان قرار پایا۔ بخشی غلام محمد کے ساتھ کشمیری پنڈتوں کی اس وابستگی اور دلچسپی کی کئی سیاسی اور نفسیاتی وجوہات ہیں۔

☆

(۴)

میں نے پچھلی اشاعت میں کشمیری پنڈت ''برادری'' کے رول کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ بخشی غلام محمد کے ساتھ کشمیری پنڈتوں کی وابستگی اور دلچسپی کی کئی سیاسی اور نفسیاتی وجوہات ہیں، لیکن ان وجوہات کو جاننے سے پہلے کشمیری پنڈتوں کی نفسیات سمجھنا ضروری ہے۔

آزادی سے پہلے کشمیری پنڈت ایک حقیر سی اقلیت ہونے کے باوجود زندگی کے ہر شعبے پر چھائے ہوئے تھے۔ راجوں، مہاراجوں کی مصاحبت، سرکاری ملازمت، علم و فن، تجارت، وکالت، صحافت، غرض ہر میدان میں یہ مسلمانوں سے آگے ہی نہیں بہت آگے تھے، مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی اور ان کے تئیں ڈوگرہ حکمرانوں کے امتیازی رویے نے کشمیری پنڈتوں کو سرکاری ملازمت کی نچلی سطح سے لے کر اونچی سے اونچی سطح پر قابض ہونے کے مواقع فراہم کیے اور اُنہوں نے اپنی خداداد ذہانت، تعلیمی قابلیت اور مصاحبانہ صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے ان مواقع سے اچھی طرح فائدہ اٹھایا۔ سرکاری ملازمتوں پر پنڈت اقلیت کے اس تسلط یا غلبے میں، کشمیری پنڈتوں کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ ایک کمی اور ایک خلا کو پورا کر رہے تھے۔ اور چوں کہ وہ ذہنی، تعلیمی اور تہذیبی اعتبار سے زیادہ موزوں

تھے۔ اس لیے انہیں مسلمانوں کے مقابلے میں ترجیح ملنا بالکل قدرتی بات تھی، لیکن رفتہ رفتہ مسلم اکثریت کو اپنی ذلت اور محرومی کا احساس ہونے لگا اور کچھ لوگوں نے اس صورت حال کو بدلنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ سب سے پہلے سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی مناسب نمائندگی کا سوال درپیش تھا اور یہ بات بڑی اہم ہے، کہ تحریک حریت کے آغاز میں یہی سوال مسلمان لیڈروں اور دانشوروں کی توجہ اور جدوجہد کا مرکز بن گیا۔ بہت دنوں تک ساری سیاست سرکاری ملازمت میں مسلمانوں کی نمائندگی کے مسئلے کے گرد گھومتی رہی اور مسلمانوں کو شدت سے یہ احساس ستانے لگا کہ انہیں جان بوجھ کر تعلیمی میدان میں پیچھے رکھا گیا ہے۔ رفتہ رفتہ اِس احساس نے بیزاری اور بغاوت کا روپ اختیار کیا، اور کشمیر میں مسلمانوں نے شیخ محمد عبداللہ کی قیادت میں اس ظلم اور ناانصافی کے خلاف ایک فیصلہ کُن جنگ لڑنے کا عزم کیا۔ سرکاری ملازمت میں مسلمانوں کی مناسب نمائندگی کا مطالبہ، فرقہ وارانہ سوال نہ تھا۔ لیکن چوں کہ اس سے کشمیری پنڈتوں کی اجارہ داری کو خطرہ لاحق ہوگیا تھا، اس لیے اُنہوں نے پوری تحریک کو ''فرقہ وارانہ'' قرار دے کر اس کے تئیں معاندانہ رویہ اختیار کیا۔ خوش قسمتی سے کشمیری پنڈتوں میں کچھ روشن دماغ، حقیقت پسند اور عاقبت اندیش موجود تھے، کہ جنہوں نے مسلمانوں کے مطالبات کی معقولیت کو تسلیم کر کے ان کے تئیں ہمدردانہ رویہ اختیار کیا۔ مسلمانوں کو بھی جلد ہی احساس ہوگیا، کہ سرکاری ملازمت میں نمائندگی کا سوال، مسئلے کا ایک پہلو ہے، پورا مسئلہ نہیں۔ اصل

مسئلہ ایک ذمہ دار نظامِ حکومت کا ہے۔ یہی احساس ۱۹۳۸ء میں مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کرنے کا محرک بنا، اور اس طرح ڈوگرہ راج کے خلاف ایک متحدہ محاذ کی داغ بیل پڑ گئی۔ بہت سے سرکردہ کشمیری پنڈت تحریک حریت میں شامل ہو گئے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں، کہ انہوں نے تحریک کے دوران نمایاں رول ادا کیا۔ لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ قائم ہے، کہ کشمیری پنڈتوں کی اکثریت نے تحریک کو ہمیشہ شک و شبہ کی نظروں سے دیکھا۔ اور مسلمان لیڈروں کی قوم پرستی پر وہ کبھی صدق دلی سے ایمان نہ لا سکے۔ انہیں اس بات کا احساس تھا، کہ آزادی، عزت اور اقتدار کی اس لڑائی میں بہر حال فائدہ مسلمانوں کو ہوگا۔ اور ان کی اپنی اجارہ داری ختم ہو جائے گی۔ اس لیے ان سے جہاں تک ممکن ہو سکا، انہوں نے اپنے مفادات خصوصی کو بچانے کے لیے ترقی پسند تاریخی قوتوں کی مزاحمت کی۔ تاریخ کا کارواں افراد یا اقلیتوں کی پروا کیے بغیر آگے بڑھتا گیا اور ۱۹۴۷ء میں جب عنانِ اقتدار قومی لیڈروں کے ہاتھوں میں آ گئی، تو کشمیری پنڈتوں کو ایک غیر متوقع اور غیر معمولی صورت حال کا مقابلہ کرنا پڑا۔ مگر ان کے لیے اس صورت حال کا اطمینان بخش پہلو یہ تھا، کہ کشمیری مسلمان، پاکستان کے مقابلے میں ڈٹ کر، ہندو، مسلم، سکھ اتحاد زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ شیخ محمد عبداللہ اور ان کے دوسرے مسلمان ساتھی، خالص نظریاتی بنیاد پر پاکستان کا مقابلہ کر رہے تھے۔ وہ سیکولرازم اور سوشلزم سے اپنی گہری وابستگی کی بناء پر پاکستانی لیڈروں کی نگاہوں میں معتوب تھے، لیکن کشمیری پنڈت

اس بات سے خوش تھے، کہ وہ اسلام کے نام پر بننے والے پاکستان کی بجائے ہندو اکثریت والے ہندوستان کا حصہ بن رہے ہیں۔ انہیں اس خالص نظریاتی کشمکش میں اپنی سلامتی اور اپنے مفادات کے تحفظ کی صورت نظر آئی اور اس لیے انہوں نے شیخ محمد عبداللہ کو عظیم ترین لیڈر ہی نہیں، اوتار کا درجہ دینا شروع کیا۔ ۱۹۴۹ء میں پاکستان کے ساتھ جنگ بندی کا معاہدہ طے ہونے کے بعد جب شیخ محمد عبداللہ کی قیادت میں ریاستی حکومت نے موروثی حکمرانی کا خاتمہ اور زمینی اصلاحات کا نفاذ کیا، تو کشمیری پنڈتوں نے دبی زبان سے یہ کہنا شروع کیا کہ ان اقدامات کا مقصد ان کے حقوق کو پامال کرنا ہے۔ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے جب انہیں کچھ سہولتیں بہم پہنچائی جانے لگیں تو کشمیری پنڈتوں میں بے چینی اور بے اطمینانی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وہ کھل کر تو نہیں، لیکن سرگوشیوں میں کشمیر کی مسلمان حکومت کی بُرائی کرنے لگے، ریاستی عوام کی مجموعی بھلائی کے لیے اٹھائے جانے والے ہر قدم پر انہیں اپنے خلاف سازش کا گمان ہونے لگا اور مسلمانوں کی سیاسی، تعلیمی، ذہنی اور اقتصادی ناآسودگی کو دور کرنے کی ہر کوشش ان کو بُری طرح کھٹکنے لگی۔ وہ کشمیر کے ہندوستان کا حصہ بننے پر تو خوش تھے، لیکن ہندوستان میں کشمیری مسلمانوں کی خصوصی پوزیشن ان کے لیے ناقابلِ فہم تھی۔ ان کا مفاد اسی میں تھا، کہ غیر ملکی حکمرانوں نے اکثریت اور اقلیت کے درمیان تعلیمی پسماندگی اور ذہنی غلامی کی جو دیواریں قائم کردی تھیں، وہ برقرار رہیں اور اگر یہ ممکن نہ ہو، تو پھر ان دیواروں کے وجود کو

نظر انداز کر کے محض تعلیمی قابلیت اور ذہنی صلاحیتوں کی بناء پر ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کے مواقع میسر ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس دوڑ میں ایک بار پھر کشمیری پنڈتوں کا پلہ بھاری رہتا اور تاریخ کی ستم رانیوں نے مسلم اکثریت اور ہندو اقلیت کے درمیان جو خلیج حائل کردی تھی، وہ کم ہونے کی بجائے زیادہ وسیع ہو جاتی۔ شیخ محمد عبداللہ اور ان کے دوسرے ساتھیوں کو اس ناگوار اور تلخ حقیقت کا احساس تھا، اس لیے وہ مسلم اکثریت کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے کوشاں تھے۔ ان کی یہ خواہش کہاں تک پوری ہوئی، اس کے متعلق قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا ممکن نہیں، لیکن اس کا فوری نتیجہ یہ ہوا، کہ کشمیری پنڈتوں کی نگاہوں میں شیخ محمد عبداللہ کا سیکولرازم اور قوم پرستی مشکوک ہوگئی اور ان کی دنیا، چوں کہ صرف کشمیر تک ہی محدود نہیں، اس لیے کشمیر سے لے کر راس کماری تک شیخ صاحب پر آوازے کسے گئے۔ اور انہیں چھوٹا جناح کہہ کر پکارا جانے لگا۔ یہ دلچسپ بات ہے، کہ جب تک ہم لوگ پاکستان کی مخالفت اور دو قومی نظریے کی بُرائی کرتے رہتے ہیں، ہم ترقی پسند، سیکولر اور انسان دوست قرار پاتے ہیں۔ لیکن اگر کبھی ہم ہندوستانی مسلمانوں کی حالت زار یا کشمیری مسلمانوں کے ساتھ کی جانے والی ناانصافیوں کا ذکر کرتے ہیں، تو ہمیں فوراً فرقہ پرست، تنگ نظر اور متعصب اور پاکستانی قرار دیا جاتا ہے۔ بہر کیف اس میں صرف کشمیری پنڈتوں کا ہی قصور نہیں، یہ سارے ملک کی ذہنیت بن گئی ہے۔ اور اس میں عبدالکریم چھاگلہ جیسے مسلمانوں نے بھی اپنا حصہ ادا کیا ہے۔

۱۹۵۳ء میں شیخ محمد عبداللہ کی برطرفی اور گرفتاری کے بعد جب بخشی غلام محمد کو تخت پر بٹھایا گیا، تو بخشی صاحب کو غیر معمولی صورت حال سے نپٹنے کے لیے غیر معمولی اور وسیع اختیارات دیے گئے۔ بخشی صاحب کشمیری پنڈتوں کے ''اثر و رسوخ'' اور ان کی بے پناہ صلاحیتوں سے بخوبی واقف تھے۔ اس لیے انہوں نے انہیں خوش اور مطمئن کرنے کے لیے ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کیا۔ کشمیری پنڈت کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا، کہ کشمیر میں مسلمان صدیوں کی غلامی کے بعد اپنے وجود اپنی شخصیت کا اعلان کرنے لگا تھا وہ زندگی کے ہر شعبے میں صرف آگے بڑھنے پر ہی قانع نہیں تھا، Assert کرنے کی بھی کوشش کر رہا تھا، وہ کشمیر کی شخصیت انفرادیت اور اس کی خصوصی پوزیشن کے متعلق بہت حساس ہو گیا تھا۔ اور کشمیری پنڈت اقلیت کو اس بڑھتی ہوئی انانیت سے خوف سا محسوس ہونے لگا تھا۔ اپنی گرفتاری سے قبل شیخ محمد عبداللہ نے کھل کر کشمیری مسلمانوں کے مستقبل کے متعلق اندیشے ظاہر کرنا شروع کر دیے تھے اور ان کی گرفتاری نے مسلم اکثریت میں سخت بے چینی اور اضطراب پیدا کر دیا تھا۔ اس مرحلے پر بخشی صاحب نے اپنے اقتدار کو مستحکم بنانے اور کشمیری پنڈت اقلیت کو مطمئن کرنے کے لیے جو وطیرہ اختیار کیا اس نے بخشی صاحب کو کشمیری پنڈتوں کا ہیرو بنا دیا۔ انہوں نے بیک وقت بے انتہا تشدد اور بے تحاشا دولت کا استعمال کر کے ہر مخالف آواز کو کچل دیا۔ ریاست میں تمام سیاسی سرگرمیاں ختم ہو گئیں۔ اور سویت روس کی طرح صرف حکمران جماعت کو ہی سیاسی

قرار دادیں پاس کرنے کی اجازت تھی۔ ساری ریاست ایک وسیع جیل خانے میں تبدیل ہوگئی اور مسلمانوں کے دانشور طبقے کو اعتماد کے نااہل سمجھ کر غنڈوں اور لفنگوں کی سرپرستی شروع ہوگئی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ''وفاداروں'' کا ایک نیا طبقہ وجود میں آ گیا۔ اس نئے طبقے کو نہ سیکولرازم سے دلچسپی تھی اور نہ سوشلزم سے۔ اسے مفادِ خصوصی نے جنم دیا تھا اور یہ مفادِ خصوصی پر ہی زندہ تھا۔ بخشی صاحب نے اپنی ''نظریاتی جنگ'' میں اسی مفاد خصوصی کو الحاق کا محافظ جمہوریت کی بنیاد اور عوام کا نعم البدل قرار دیا۔ اور ستم ظریفی یہ ہے، کہ جواہر لعل نہرو جیسے روشن دماغ رہنما نے بھی الحاق، جمہوریت اور عوام کی یہ نئی تعریف قبول کرلی۔ تشدد کے ذریعے مسلمانوں کو کچلنے کے بعد پھر بخشی صاحب نے تجوریوں کے دہانے کھول دیے اور ایک پوری نسل کو Corrupt کرنے کی کوشش کی۔ ان کی یہ کوشش اس حد تک بارآور ہوگئی کہ احتجاج، مزاحمت اور عدم تعاون کا جذبہ اپنی شدت کھو کر سرد پڑ گیا۔ اور بخشی غلام محمد وزیراعظم سے بادشاہ بن گئے۔ مسلم اکثریت کی آواز کو اس بے رحمی کے ساتھ کچلنے کے عوض میں بخشی صاحب کو کشمیری پنڈتوں کی ہمدردی ہی نہیں، عقیدت بھی مل گئی اور وہ بخشی صاحب کو شیخ محمد عبداللہ کی جگہ ایک نیا اوتار ماننے لگے۔ بخشی صاحب کو چوں کہ کسی عقیدے یا نظریے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، اس لیے انہیں بیک وقت مسلم فرقہ پرستوں کو خوش کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ وہ کشمیری پنڈتوں سے یہ کہتے، کہ دیکھو میں نے مسلمانوں کو کس بُری طرح کُچل کر رکھ دیا ہے۔ اور مسلمانوں سے یہ کہتے کہ

میں ہندوستان کو لوٹ کر تمہارے لیے روپیہ لا رہا ہوں۔ انھوں نے پورے دس سال تک اس دو عملی کو اس کامیابی سے چلایا کہ جواہر لال نہرو جیسے مردم شناس اور معاملہ فہم سیاسی لیڈر بھی دھوکا کھا گئے۔ کشمیری پنڈت اس بات سے خوش تھے کہ بخشی صاحب کے دور میں مسلمانوں کو مات کرنے کی مہم جاری رہی (جب کہ پاکستانی لیڈروں کو بھی بخشی صاحب یا [illegible] [illegible] [illegible]) اور مسلمانوں کے حق میں [illegible]

[illegible]

پنڈتوں کے مفادات کو کوئی زک نہیں پہنچ رہا تھا۔ اور ان کی ہر [illegible] تھا۔ جب کبھی کشمیری پنڈتوں کو اس بات کی شکایت ہوتی کہ انھیں برابر کا حصہ نہیں مل رہا ہے۔ تو انھیں یہ کہہ کر خاموش کر دیا جاتا کہ "تم خاموش رہو میں مسلمانوں کو کھلونے دے کر بہلا رہا ہوں"۔ بخشی صاحب کے دور اقتدار میں کشمیر کی شخصیت اور انفرادیت کے علمبردار، شیخ محمد عبداللہ جیل کی

مستقل طور نظر بند تھے، اس لیے کشمیری پنڈتوں کو یہ اطمینان تھا، کہ بخشی صاحب کی قیادت میں ہند کشمیر الحاق کی جڑیں مضبوط ہو رہی ہیں۔ اس خدمت کے عوض وہ بخشی صاحب کی ہر خطا معاف کرنے کے لیے تیار تھے اور یہی وجہ ہے، کہ بخشی صاحب کے زوال کے بعد سے کشمیری پنڈت ان کی یاد میں اب آنسو بہا رہے ہیں۔ اور وہ اس موقع کے انتظار میں ہیں کہ کب بخشی صاحب دوبارہ برسر اقتدار آجائیں۔ اس بات کا ذکر شاید دلچسپی سے خالی نہ ہو، کہ حالیہ پارلیمانی انتخاب میں بخشی صاحب کی شکست کے بعد کشمیری پنڈتوں کی طرف سے تقریباً دس ہزار تاریں شریمتی گاندھی، جگ جیون رام اور مسٹر چوان کے نام ارسال کی گئیں، اور ایک ہی مضمون کی اُن تاروں میں یہ کہا گیا تھا، کہ کشمیری پنڈت اقلیت کشمیر میں اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتی ہے۔ قطع نظر اس بات کے یہ تاریں بخشی غلام محمد نے بھجوائی تھیں اور مرکزی لیڈروں نے ان کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ یہ بات اہم ہے، کہ بخشی صاحب کشمیری پنڈتوں کی نفسیاتی ناآسودگی کا سہارا لے کر ہندوستان میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ بخشی صاحب جب بھی ہند نواز قوتوں کے غیر محفوظ ہونے کی بات کرتے ہیں تو ان کا مقصد کشمیری پنڈتوں سے ہوتا ہے اور اپنی شکست کا جواز تراشنے میں انہیں کشمیر کو ''چھوٹا پاکستان'' کہنے میں بھی کوئی تامل نہیں ہوا۔

ریاست کے موجودہ وزیر اعلیٰ خواجہ غلام محمد صادق سے بھی اکثر کشمیری پنڈت بھائی اس لیے ناراض اور برہم ہیں، کہ ان کے دور اقتدار میں یہاں کا

اکثریتی طبقہ اتنا بے لگام ہو گیا ہے، کہ وہ کھلے بندوں اپنے حقوق، اپنی مراعات اور اپنے مفادات کی بات کرنے لگا ہے۔ انہیں اس بات کی سخت شکایت ہے، کہ صادق صاحب نے کسی حد تک تحریر و تقریر کی آزادی بحال کر کے مرکزی حکومت، ریاستی حکومت اور انتظامیہ پر تنقید کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ انہیں یہ بھی پریشانی ہے، کہ پچھلے چھ سات سال کے دوران یہاں محدود پیمانے پر سیاسی سرگرمیاں شروع ہو گئی ہیں۔ اور بعض سیاسی مسائل پر کھل کر گفتگو ہونے لگی ہے۔ ان کے خیال میں اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو ان کے مفادات خصوصی کو مزید زک پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ ان کی نگاہوں میں غلام محمد صادق کا سب سے بڑا جرم یہ ہے، کہ صادق صاحب نے شیخ محمد عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کو ''آزاد'' چھوڑ کر اکثریتی فرقے کو ایک ایسی مراعت دی ہے کہ جس کا وہ ہرگز ہرگز مستحق نہ تھا۔ وہ کھل کر صادق صاحب پر مسلم نوازی اور فرقہ پرستی کا الزام عائد کرتے ہیں اور بخشی غلام محمد کے دورِ اقتدار کو یاد کرنے لگتے ہیں، کہ جب اس ریاست میں کسی مسلمان کو اُف کرنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ اور جب یہاں قبرستان کی سی خاموشی اور مرگھٹ کا سا سکون تھا۔ بخشی غلام محمد سے کشمیری پنڈتوں کے والہانہ عشق کا یہی پس منظر ہے، اور اسی عشق نے پران ناتھ جلالی اور دینا ناتھ نادم جیسے مارکس وادیوں کو بھی ڈاکٹر جگت موہنی کی قیادت قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن کشمیری پنڈتوں کی مریضانہ نفسیات کا یہ تاریک پہلو پیش کرتے ہوئے مجھے اِس بات کا اعتراف کرتے ہوئے بھی بڑی مسرت ہو رہی ہے، کہ کشمیری

پنڈتوں میں پنڈت پریم ناتھ بزاز، پروفیسر جیالعل کول، پروفیسر ایس، ایل پنڈتا، شری پی، این، دراونکار ناتھ ترسل (وکیل) کلدیپ رینہ، اوتار کشن رہبر اور شمبو ناتھ تکو جیسے روشن دماغ لوگ بھی موجود ہیں، کہ جنہوں نے بخشی صاحب کے پھیلائے ہوئے جال کو تار تار کر کے سینکڑوں کشمیری پنڈتوں کو حقیقت شناسی اور ترقی پسندی کی راہ دکھائی۔ یہ وہ لوگ ہیں، کہ جنہوں نے میرے اور بخشی صاحب کے انتخابی مقابلے کو ہندوستان اور پاکستان کی لڑائی کی بجائے جمہوریت اور غنڈہ گردی کے مقابلے سے تعبیر کر کے میری اخلاقی حمایت کی اور اس طرح بخشی صاحب کی ان تھک کوششوں کے باوجود یہ انتخابی معرکہ کشمیر کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشمکش کا رنگ اختیار نہ کر سکا۔ میں نے اِس تجزیے میں افراد کی نہیں، کشمیری پنڈتوں کے طبقاتی کردار کی بات کی ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ میرے وہ سینکڑوں کشمیری پنڈت دوست میری باتوں کا بُرا نہ مانیں گے، کہ جنہوں نے مخالفوں کے انتہائی شر انگیز پروپیگنڈہ کے باوجود میری حمایت کی اور مجھے ووٹ دیا۔ مجھے یقین ہے، کہ ان میں سے بہت سے دوست میرے تجزیے اور تجربے سے متفق ہوں گے۔

☆

(۵)

۲۱ فروری کو خانیار سرینگر میں بیگم عبداللہ کی تقریر نے پانسہ پلٹ دیا۔ اور جس شہر میں چوبیس گھنٹے پہلے قبرستان کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی وہ انتخابی نعروں سے گونجنے لگا۔ میرے وکیل ساتھی جی۔ ایم۔ باون، سید منظور، محمد امین بٹ اور ریاض پنجابی جو ابتداء سے میری انتخابی مہم کے ساتھ وابستہ تھے۔ کبھی کبھی ''اندیشہ ہائے دور دراز'' میں مبتلا ہو کر مایوس ہو جاتے تھے۔ لیکن خانیار میں بیگم صاحبہ کی تاریخی تقریر کے بعد باون صاحب نے اعلان کیا، کہ بخشی صاحب کو صرف شکست ہی نہیں دی جائے گی بلکہ ان کی ضمانت بھی ضبط ہوگی اِسی طرح دوسرے ساتھی بھی انتخابی معرکے میں میری کامیابی کی پیشیں گوئیاں کرنے لگے۔ اس ایک جلسے نے شہر کے نوجوانوں میں اتنا جوش بھر دیا تھا کہ شہر کے اندرونی حصوں میں رات بھر شیر کشمیر زندہ باد اور بائیسکل کو ووٹ دو کے نعرے گونجتے رہے۔ اسی رات پولیس نے بہت سے نوجوانوں کو نعرے بلند کرنے کے الزام میں گرفتار کر کے تشدد کی کاروائیوں کا آغاز کر دیا۔ اُدھر حکمران جماعت کے لیڈروں نے نئی صورت حال پر غور کرنے کے لیے باہمی ملاقاتوں کی رفتار تیز کر دی۔ ان ملاقاتوں کا احوال روزنامہ ''آفتاب'' کی ۲۴ فروری کی اشاعت میں اس طرح شائع ہوا۔

"معلوم ہوا ہے کہ بیگم شیخ محمد عبداللہ کے انتخابی میدان میں شرکت سے پیدا شدہ صورت حال پر غور کرنے کے لیے حکمران کانگریس کے اعلا لیڈروں کے کئی اجلاس کل اور پرسوں منعقد ہوئے۔ ضلع سرینگر کے کانگریسی امیدوار بخشی غلام محمد نے وزیر اعلا خواجہ غلام محمد صادق اور صدر پردیش کانگریس سید میر قاسم کے ساتھ تبادلۂ خیال کیا اور اطلاعات کے مطابق انہوں نے اِس صورت حال کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا، جو بیگم عبداللہ کے میدان میں آجانے سے پیدا ہوگئی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ بخشی غلام محمد گزشتہ روز قاسم صاحب کے ساتھ بات چیت کرنے کے لیے ان کے پاس گئے اور وہ کل وزیر اعلا کی قیام گاہ پر ایک گھنٹے تک مصروف گفتگو رہے۔ بخشی صاحب گزشتہ روز واپس سرینگر آگئے ہیں اور اُنہوں نے اپنی واپسی کے فوراً بعد انتخابات کے سوال پر اپنی جماعت نیشنل کانفرنس کے کارکنوں کے ساتھ بات چیت کی۔ کانگریسی حلقوں کے بیان کے مطابق بیگم شیخ محمد عبداللہ کے انتخابی جلسوں میں کانگریسی امیدوار کے خلاف تقریریں کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اور انہیں اس بات کا پورا یقین ہے کہ اس کے باوجود حکمران کانگریس کا امیدوار کامیاب ہوجائے گا۔ پتا چلا ہے کہ وزیر اعلا نے بخشی غلام محمد کے حق میں انتخابی مہم شد و مد کے ساتھ چلانے کے بارے میں پارٹی کے سینئر کارکنوں کے ساتھ بھی بات چیت کی اور ان پر ان کی کامیابی یقینی بنانے پر زور دیا۔"

شہر سرینگر میں سالہا سال سے دفعہ ۴۴ نافذ ہے اور خیال تھا کہ

انتخابات کے دوران یہ دفعہ ہٹا کر عارضی طور پر جلسوں، جلوسوں پر سے پابندی ہٹا دی جائے گی۔ لیکن ہوا اس کے برعکس، یعنی انتخابی سرگرمی شروع ہوتے ہی دفعہ ۱۴۴ پر زیادہ سختی سے عمل ہونے لگا۔ انتخابی مہم چلانے کے لیے ہمارے پاس اب مشکل سے آٹھ دن رہ گئے تھے اور ایک جلسے کی اجازت حاصل کرنے میں دو دو، تین تین گھنٹے صَرف ہوتے تھے۔ پہلے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو درخواست دینا پڑتی۔ ڈی، ایم صاحب یہ درخواست ایس، پی کے نام بھیجتے۔ ایس پی صاحب، ڈی، ایس، پی کو اور ڈی، ایس، پی صاحب متعلقہ تھانہ کے انچارج کو۔ یہ ساری کاروائی بڑی صبر آزما اور تکلیف دہ تھی، اور بعض اوقات ایک جلسے کی اجازت حاصل کرنے کے لیے مجھے اور میرے ساتھیوں کو پورا ایک دن صرف کرنا پڑتا۔ اور پھر اس پر غضب یہ کہ جلسے کا اعلان کرنے کے لیے شہر میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال کرنے کی اجازت نہ تھی۔ افسران متعلقہ اور حکام بالا کو غالباً یہ خطرہ تھا کہ لاؤڈ اسپیکر کے استعمال سے ہند کشمیر الحاق کمزور ہو جائے گا۔ غرض ''نرم روی'' کے اس شہر میں انتخابی جلسے کا اہتمام جاں جوکھوں کا کام تھا۔ اور مجھے کئی بار صرف ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہی نہیں، معمولی کلرکوں کی بھی خوشامد کرنا پڑتی۔ خانیار میں بیگم صاحبہ کی تقریر کے بعد جلسے کی اجازت حاصل کرنا اور زیادہ مشکل بن گیا۔ بہر کیف جوں توں کر کے ہم نے مہاراج گنج میونسپل پارک میں بھی جلسے کی اجازت حاصل کر لی۔ اور ۲۳ فروری کو وہاں ایک بھاری جلسہ منعقد ہوا۔ مہاراج گنج کا علاقہ ''بکروں'' (مولانا مولوی محمد فاروق کے حامیوں کو ان کے مخالف

'بکرے' کہتے ہیں) کا علاقہ سمجھا جاتا ہے۔اور حالیہ انتخابی کشمکش میں ابھی میر واعظ فاروق نے اپنی پالیسی واضح نہیں کی تھی۔فاروق صاحب کی جماعت عوامی ایکشن کمیٹی کا سرکاری موقف تو یہ تھا، کہ انتخابات کا مکمل بائیکاٹ کیا جائے۔لیکن جب شیخ صاحب نے اعلانیہ میری حمایت کا اعلان کردیا، تو عام تاثر یہی تھا کہ فاروق صاحب اور ان کے حامی بخشی غلام محمد کی حمایت کریں گے، ویسے بھی عام طور سے یہی مشہور ہے کہ میر واعظ فاروق صاحب اور ان کے اکثر حامی بخشی صاحب کو شیخ صاحب اور صادق صاحب کے مقابلے میں زیادہ پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔اور ان کے درمیان ایک خاموش مفاہمت اور محبت کا سلسلہ قائم ہے۔میں نہیں جانتا کہ میر واعظ صاحب اور بخشی کی یہ مبینہ دوستی حقیقت ہے یا افسانہ، لیکن بعد کے واقعات نے یہ ثابت کردیا کہ مولانا فاروق کے بہت سے عقیدتمند بخشی صاحب کے بھی عقیدتمند ہیں اور وہ بخشی صاحب کی خاطر مولانا کے احکامات کی خلاف ورزی کرنے میں بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔مولانا فاروق صاحب میرے مہربانوں میں سے ہیں۔اور وہ میری بڑی قدر کرتے ہیں۔دہلی میں شیخ صاحب سے بات چیت کرنے سے پہلے میں نے ان سے بھی بات کی تھی۔اور انہوں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ ان کو اور ان کی جماعت کو انتخابات سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے۔اور وہ سرینگر کے مقابلے میں غیر جانبدار ہوں گے۔میں نے خاص طور پر بخشی صاحب کے متعلق ان کے رویے کی وضاحت چاہی، تو انہوں نے بڑے زوردار الفاظ میں اِس الزام کی تردید

کی، کہ وہ انتخابی مقابلے میں بخشی کی حمایت کریں گے۔

مہاراج گنج کا جلسہ حاضرین کی تعداد کے اعتبار سے خانیار کے جلسے سے کئی گنا بڑا تھا۔ جو لوگ ابھی تک شک اور تذبذب کی حالت میں تھے وہ خانیار کے ''انجکشن'' کے بعد سرگرم ہو گئے تھے۔ اور مہاراج گنج میونسپل پارک کا پیمانہ چھلک اٹھا تھا۔ سڑکوں پر مکانوں کی چھتوں اور دکانوں پر ہر جگہ لوگ نظر آرہے تھے۔ اور جب میں بیگم صاحبہ کو لے کر جلسہ گاہ میں پہنچا تو میری آنکھوں نے جوش و خروش کے وہ مناظر دیکھے کہ میری روح تازہ ہوگئی، اپنی تقریر میں بیگم صاحبہ نے میر واعظ مولانا محمد فاروق سے اپیل کی کہ اگر وہ الیکشن کے بائیکاٹ کے فیصلے پر واقعی قائم رہنا چاہتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ وہ صحیح معنوں میں اور سختی کے ساتھ اس پر کاربند رہیں۔ انہوں نے لوگوں کو تلقین کی کہ وہ نہایت پُرامن اور منظّم رہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی انہیں خبردار کیا کہ حکومت لوگوں کو پریشان کرنے کے لیے فرضی مقدمات میں پھنسانے کی کوشش کرے گی۔ اس لیے انہیں محتاط رہنا چاہیے۔ اس جلسے میں ، میں نے بھی تقریر کی، اور لوگوں سے کہا کہ میں کشمیری عوام کے احتجاج کی علامت ہوں۔ اور جو لوگ اِس ظالم حکومت اور بوسیدہ نظام کے خلاف بغاوت کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں، انہیں میرے حق میں ووٹ دینا چاہیے۔ جلسے کے آخر میں جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ مہاراج گنج پارک سے زینہ کدل تک پہنچنے میں مجھے اور بیگم صاحبہ کو ایک گھنٹہ سے زائد وقت لگا۔

ہماری انتخابی مہم کی کامیابی سے مرعوب ہو کر بخشی غلام محمد نے بھی

انتخابی جلسے منعقد کرنے کا پروگرام بنایا، وہ کسی طور اپنے ساتھیوں کے گرتے ہوئے حوصلوں کو بحال کرنا چاہتے تھے اور اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ خفیہ میٹنگوں کی بجائے کُھلے جلسے منعقد کریں، اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لیے انہوں نے سب سے پہلے مہاراج گنج کا ہی انتخاب کیا۔ اور ۲۰ فروری کو عین اسی جگہ بخشی صاحب نے بھی تقریر کی، جہاں دو دن قبل بیگم صاحبہ اور میں نے جلسہ سے خطاب کیا تھا۔ یہ بخشی صاحب کی انتخابی مہم کا پہلا اور آخری جلسہ ثابت ہوا اور اس کے بعد بخشی صاحب کو کہیں شہر میں جلسہ کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔

انتخابی جنگ کے کئی مشاہدین اور سیاسی مبصروں کا کہنا ہے کہ بخشی غلام محمد نے مہاراج گنج کے پبلک جلسے میں ہی یہ انتخابی مقابلہ ہار دیا۔ اس جلسے میں ان کی تقریر حد درجہ اشتعال انگیز اور کئی لحاظ سے بے ہودہ تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بے حد Nervous ہیں اور اپنے مخالفوں کو مرعوب کرنے کے لیے انہوں نے دھمکیوں اور دشنام طرازی سے کام لینے میں بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔ انہوں نے اپنی تقریر میں شیخ صاحب اور بیگم عبداللہ کے خلاف ناشایاں الفاظ استعمال کر کے اپنی اخلاقی پستی کا ثبوت دیا۔ اور ساتھ ہی مولانا فاروق کو خوش کرنے کے لیے یہ انکشاف بھی فرمایا کہ ۱۹۴۷ء میں وہ کشمیر کو پاکستان کے ساتھ ملانے کے حق میں تھے، لیکن شیخ صاحب نے اس کی مخالفت کی۔ بخشی صاحب نے نہایت چالاکی اور عیاری کے ساتھ مولانا محمد فاروق اور ان کے حامیوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی

کوشش کی، انہوں نے کہا کہ اپنے اقتدار کے دور میں شیخ محمد عبداللہ نے میر واعظ خاندان کو بہت تکلیف پہنچائی اور تقریباً ۲۷ ہزار لوگ جنگ بندی لائن کے اس پار بھیج دیے گئے۔ اس کے علاوہ ۱۹ ہزار لوگوں کو جیلوں میں ٹھونسا گیا (اس دور میں بخشی صاحب نائب وزیراعظم اور وزیر داخلہ تھے۔ شمیم)

اِس موقع پر جب ایک شخص نے ''اصلی مجرم کو پیش کرو'' کا نعرہ بلند کیا، تو جلسے میں بھگڈر مچ گئی۔ اور ایک نوجوان نے بخشی صاحب پر کانگڑی سے حملہ کیا۔ بخشی صاحب کے اکثر ساتھی لاٹھیوں سے مسلح ہو کر آئے تھے اور انہوں نے بہت سے بے گناہ لوگوں کو لاٹھیوں سے زخمی کر دیا۔ پولیس کی ایک بھاری جمعیت بھی بخشی صاحب کی مدد کے لیے موجود تھی۔ اور انہوں نے درجنوں افراد کو گرفتار کر کے جلسے میں امن قائم کر دیا۔ جلسے میں اس معمولی سی گڑبڑ نے بخشی صاحب کا ذہنی توازن بالکل ہی برہم کر دیا۔ اور انہوں نے غصے میں آ کر ایسی ایسی باتیں کہیں کہ جن کے لیے انہیں عمر بھر کف افسوس ملنا پڑے گا۔ انہوں نے کہا کہ موئے مقدس کا اصل مجرم شیخ محمد عبداللہ ہے۔ اور دعویٰ کیا کہ وہ عنقریب بہت سے اہم رازوں سے پردہ اٹھا دیں گے۔ بخشی صاحب نے بیگم عبداللہ کے چیلنج کو قبول کرتے ہوئے انہیں طعنہ دیا کہ شیخ محمد عبداللہ کو چاہیے تھا کہ وہ خود میرے مقابلے میں الیکشن لڑتے، تو انہیں معلوم ہوتا کہ وہ کتنے پانی میں ہیں؟

مولانا فاروق سے اپنی گہری دوستی اور وابستگی کا ذکر کرتے ہوئے بخشی

صاحب نے کہا کہ ''دو دِن قبل جب بیگم عبداللہ نے یہاں تقریر کی، تو بہت سے لوگ ان کے جلسے میں گڑبڑ کرنا چاہتے تھے، لیکن میں نے سارا دن میر واعظ فاروق اور عبدالرحیم وازہ (ان کا ذکر آگے آئے گا۔شمیم) کے ساتھ ٹیلی فون پر رابطہ قائم رکھا تھا کہ یہاں کسی قسم کی گڑبڑ نہ ہونے پائے۔ مجھ پر یہ الزام ہے کہ میں نے مولانا فاروق کی دستار بندی کر کے ان کو شیخ محمد عبداللہ کے مقابلے میں کھڑا کیا ہے۔ میں اعلانیہ کہتا ہوں کہ ایک بار کیا، اگر مجھے ہزار سال بھی مولانا فاروق کی دستار بندی کرنے کا موقع ملے تو میں اسے اپنی سعادت سمجھوں گا''۔

بخشی صاحب کی اس اشتعال انگیز تقریر نے لوگوں کو اس درجہ بھڑکا دیا تھا کہ مہاراج گنج سے امیرا کدل تک انہیں باقاعدہ پولیس کی حفاظت (حراست) میں جانا پڑا۔اس کے باوجود کئی مقامات پر لوگوں نے ان کے خلاف شدید مظاہرے کیے اور پولیس کو امن برقرار رکھنے کے لیے لاٹھی چارج اور آنسو گیس کا استعمال کرنا پڑا۔ اس جلسے میں کانگریس کا کوئی رہنما بخشی صاحب کے ساتھ نہ تھا اور ایک اطلاع کے مطابق بخشی صاحب کی منت سماجت کے باوجود سید میر قاسم نے کسی پبلک جلسے میں بخشی صاحب کے حق میں تقریر کرنے سے انکار کر دیا۔مہاراج گنج کے جلسے کے بعد پروگرام کے مطابق دوسرے اور تیسرے دن بخشی صاحب کو گدود باغ اور رعناواری میں جلسہ کرنا تھا۔لیکن پہلے ہی جلسے میں انہیں اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ شہر کے لوگ ان کی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔اس لیے

انہوں نے باقی تمام جلسے منسوخ کر دیے!۔

مہاراج گنج کے جلسے میں بخشی صاحب نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ مولانا مولوی محمد فاروق کو اپنے ساتھ وابستہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اور اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ فاروق صاحب بخشی صاحب کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنسنے کی بجائے ان باتوں کی تردید کریں گے، جو بخشی صاحب نے ان سے منسوب کی تھیں۔ خاص طور پر ٹیلی فون پر رابطے والی بات، لیکن دو دن بعد جب مولانا نے جامع مسجد میں انتخابات کا ذکر کیا۔ تو اس میں انہوں نے اس واقعے کا ذکر ہی نہیں کیا۔ انہوں نے انتخابات کو ایک مذاق اور فراڈ قرار دے کر اپنے حامیوں کو اس سے لاتعلق رہنے کا مشورہ دیا۔ اُنہوں نے بخشی غلام محمد کا نام لیے بغیر تمام سیاسی جماعتوں اور امیدواروں کو خبردار کیا کہ وہ ان کے خاندان کا نام بیچ میں نہ لائیں۔ اور نہ انہیں کوئی مشورہ دے، مولانا نے بخشی صاحب کے اس بیان کی تردید نہیں کی کہ وہ چند دن پہلے ان سے ٹیلی فون پر رابطہ قائم کیے ہوئے تھے اور انہی کی درخواست پر بیگم عبداللہ کے جلسے میں گڑبڑ کرنے کا پروگرام منسوخ کر دیا گیا تھا۔ کیا مولانا فاروق کی خاموشی بخشی صاحب کے دعوے کی تصدیق تھی؟ اس کے متعلق قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا ممکن نہیں ہوگا۔ لیکن اس حقیقت سے شاید کوئی نتیجہ برآمد کرنے میں مدد ملے۔ کہ مولانا فاروق کے بائیکاٹ کی اپیل کے باوجود ووٹنگ کے دن ان کے اکثر کارکن بخشی صاحب کے حق میں سرگرم دیکھے گئے۔ اور اس بات میں تو اب شک وشبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں کہ مولوی صاحب کے

اکثر حامیوں نے بخشی صاحب کے حق میں اپنے ووٹ کا استعمال کیا۔حق خودارادیت کے حامی مولوی محمد فاروق اور بخشی غلام محمد میں کیا مناسبت ہے! پاکستان کے عاشق 'بکروں' کو بخشی غلام محمد کی ذات سے کیوں عقیدت ہے؟ سیاسیات کشمیر کے یہ تضادات بجائے خود ایک دلچسپ موضوع ہیں اوران کا مطالعہ کشمیر کی تاریخ اور تحریک آزادی کو سمجھنے میں بہت مفید ہوسکتا ہے۔

سرینگر سے اپنی امیدواری کے کاغذات داخل کرتے وقت میرے وہم وگماں میں بھی نہ تھا، کہ اس مقابلے کو اتنی غیر معمولی اہمیت حاصل ہوجائے گی۔انتخابی مہم میں بیگم عبداللہ کی شرکت نے اسے ملک کا سب سے اہم اور دلچسپ انتخاب بنادیا تھا۔

☆

(٦)

بخشی صاحب، جب سے اقتدار سے محروم ہو گئے ہیں۔ وہ اس خوش فہمی کا شکار ہیں کہ کشمیر کے لوگ ان کی کمی بہت بُری طرح محسوس کر رہے ہیں۔ انہیں اس بات کا زعم تھا کہ اپنے دور اقتدار میں انہوں نے اتنے لوگوں پر مہربانیوں اور نوازشوں کی بارش کی ہے کہ لوگوں کی اکثریت ان کو دوبارہ برسرِ اقتدار دیکھنے کے لیے بے قرار ہے ۱۹٦۷ء کے عام انتخاب میں اسمبلی اور پارلیمنٹری نشست سے ان کی بیک وقت کامیابی نے اِس خوش فہمی کو یقین میں بدل دیا۔ اور اب کی بار وہ صرف پارلیمنٹ کے ممبر بننے پر ہی راضی نہیں تھے بلکہ مرکزی وزارت میں کشمیر کی ''نمائندگی'' کا خواب بھی دیکھ رہے تھے۔ غالباً اِسی لیے انہوں نے مجھے محمد شفیع قریشی کے خلاف ڈٹے رہنے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ دراصل اپنی راہ کی ساری رکاوٹیں دور کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور انہیں یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ ان کے سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے!

بیگم شیخ محمد عبداللہ کا میدان میں آ جانا، بخشی غلام محمد اور دوسرے ارباب اقتدار کے لیے اتنا غیر متوقع اور ناقابل یقین حادثہ تھا کہ بہت دیر تک دونوں ہی آنکھیں مل مل کر اس کی صحت اور صداقت کا امتحان کرتے

رہے۔ ابھی وہ اس حملے کا مقابلہ کرنے کی تیاری کررہے تھے کہ حضرت بل کے ایک عظیم اجتماع میں مولانا محمد سعید مسعودی نے بھی اعلانِ جنگ کر دیا۔ ۱۹۶۳ء موئے مقدس کی گمشدگی کے بعد مولانا تارک الدنیا تو نہیں لیکن تارک سیاست ہو گئے تھے۔ وہ سیاست میں حصہ لینا تو در کنار، سیاسی موضوعات پر گفتگو کرنے سے بھی گریز کرتے۔ مولانا کی اس گوشہ نشینی پر بہت سے لوگ ان سے ناراض تھے۔ اور مقامی اخبارات میں آئے دن ان کے نام اپیلیں شائع ہوتیں کہ انہیں کنجِ تنہائی سے گوشۂ عافیت کو خیر باد کہہ کر کشمیری عوام کی رہبری اور رہنمائی کا فرض انجام دینا چاہیے۔ لیکن وہ اپنی خلوت کے قلعے میں کچھ اس طرح محصور ہو گئے تھے کہ انہیں باہر کی کوئی آواز سنائی ہی نہیں دیتی تھی۔ میں نے کئی بار مولانا کو مہر سکوت توڑ کر میدان عمل میں آنے کی تحریک دی، لیکن اُنہوں نے اپنی خاموشی اور اپنی بے عملی کی ایسی ایسی تاویلیں کیں، کہ میری ساری کی ساری وکالت دھری رہ گئی۔ وہ اکثر یہی کہتے کہ ہم بوڑھوں کا زمانہ گزر گیا۔ اب یہ نوجوانوں کا دور ہے اور انہیں باعزت طور پر ان کے لیے جگہ خالی کرنا چاہیے۔ میں جانتا ہوں کہ مولانا کے اس استدلال کے پیچھے کتنی تلخیاں، شکایتیں اور مایوسیاں چھپی ہوئی ہیں۔ لیکن وہ اتنے بااخلاق اور شگفتہ مزاج ہیں کہ ان کے بہت قریب رہنے والوں کو بھی ان کے درد و کرب کا اندازہ نہیں ہوتا۔ شیخ صاحب اور بیگ صاحب کے ریاست میں داخلے پر پابندی کے بعد میں نے سرینگر سے بخشی صاحب کا مقابلہ کرنے پر انہیں آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن مولانا ٹس سے

مس نہ ہوئے حالاں کہ شیخ صاحب کی بھی یہی خواہش تھی کہ بخشی صاحب کے مقابلے میں مولانا ہی کھڑے ہوجائیں۔ مولانا مسعودی کی اس سردمہری اور بے اعتنائی نے مجھے ان سے مایوس کردیا اور میں اپنی جگہ یہ سوچنے لگا کہ اس مردِ درویش نے زمانے کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنی شکست کا اعتراف کرلیا ہے لیکن ۲۵ فروری کو جب حضرت بل کے ایک عظیم الشان جلسے میں، میں نے مولانا کو اسی پرانے انداز میں گرجتے ہوئے دیکھا کہ جس نے ۱۹۶۴ء کی زمہریری ہواؤں میں لاکھوں لوگوں کا لہو گرمایا تھا تو مجھے اپنی رائے بدلنا پڑی۔ مولانا کی خاموشی اعتراف شکست نہیں، ان کی حکمت عملی کا ایک حصہ ہے۔ وہ عین اس وقت 'نمودار' ہوجاتے ہیں کہ جب واقعی ان کی ضرورت محسوس ہو۔ بیگم صاحبہ نے میری انتخابی مہم کا آغاز کر کے جوش وخروش کا ایک طوفان پیدا کردیا تھا۔ سینوں میں چھپی ہوئی آگ کو بھڑکا دیا تھا اور ایک مایوس قوم میں ایک نئی ہلچل پیدا کردی تھی۔ اب اِس جوش وخروش، اِس آگ اور اس ہلچل کو ضبط اور تنظیم کا سلیقہ دینے کی ضرورت تھی۔ اور یہ کام مولانا سے بہتر کوئی نہ کرسکتا تھا۔ مولانا کو ٹھیک وقت پر میدان میں لانے کا سہرا بیگم صاحبہ ہی کے سر رہے گا کہ جنہوں نے اپنے مخصوص انداز میں انہیں اِس انتخابی مقابلے کی اہمیت سمجھا کر میری انتخابی مہم میں شریک ہونے پر آمادہ کیا۔ جو کام میری وکالت سے نہ ہوسکا تھا، اسے بیگم صاحبہ کے تدّبر اور تحمل نے انجام دیا۔ اور مولانا پوری سنجیدگی کے ساتھ انتخابی میدان میں کود پڑے۔ حضرت بل میں ان کی پہلی ہی تقریر نے دشمن کی صفوں میں

کھلبلی مچادی۔انہوں نے اپنی تقریر میں کہا۔کہ ’’خداتعالیٰ کبھی اس قوم کے ساتھ انصاف نہیں کرتا کہ جوقوم اپنے ساتھ انصاف کرنے کے لیے تیار نہ ہواوراپنے ساتھ انصاف کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ظلم اورتشدد کے سامنے کبھی ہتھیار نہ ڈالو۔آج کا انتخابی معرکہ ظلم اورانصاف کے درمیان ایک تاریخی مقابلے کی حیثیت رکھتاہے۔اوراگرتم اپنے ساتھ انصاف کرناچاہتے ہوتوظلم کے خلاف متحد ہوکراس کی سب سے بڑی نشانی بخشی غلام محمدکوشکست دو۔‘‘مولانا نے بڑی تفصیل اور وضاحت کے ساتھ بخشی غلام محمد کے دور(استبداد) پرروشنی ڈال کرحاضرین کوتلقین کی کہ وہ اپنے ووٹ کی قدرو قیمت جان کراِس کا صحیح استعمال کریں۔حضرت بل میں اس روز لاکھوں کا اجتماع تھااورمولانا کی تقریر نے اِس انتخابی مقابلے کوایک نئ سمت عطا کی اُنہوں نے لوگوں پر بار بار یہ بات واضح کردی کہ آنے والا انتخاب ہرگز ہرگزکوئی مذہبی معاملہ نہیں ہے۔بلکہ ایک خالص سیاسی تصادم ہے کہ جس میں ایک طرف ظلم وتشدد،غنڈہ گردی اورآمریت اور دوسری طرف جمہوریت، انصاف اورانسان دوستی ہے۔مولانا کی تقریر سے پہلے بیگم عبداللہ نے بھی حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے انہیں اِس انتخابی مقابلے کی اہمیت سے آگاہ کیا۔بیگم صاحبہ نے کہا کہ لوگوں کودشمن کی چالوں سے خبرداررہ کر ہرقسم کی بدامنی سے پرہیز کرنا چاہیے انہوں نے اس بات پرزوردیا کہ اس انتخابی مقابلے کا الحاق یاکسی اور مسئلے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔یہ غنڈہ گردی اورشرافت کی جنگ ہے اوراِس جنگ میں آپ لوگوں کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ

اس ریاست پر بخشی غلام محمد اور اس کے غنڈے مسلط رہیں گے یا یہاں کے شریف لوگ؟ بیگم صاحبہ نے قدرے تفصیل کے ساتھ غنڈہ گردی اور دہشت پسندی کے ان واقعات کا ذکر کیا کہ جو بخشی صاحب کے دورِ اقتدار میں روزمرہ کا معمول بن چکے تھے۔ سیاسی حلقے انتخابی مہم میں مولانا مسعودی کی شمولیت کو غیر معمولی اہمیت دے رہے تھے۔ اور ان کا خیال تھا کہ مولانا مسعودی کی شرکت سے مولانا مولوی محمد فاروق کی سیاست بھی [illegible] ہوگی اور انہیں بھی اپنے موقف پر از سر نو غور کرنا پڑے گا [illegible] کی [illegible] کی شرکت سے [illegible] غلام محی الدین [illegible] [illegible]

دیا تھا اور [illegible] کے بعد پہلی بار کشمیر کے لوگ ایک آواز ہو کر ظلم اور ناانصافی کے خلاف متحد ہو گئے تھے۔ جوں جوں انتخابی مہم کی سرگرمیاں بڑھتی گئیں حکمران جماعت اور بخشی غلام محمد کی پریشانیاں بھی بڑھتی گئیں۔ اس عوامی ابھار کا سیاسی سطح پر مقابلہ کرنے کی نہ بخشی غلام محمد میں ہمت تھی نہ حکمران جماعت میں۔ اس لیے انہوں نے ہمارا مقابلہ کرنے کے

لیے وہی پرانے نسخے آزمانے شروع کیے کہ جنہیں پچھلے بیس سال سے کشمیر میں قانون اور آئین کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔ دھڑ ادھڑ گرفتاریاں ہونے لگیں۔ اور جہاں بھی کسی شخص پر یہ شبہ ہوا کہ اس کی ہمدردیاں ہمارے ساتھ ہیں، اُسے بغیر کسی وجہ یا جواز کے گرفتار کرلیا گیا۔ بخشی صاحب نے پولیس کو چھ سو آدمیوں کی ایک فہرست مہیا کردی کہ جن کو ووٹ ڈالے جانے سے پہلے احتیاطی نظر بندی کے تحت گرفتار کیا جانا مقصود تھا۔ ایک اعلا پولیس آفیسر نے مجھے بتایا کہ ان چھ سو آدمیوں میں سے پولیس نے دو سو سے زائد لوگوں کو نظر بند کردیا لیکن بخشی صاحب اس پر راضی نہ تھے اور ان کا اصرار تھا کہ چھ کے چھ سو لوگ گرفتار کیے جائیں۔ خواجہ غلام محی الدین متو شہر کے ایک متمول، باعزت تاجر ہیں۔ وہ عملی سیاست میں حصہ نہیں لیتے، لیکن ان کے بارے میں بخشی صاحب کو یہ شُبہ تھا کہ اس انتخابی معرکے میں ان کی ہمدردیاں بخشی صاحب کے ساتھ نہیں ہیں۔ اِس جُرم کی پاداش میں اُنہیں احتیاطی نظر بندی قانون کے تحت گرفتار کرلیا گیا اور انتخابی نتائج کا اعلان ہونے کے بعد ہی رہا کیا گیا۔

میں نے جب ایک اعلا سرکاری افسر سے متو صاحب کی گرفتاری کی وجہ دریافت کی، تو اُنہوں نے کہا کہ بخشی صاحب کا اصرار تھا کہ غلام محی الدین متو کو گرفتار کیے بغیر ان کی کامیابی ممکن نہیں اس لیے ان کو مطمئن کرنے کے لیے متو صاحب کو گرفتار کرنا پڑا۔ جن لوگوں کو کشمیر کے اندرونی حالات کا صحیح علم نہیں ہے وہ میری ان باتوں کو غالباً مبالغے پر محمول کریں گے۔ اور وہ ایسا کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔ کیوں کہ ہندوستان کی کسی دوسری

ریاست میں اس قسم کی غنڈہ گردی اور بد معاشی ممکن نہیں ہو سکتی۔ لیکن جو لوگ کشمیر کی اندرونی سیاست سے واقف ہیں، ان کے لیے یہ کوئی اچھنبے کی بات نہیں ہو سکتی، وہ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ شہری آزادیوں کے معاملے میں کشمیر ہندوستان کا حصہ ہوتے ہوئے بھی اس سے الگ ایک ریاست ہے۔ اور یہاں جس شخص کو بھی حکومت چاہے، بغیر کسی وجہ یا جواز کے گرفتار کر سکتی ہے اور جب تک چاہے اسے نظر بند رکھ سکتی ہے۔ ریاست جموں و کشمیر ملک کی واحد ریاست ہے کہ جہاں بیک وقت اتنے کالے قوانین رائج ہیں کہ ان کی کل تعداد یاد رکھنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ بہر کیف میں یہ عرض کر رہا تھا کہ جوں جوں انتخابات کی تاریخ قریب آتی گئی ظلم و تشدد کا سلسلہ بھی بڑھتا گیا۔ اور ۴ مارچ تک ضلع سرینگر میں تین سو سے زائد افراد گرفتار کیے جا چکے تھے۔ ان گرفتاریوں کا ایک مقصد عام لوگوں میں خوف و ہراس پیدا کر کے انہیں انتخابی مہم میں حصہ لینے سے باز رکھنا تھا۔ لیکن اس کا بالکل الٹا اثر ہوا۔ اور جو لوگ پہلے دور سے تماشا دیکھ رہے تھے وہ گرفتاریوں کی اشتعال انگیزی کے بعد سرگرمی کے ساتھ مہم میں شریک ہوئے۔ اور وادی بھر میں مزاحمت اور مقابلے کی ایک ایسی فضا پیدا ہو گئی، کہ جس کی گذشتہ پچاس سالہ تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔

سرینگر میں دفعہ ۱۴۴ کے مسلسل نفاذ کی وجہ سے ہر روز جلسے کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے ہم نے گھر گھر جا کر ووٹ مانگنے کی مہم شروع کر دی، لیکن اس میں دقت یہ تھی کہ بیگم صاحبہ جس محلے میں بھی جاتیں، وہاں ہزاروں لوگ جمع

ہو جاتے، اور پھر ووٹ مانگنا تو الگ رہا، وہاں سے واپس نکلنا بھی مشکل ہو جاتا۔ اگر ہم ایک محلے کا پروگرام بناتے تو آناً فاناً سارے شہر میں یہ خبر پھیل جاتی، کہ آج بیگم صاحبہ فلاں محلے میں جا رہی ہیں۔ اور پورا شہر وہاں ٹوٹ پڑتا اور اب دِقت یہ آ رہی تھی، کہ ہر محلے اور ہر علاقے کے لوگوں کا یہ اصرار تھا کہ بیگم صاحبہ ان کے ہاں بھی جائیں۔ وقت کم تھا اور ہم کسی کو ناراض بھی نہیں کرنا چاہتے تھے، اس لیے ۲۴ فروری سے لے کر ۲ مارچ تک ہم نے دن میں بیس بیس جگہوں کا دورہ کیا اور اس کے بعد بھی بہت سے لوگوں کو یہ شکایت رہی، کہ ہم ان کے علاقے میں نہیں گئے۔ بعض اوقات رات کے گیارہ بارہ بجے تک یہ سلسلہ جاری رہتا اور یہ بات بیگم صاحبہ کی تعریف میں کہی جاسکتی ہے کہ مسلسل سفر اور پیہم تقریروں کے باوجود میں نے ان کے چہرے پر کبھی تھکن یا جھنجلاہٹ کے آثار نہیں دیکھے۔ عوامی جوش و خروش اور عقیدت کے بے نظیر مظاہروں نے انہیں ایک نئی ہمت اور حوصلہ عطا کیا تھا، اُنہوں نے چوبیس برس کے بعد عملی سیاست کے خارزار میں قدم رکھا تھا۔ لیکن ان کی رفتار دیکھ کر کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا تھا، کہ وہ نو وارد ہیں۔ پریس کانفرنسوں میں وہ جس اعتماد اور سلیقے سے اخباری نمائندوں کے سوالات کا جواب دیتیں، اُس سے یہ اندازہ ہوتا تھا، کہ عملی سیاست سے دور رہنے کے باوجود بیگم صاحبہ سیاست کے اسرار و رموز سے اچھی طرح واقف ہیں۔ افسوس اِس بات کا ہے، کہ ہماری ریاست میں بیگم عبداللہ جیسی خواتین سیاسیات میں حصہ لینے کی بجائے گھر کی چار دیواریوں میں محبوس ہیں۔ اور

اِس کا نتیجہ یہ ہوا ہے، کہ پچھلے بیس پچیس برسوں میں محترمہ زینب بیگم کے سوا کوئی دوسری خاتون سیاسی میدان میں نظر نہیں آتی۔ اس معاملے میں کشمیر کو ملک کا سب سے پسماندہ علاقہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

☆

(۷)

انتخابات کے موجودہ سسٹم میں پولنگ ایجنٹوں کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔اور کشمیر میں چوں کہ انتخابات کی کوئی روایت نہیں رہی ہے۔اس لیے تجربہ کار پولنگ ایجنٹوں کا ملنا بھی مشکل ہے اور ہمیں دس بیس یا سو کی نہیں، پورے بارہ سو ایجنٹوں کی ضرورت تھی۔ان بارہ سو افراد کا انتخاب کیسے کیا جائے۔یہ سب سے اہم اور نازک مرحلہ تھا۔اور انتخاب کے بعد ان لوگوں کے نام صیغۂ راز میں رکھنے کی سخت ضرورت تھی، کیوں کہ ۱۹۶۷ء میں شوپیان سے ریاستی اسمبلی کا انتخاب لڑتے ہوئے جب میں نے اپنے پولنگ ایجنٹوں کی فہرست بنائی تو دوسرے دن ان سب لوگوں کو قتل کے الزام میں دھر لیا گیا، کون قتل ہوا؟ کس نے قتل کیا؟ یہ کسی نے نہیں پوچھا۔اور اِس تجربے کی بنا پر میں اپنے پولنگ ایجنٹوں کے نام پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔لیکن بارہ سو افراد کے نام صیغۂ راز میں رکھنا ممکن نہ تھا۔تاہم ہم نے اپنے سب ایجنٹوں کو یہ ہدایت کردی کہ وہ ۴ مارچ کی صبح تک روپوش ہو جائیں۔پولنگ ایجنٹوں کا انتخاب ان کی تربیت اور انہیں ضروری ساز وسامان مہیا کرنے میں میرے دوست اونکار ناتھ ترسل۔جی ،ایم باون،سید منظور اور محمد سعید ملک نے رات اور دن ایک کیا۔اور یہ انہی کی محنت اور ریاضت کا نتیجہ تھا کہ

۲ مارچ کی شام تک بارہ سو ایجنٹوں کی فہرست بالکل مکمل تھی۔ انہی دنوں چنڈی گڑھ سے سردار امر سنگھ انبالوی بھی تشریف لائے تھے۔ انبالوی صاحب جیسا سرد دماغ، صلح پسند، شریف اور دور اندیش سکھ میں نے پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔ وہ آئے تھے سنت سنگھ تیغ کی مدد کرنے کے لیے لیکن جب انہوں نے بارہ مولہ میں تیغ صاحب کی کامیابی کے امکانات تاریک دیکھے، تو انہوں نے تیغ صاحب کو دستبردار ہونے پر راضی کرلیا۔ دہلی سے مِس مردوولا سارابھائی نے ٹیلی فون کیا کہ انبالوی صاحب کو انتخابات کا بہت تجربہ ہے اس لیے ممکن ہو سکے تو اس کو روک لو، میں نے ان سے ڈرتے ڈرتے دو تین دن کے لیے ٹھہر جانے کو کہا اور وہ فوراً راضی ہو گئے۔ پولنگ ایجنٹوں کی تربیت اور ان کی حوصلہ افزائی کرنے میں انبالوی صاحب نے نہایت شاندار کام کیا اور ۴ مارچ کو اُنہوں نے بیگم صاحبہ کے ساتھ چرار شریف، پکھر پورہ، چاڈورہ اور بڈگام کا دورہ کر کے اپنی آنکھوں سے حکمران جماعت کی دھاندلیوں اور بے ایمانیوں کا مظاہرہ دیکھا۔ لیکن اس کے باوجود اُنہیں میری کامیابی کا اتنا زبردست یقین تھا، کہ انہوں نے اسی دن شام کو مجھے یہ خوشخبری سُنائی کہ "سرکاری سطح پر بے انتہا بدعنوانیوں اور زیادتیوں کے باوجود آپ تقریباً ساٹھ ستر ہزار ووٹوں کی اکثریت سے جیت جائیں گے"۔ سردار صاحب کا خیال تھا کہ اتنی بھاری تعداد میں ووٹ پڑنے کے بعد چار، پانچ، بلکہ دس ہزار ووٹوں کی چوری بھی کامیاب امیدوار کے امکانات کو متاثر نہیں کر سکتی۔ امر سنگھ انبالوی پنجاب کی بات کر رہے

تھے۔ جہاں چوریوں اور سینہ زوریوں کی بھی ایک حد مقرر ہے۔ انہیں شاید معلوم نہ تھا کہ کشمیر میں انتخابی بے اعتدالیوں اور بدعنوانیوں کی کوئی آخری حد مقرر نہیں۔ یہاں ووٹ جس کے حق میں بھی پڑیں کامیاب وہی ہوتا ہے، جسے سرکار چاہے۔ بخشی صاحب کے دور میں پنڈت جانکی ناتھ بٹ (جج ہائیکورٹ) اور محمد شفیع قریشی (نائب وزیر ریلوے) کے درمیان اسمبلی کی ایک نشست کے لیے مقابلہ ہوا۔ ووٹوں کی گنتی ختم ہوگئی تو قریشی صاحب بھاری اکثریت سے جیت رہے تھے، لیکن جب ریٹرننگ آفیسر کے اعلان کرنے کا وقت آیا تو ان صاحب نے پنڈت جانکی ناتھ بٹ کو کامیاب قرار دیا اور محمد شفیع قریشی اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ یہ کتنی ستم ظریفی کی بات ہے کہ صرف چند سال بعد قریشی صاحب اسی نظام کے ایک ستون بن گئے کہ جس نے احمد کی پگڑی محمود کے سر پر رکھ کر ان کے ساتھ زبردست ظلم کیا تھا، اور اس کے بعد سے وہ اُس زیادتی اور ناانصافی کے وکیل بن گئے ہیں کہ جو ریاستی حکومت اور مرکزی سرکار کی طرف سے ریاستی عوام پر روا رکھی جاتی ہے۔ اننت ناگ کے حالیہ پارلیمانی انتخاب میں انہوں نے اپنے مخالفوں کے ساتھ وہی کچھ کیا، کہ جو چند سال قبل بخشی غلام محمد نے خود ان کے ساتھ کیا تھا۔ بہرکیف میں بات کر رہا تھا، سردار امر سنگھ انبالوی کے حسنِ ظن کی، جو حسن اتفاق سے صحیح ثابت ہوا۔

یہ بات شاید کم لوگوں کو معلوم ہے کہ سرینگر کے پارلیمانی حلقے کے ریٹرننگ آفیسر آغا افتخار احمد، بخشی صاحب کے قریبی رشتہ دار ہیں۔ بخشی

صاحب نے شروع شروع میں اِس رشتہ داری کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور پریذائڈنگ افسروں اور پولنگ افسروں کی لسٹ مرتب کرنے میں اچھی خاصی مداخلت کی۔ آغا افتخار احمد کے ایک ماتحت نے مجھے بتایا، کہ یکم مارچ کو افسروں کی ایک لسٹ مرتب کر کے بخشی صاحب کو بھیج دی گئی ہے، کہ آیا یہ لسٹ انہیں منظور اور مرغوب ہے یا نہیں۔ بخشی صاحب نے اس میں بہت سی تبدیلیاں کیں اور اس کے بعد دوسری لسٹ مرتب ہو گئی۔ لیکن بخشی صاحب اس لسٹ سے بھی مطمئن نہ تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنی ایک لسٹ بھیجی کہ اس لسٹ میں سے پریذائڈنگ اور پولنگ افسر چنے جائیں۔ وقت بہت کم تھا، اس لیے ان کی بھیجی ہوئی لسٹ کو ہی اصلی مان کر پریذائڈنگ اور پولنگ افسروں کے نام احکامات جاری کیے گئے۔ ادھر سرکاری ملازموں کے نام احکامات جاری ہو رہے تھے، اور اُدھر بخشی صاحب کی طرف سے احکامات موصول ہو رہے تھے، کہ فلاں افسر کو بدل کر اس کی جگہ فلاں افسر کو تعینات کر دو اور یہ سلسلہ ۴ مارچ کی صبح تک جاری رہا۔ مسلمان افسروں پر بخشی صاحب کو کوئی بھروسہ نہ تھا۔ اس لیے وہ چُن چُن کر ان کی جگہ کشمیری پنڈتوں کو تعینات کر رہے تھے۔ پریذائڈنگ افسروں اور پولنگ افسروں کی زیادہ تر تعداد جنگلات، ٹوریزم اور اکسائز کے محکموں سے تعلق رکھتی تھی، کیوں کہ ان تینوں محکموں کے سربراہ بخشی صاحب کے قریبی رشتہ دار تھے۔

۲ مارچ کی صبح کو ہی مجھے پتا چل گیا، کہ بخشی صاحب اور ان کے ساتھیوں نے ۶ مارچ کو ''آپریشن بے ایمانی'' کا ایک جامع منصوبہ تیار کیا

ہے۔اس منصوبے کی رو سے اولاً میرے پولنگ ایجنٹوں کو پولنگ مرکزوں میں داخل ہونے سے روک دیا جائے گا اور جہاں جہاں وہ داخل ہو جائیں انہیں کسی بہانے وہاں سے نکال دیا جائے گا۔ پریذائڈنگ افسروں کو ہدایت دی گئی تھی کہ وہ پولنگ ایجنٹوں کو دیے گئے اجازت ناموں کو معمولی اعتراضات کی بنا پر قبول کرنے سے انکار کر دیں۔اس کے بعد یہ فیصلہ ہوا تھا کہ پولنگ مرکزوں پر گڑبڑ کر کے ووٹروں کو ہراساں کیا جائے اور پولنگ افسروں سے کہا گیا تھا کہ ووٹ ڈالنے کی رفتار بے حد سُست رکھیں، تاکہ کم سے کم ووٹ ڈالے جاسکیں۔ عام طور پر افسروں کو یہ ہدایت دی گئی تھی، کہ وہ پولنگ ایجنٹوں کو بیلٹ پیپر اکاؤنٹ دینے سے احتراز کریں، میرے پولنگ ایجنٹوں کو بھاری رقوم دے کر ''خریدنے'' کے لیے بھی اچھی خاصی رقم مخصوص کی گئی تھی۔اس کے علاوہ شہر میں یہ افواہ بھی گشت کر رہی تھی کہ بہت سے پریذائڈنگ افسروں نے ووٹوں کی ایک بھاری تعداد قبل از وقت کچھ ووٹروں میں تقسیم کر دی ہے۔اس خبر کی کوئی تصدیق نہیں ہو سکی، لیکن ووٹنگ کے دن چرار شریف میں محمد یاسین تحصیلدار کو ایک شخص کو ساٹھ کے قریب ووٹ کی پرچیاں دیتے ہوئے دیکھا گیا اور ایک نوجوان نے یہ ووٹ اس کے ہاتھ سے چھین کر ضبط کر لیے۔ مجھے ''آپریشن بے ایمانی'' کا علم ہوا، تو میں نے اسی وقت ایک پریس کانفرنس منعقد کر کے اِس سارے منصوبے کی تفصیلات اخباری نمائندوں کو بتا دیں۔اور دوسرے دن مقامی اخبارات کے ذریعے لوگوں کو بخشی صاحب کے عزائم کا علم ہو گیا، اور لوگ پہلے سے بھی

زیادہ محتاط اور ہوشیار ہو گئے!

۴ مارچ کا دن ہمارے لیے بہت ہی صبر آزما اور تکلیف دہ دن تھا، کئی دنوں کی مسلسل محنت اور مشقت کے بعد ہم نے قابلِ اعتبار، اور کسی قدر تجربہ کار پولنگ ایجنٹوں کی فہرست مرتب کر دی تھی۔ لیکن شام ہوتے ہی یہ اطلاعات موصول ہونے لگیں، کہ بہت سے ایجنٹ گرفتار کر لیے گئے ہیں۔ اب ان کی جگہ نہ صرف نئے ایجنٹ مقرر کرنا تھے، بلکہ ان کو مناسب تربیت بھی دینا تھی۔ اور یہ سب کچھ چند گھنٹوں کے اندر ممکن نہ تھا۔ میرے ساتھی اس صورت حال سے بے حد پریشان تھے۔ اور میں خود بھی مایوس تھا۔ لیکن پریشانی اور مایوسی پولنگ ایجنٹوں کا نعم البدل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے اونکار ناتھ، باون اور محمد سعید نئے ایجنٹوں کی تلاش میں لگ گئے اور رات گئے تک یہ تلاش جاری رہی۔ رات نو بجے کے قریب یہ اطلاع آ گئی کہ دن میں جو جیپ ایجنٹوں کو لے کر بیروہ گئی تھی اِس کا کہیں پتا نہیں۔ کچھ دیر بعد یہ خبر موصول ہوئی کہ بیروہ کے سبھی ایجنٹ گرفتار کر لیے گئے ہیں۔ محمد سعید اور ہلال احمد فوراً دوسری گاڑی میں بیروہ روانہ ہو گئے اور راتوں رات نئے ایجنٹ مقرر کر کے دوسرے دِن صبح سرینگر لوٹ آئے۔ معلوم ہوا کہ بیروہ میں ہمارے سب سے سرگرم اور بااثر کارکنوں کو تھانیدار صاحب نے بغیر کسی وجہ اور بلا کسی وارنٹ کے گرفتار کر لیا۔ اِس قسم کی غنڈہ گردی سارے ملک میں صرف کشمیر میں ہی روا رکھی جا سکتی ہے۔ اور پچھلے بیس بائیس برسوں میں اس غنڈہ گردی کو یہاں قانون کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔

۴ مارچ کی صبح کو آسمان پر خطرناک بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوا میں بھی زمہریر کی سی کیفیت تھی۔ نو بجتے بجتے برفباری شروع ہوگئی اور موسم کے تیور دیکھ کر ایسا لگنے لگا کہ دوپہر تک اچھی خاصی برف جمع ہو جائے گی۔ یہ ہمارے لیے اچھا شگون نہیں تھا۔ اس سے ووٹوں کی فصل کو شدید نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ لیکن اس پر ماتم کرنے کی فرصت کسے تھی۔ میں، میرے ساتھی اور ضلع سرینگر کے لوگ جس گھڑی کا بے صبری کے ساتھ انتظار کر رہے تھے، وہ آن پہنچی تھی۔ اور حق و باطل کے درمیان ایک فیصلہ کن جنگ شروع ہونے والی تھی جس کو کشمیر کی تاریخ نے پورے چوبیس برس تک اپنے آغوش میں پالا تھا۔ وہ کشمیر کی تقدیر بننے کے لیے بے قرار تھی اور سرینگر کے عوام آسمان کی کج روی کے باوجود اپنی کج کلہی کی شان برقرار رکھنے پر مصر نظر آ رہے تھے، پولنگ شروع ہونے سے بہت پہلے پولنگ مرکزوں پر عورتوں اور مردوں کی لمبی لمبی قطاریں لگ گئی تھیں اور موسم کی ناخوشگواری سے بے نیاز ہزاروں لوگ اپنے گھروں سے باہر آ کر پولنگ مرکزوں کے قریب جمع ہو رہے تھے، گزشتہ چوبیس برسوں میں یہ پہلا موقع تھا، کہ سرینگر کے لوگ کسی انتخابی معرکے میں اِس غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کر رہے تھے۔ ورنہ یہاں کی اکثر آبادی نے آج تک ووٹ کی پرچی بھی نہیں دیکھی ہے۔ گذشتہ بیس بائیس برسوں میں اِس ریاست میں جس طور پر انتخابات کا ڈھونگ رچایا گیا، اس سے عام لوگوں کو انتخابات کے نام سے چڑ ہوگئی ہے۔ اور پڑھے لکھے سمجھدار لوگ بددیانتی کے اِس ڈرامے میں حصہ لے کر گناہ گار

بننے کی بجائے اِس سے الگ رہنا ہی پسند کرتے ہیں۔ اس صورتِ حال کا حکمران جماعت کو ہمیشہ فائدہ ہوا ہے۔ اور اس کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ عام لوگ جمہوری نظام سے بدظن ہوکر جمہوری اداروں سے دور ہی رہیں، تاکہ اُس کو اپنے من پسند اور منظورِ نظر امیدوار چننے کا موقع ملے۔ محاذ رائے شماری اور دوسری سیاسی جماعتوں کے بائیکاٹ کی روش نے عام آدمی کو انتخابات کے سارے عمل سے اس درجہ بے نیاز اور متنفر کردیا ہے، کہ اسے انتخابات اور اس کے دور رس نتائج کی اہمیت کا احساس دلانا تقریباً ناممکن بن گیا ہے۔

اس پس منظر میں سرینگر کے لوگوں کی انتخابات میں یہ غیر معمولی دلچسپی بہت سے لوگوں کے لیے حیرت اور میرے لیے مسرت کا باعث بنی ہوئی تھی اور خاص طور پر شہر اور دیہات دونوں جگہ عورتوں کا جوش و خروش دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ شہر کے بہت سے انتخابی مراکز پر عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ اور باوجود اس کے کہ ان میں سے اکثر نے ساری عمر ووٹ کی شکل نہیں دیکھی تھی، ان کے جوش و خروش اور عزم و استقلال سے ان کے سیاسی شعور کا اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا۔ سرینگر کے [illegible]

جو ۱۹۵۳ء سے ۱۹۶۳ء تک کشمیر پر مسلط رہا، اور جس کی بخشی غلام محمد ایک زندہ علامت تھے۔ میں اِس نظام کے خلاف کشمیری عوام کی بیزاری اور بغاوت کی علامت تھا، اور اس مقابلے میں میری ناکامی ایک فرد کی بجائے جمہوریت اور انصاف کی ناکامی متصور ہوتی۔ اسی کشمکش کو بخشی صاحب اور ان کے دوسرے حامیوں نے ہندوستان اور پاکستان کی جنگ قرار دے کر سارے ملک میں یہ غلط فہمی پیدا کر دی تھی، کہ بخشی صاحب کو کسی بھی طرح کامیاب کرانے کی کوشش کریں۔ خوش قسمتی سے بخشی صاحب کا یہ داؤ بھی الٹا پڑ گیا۔ اور ان کی اِس شر انگیز مہم کا کسی نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ ۴ مارچ کو جب میں اور خواجہ غلام محی الدین قرہ شہر کے مختلف پولنگ مراکز کا دورہ کرنے کے لیے گئے، تو ہم نے وہ کچھ دیکھا، کہ جو بقولِ خواجہ صاحب انہوں نے اپنی ساری سیاسی زندگی میں نہیں دیکھا تھا، ان کا اشارہ اس جوش و خروش، ربط و ضبط اور عزم و استقلال کی طرف تھا کہ جس کا مظاہرہ، بازاروں، شاہراہوں اور پولنگ مرکزوں پر ہو رہا تھا۔ برفباری ہو رہی تھی، لیکن برف کی ٹھنڈک سے لوگوں کا جوش و خروش کم ہونے کی بجائے بڑھتا جا رہا تھا، کہ آج کے دِن برف کی تاثیر بھی بدل گئی ہے۔ شہر میں ہر جگہ تسلی بخش طور پر ووٹنگ کا کام جاری تھا، صرف مہاراج گنج اور اسلامیہ سکول کے مراکز سے شکایات موصول ہو رہی تھیں اور یہ دونوں علاقے مولانا مولوی محمد فاروق کے زیرِ اثر ہیں۔

☆

(۸)

میں عبدالرحیم وازہ کو نہیں جانتا اور میں نے شاید اُسے کبھی دیکھا بھی نہیں ہے۔ لیکن ۴ مارچ کو مہاراج گنج کے پولنگ سٹیشن پر اُن کی ''کارکردگی'' کے متعلق جو کچھ سننے میں آیا، اس سے میں نے یہ اندازہ کرلیا کہ عبدالرحیم صاحب معمولی نہیں، غیر معمولی آدمی ہیں۔ ان کا شمار مولانا مولوی محمد فاروق کے خاص عقیدتمندوں میں ہوتا ہے۔ وہ ان کے عقیدتمند ہی نہیں، مشیر خاص بھی ہیں۔ ابتداء سے مسلم کانفرنس سے وابستہ رہے ہیں اور اب عوامی ایکشن کمیٹی کے سرگرم ''رہنما'' ہیں۔ ان کی تعلیمی قابلیت، سیاسی سوجھ بوجھ اور معاملہ فہمی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا، لیکن جو لوگ انہیں قریب سے جانتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ وہ اپنی عملی زندگی میں مولانا فاروق سے زیادہ بخشی صاحب کے قریب ہیں۔ اس انتخاب میں فاروق صاحب کی بائیکاٹ کی اپیل کے باوجود عبدالرحیم وازہ کا بخشی صاحب کا کھلم کھلا ساتھ دینا، اس قربت اور مناسبت کا ثبوت ہے۔ پولنگ شروع ہونے کے فوراً بعد مہاراج گنج سے یہ اطلاعات موصول ہونے لگیں، کہ عبدالرحیم وازہ اپنے چند حواریوں کے ساتھ عام لوگوں کو سخت پریشان کر رہا ہے۔ عورتوں کو فحش گالیاں دی جارہی ہیں۔ اور مردوں کے لیے پولنگ بوتھ میں داخل ہونا

ناممکن بنایا جارہا ہے، ایک عینی شاہد نے بتایا کہ عبدالرحیم وازہ پولنگ بوتھ کے باہر لوگوں کو دھمکا رہا ہے کہ اگر انہوں نے بخشی غلام محمد کے خلاف ووٹ دیا، تو ان کے جان و مال کی خیر نہیں، یہی نہیں، عملی طور پر میرے حق میں ووٹ ڈالنے والوں کو بوتھ کے اندر جانے سے روکا جارہا تھا۔ اور سارے مہاراج گنج کے علاقے میں سخت تناؤ کی کیفیت پائی جاتی تھی۔ اس علاقے میں فاروق صاحب کے حامیوں کی تعداد زیادہ ہے اور ان کے حامی فاروق صاحب کی بائیکاٹ کی اپیل کو نظرانداز کر کے پوری طاقت اور شدت کے ساتھ بخشی صاحب کے حق میں سرگرم تھے۔ اسلامیہ سکول میں بھی 'بکرے' ضبط اور احتیاط کا ہر بند توڑ کر کانگریسی امیدوار کی کامیابی کے لیے ہر ممکن جتن کر رہے تھے۔ پاکستان کو اپنا جذباتی اور فکری کعبہ سمجھنے والے 'بکرے' کی بخشی صاحب کے ساتھ یہ غیر معمولی عقیدت اور وابستگی باعثِ تعجب تو ہے، لیکن ناقابلِ فہم نہیں ہے اِس میں میر واعظ خاندان اور شیخ محمد عبداللہ کی وہ دیرینہ رقابت کام کر رہی تھی، کہ جس نے تحریک حریت کے ساتھ ہی جنم بھی لیا ہے، اور پرورش بھی پائی ہے۔ یہ رقابت دراصل نسل در نسل منتقل ہو کر اب فاروق صاحب کے حصے میں آئی ہے، اور وہ اسے بزرگوں کی امانت کے طور پر سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔

ضلع سرینگر کو ہم نے کل ملا کر چار حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ سرینگر خاص کی نگرانی خواجہ غلام محی الدین قرہ کر رہے تھے اور گاندربل کا علاقہ مولانا مسعودی کے سپرد ہوا تھا۔ بیگم صاحبہ، سردار امر سنگھ انبالوی کے ہمراہ علیٰ الصبح

چرار شریف پکھرپورہ، چاڈورہ اور بڈگام کے دورے پر روانہ ہوگئیں۔
اور میں خود کچھ دیر تک سرینگر کے مختلف پولنگ مرکزوں کا جائزہ لینے کے بعد بیروہ روانہ ہوا۔ برفباری ہورہی تھی اور کہیں کہیں زمین پر برف بھی جمع ہوگئی تھی، لیکن اس ناساز گار موسم کے باوجود ووٹ ڈالنے کی رفتار بہت تیز تھی۔
اور بیروہ کے راستے میں درجنوں پولنگ مرکزوں پر سینکڑوں مرد اور عورتیں، برفباری اور سردی کی پروا کیے بغیر، ووٹ ڈالنے کے لیے لائن لگائے ہوئے تھے۔ میں جہاں جہاں سے گزرا، اکثر لوگوں نے شکایت کی کہ ووٹ ڈالنے میں غیر معمولی تاخیر ہورہی ہے۔ آری پاتھن کے مقام پر سینکڑوں لوگوں نے پریذائڈنگ افسر کے خلاف الزام لگایا، کہ وہ جانبداری کے ساتھ کام کررہا ہے۔ لوگ بے حد مشتعل تھے۔ لیکن میں نے انہیں تسلی دے کر ٹھنڈا کرلیا۔ دن کے تین بجے تک بیروہ کے اندرونی حصوں میں واقع پولنگ مرکزوں کا جائزہ لے کر جب ہم لوٹ رہے تھے، تو ہمارا اندازہ تھا کہ بخشی صاحب کو اس علاقے میں دو ڈھائی ہزار سے زیادہ ووٹ نہیں ملیں گے، لیکن شام ہوتے ہوئے کچھ پریذائڈنگ افسروں اور تحصیلداروں نے ہمارے اندازے کو غلط ثابت کرنے کے لیے اپنا حق ادا کردیا تھا۔ چرار شریف میں بیگم صاحبہ کی آمد سے وہاں کے لوگوں میں ہمت تو بندھ گئی تھی، لیکن اس علاقے میں ایسے ایسے ظالم پریذائڈنگ آفیسر مقرر کیے گئے تھے، کہ جنہوں نے لوگوں کے ہاتھوں سے ووٹ چھین کر بخشی صاحب کے حق میں ووٹ ڈالے، خاص چرار شریف میں پریذائڈنگ آفیسر محمد یاسین اندرابی (تحصیلدار) نے

ہمارے ایجنٹ کو پولنگ بوتھ سے باہر نکال دیا۔ اور اسی طرح چاڈورہ، پکھرپورہ اور چرارشریف کے اندرونی حصوں سے بھی یہ اطلاعات موصول ہوئیں کہ کئی مقامات پر ہمارے پولنگ ایجنٹوں کو پولنگ بوتھ کے اندر گھسنے ہی نہیں دیا گیا۔ لسیجن میں ہمارے ایجنٹ کو پیسے دے کر خریدا گیا۔ اور پانچ سو کے پانچ سو ووٹ بخشی صاحب کے حق میں ڈالے گئے، بدرن (تحصیل بیروہ) کے پولنگ ایجنٹ کو صبح دس بجے گرفتار کر کے شام کو رہا کر دیا گیا۔ چرارشریف اور پکھرپورہ میں سب سے زیادہ دھاندلیاں ہوئیں۔ اور وہاں کے ممبر اسمبلی عبدالقیوم صاحب بذات خود آپریشن بے ایمانی کی نگرانی کرتے رہے۔ چار بجے کے قریب جب میں شہر لوٹا، تو مجھے معلوم ہوا کہ شہر میں ۸۰ فیصد کے قریب ووٹ میرے حق میں پڑے ہیں۔ اور بخشی صاحب کے کیمپ میں سخت مایوسی چھائی ہوئی ہے۔ میں نے شیخ باغ کے پولنگ بوتھ پر اپنا ووٹ استعمال کر کے شہر کے کچھ اندرونی حصوں کا دورہ کیا۔ اور جہاں جہاں سے میں گزرا میں نے عوامی جوش و خروش کے بے نظیر مظاہرے دیکھے۔ اپنا ووٹ استعمال کرنے کے بعد اب لوگوں کو جائز طور پر یہ فکر لاحق تھا، کہ بیلٹ بکس محفوظ رہیں۔ میں اس مرحلے پر یہ اعتراف کرنا چاہتا ہوں، کہ کئی پریذائڈنگ افسروں کی صریح بے ایمانی اور بدکرداری کے باوجود بحیثیت مجموعی سرکاری افسروں کا رول تسلی بخش رہا۔ چھ سو پریذائڈنگ افسروں میں ساٹھ ستر "نمک خواروں" نے ہر ممکن طریقے پر بخشی صاحب کی "مدد" کی، لیکن زیادہ تر افسروں نے ایمانداری اور غیر جانبداری سے اپنے

فرائض انجام دیے اور کشمیر میں سرکاری افسروں کا غیر جانبدار رہنا ایک ایسی غیر متوقع بات ہے، کہ اس کا خاص طور پر ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ بخشی صاحب کے دور میں الیکشن کے ڈرامے کے اصل کردار سرکاری افسر ہی ہوا کرتے تھے۔ صادق صاحب نے بھی اس روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ لیکن اس انتخاب میں بحیثیت مجموعی سرکاری افسر غیر جانبدار رہے اور بخشی صاحب کو اِسی بات کا سب سے زیادہ دُکھ ہے۔ صادق صاحب کے خلاف ان کے الزامات اور ان کی شکایات کا اصل منبع یہ ہے، کہ انہوں نے سرکاری افسروں کو بے ایمانی اور بدعنوانی کی واضح ہدایات کیوں نہیں دیں، شام کو جب جموں و کشمیر بینک میں مختلف علاقوں سے بیلٹ بکس آنا شروع ہو گئے، تو بینک کا منظر دیکھنے والا تھا۔ چاروں طرف اس قدر شور مچا ہوا تھا کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ سرکاری افسر بیلٹ بکس اپنی بغلوں میں دبائے ایک کاونٹر سے دوسرے کاونٹر کی طرف بھاگ رہے تھے۔ یہ وہ خوش قسمت لوگ تھے کہ جن کو وقت پر سرکاری ٹرانسپورٹ مل گیا تھا۔ لیکن اب منزل پر پہنچ کر یہ پریشان تھے کہ کیا کریں، کیوں کہ ان سے بیلٹ بکس وصول کر کے انہیں آزاد کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ اس دوران میں مجمع بڑھتا جا رہا تھا، خدا خدا کر کے الیکشن کی نگرانی کرنے والے عملے نے اپنا کام شروع کر دیا اور رات گئے تک بیلٹ بکسوں کی وصولی کا کام جاری رہا۔ اکثر علاقوں سے یہ شکایت موصول ہوئی کہ پریذائڈنگ افسروں نے ایجنٹوں کو بیلٹ پیپر اکاونٹ دینے سے انکار کر دیا۔ اصل میں بچارے افسروں کو

قاعدے قانون کا علم ہی نہیں تھا۔ اور نہ اُنہوں نے کتاب دیکھنے کی زحمت گوارا کی تھی۔ اسی دن شام کو پریس انفارمیشن بیورو پر ڈپٹی چیف الیکٹورل افسر نے اخباری نمائندوں کو دن بھر کے حالات کے متعلق اطلاعات فراہم کرنے کے لیے مدعو کیا تھا۔ اخبار نویس کی حیثیت سے میں بھی سرکاری اطلاعات حاصل کرنے کے لیے گیا تو معلوم ہوا، کہ ڈپٹی چیف الیکٹورل افسر غائب ہیں۔ وہ کہیں بارہمولہ میں پھنس گئے تھے۔ میں نے موقع غنیمت جان کر وہیں ایک عدد پریس کانفرنس کر ڈالی۔ اور اخبار نویسوں کو دن بھر کی دھاندلیوں کی فہرست مہیا کر دی۔ میں نے چرار شریف اور بدرن میں دوبارہ پولنگ کرنے کا مطالبہ کر کے یہ دعویٰ کیا، کہ میں بخشی غلام محمد کے مقابلے میں جیت رہا ہوں۔ اِس رات بہت دیر میں خواجہ غلام محی الدین قرہ سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے بتایا کہ کس طرح بٹہ مالو کے پولنگ اسٹیشن پر بخشی صاحب کے ایک عزیز بیلٹ بکس لے کر بھاگ رہے تھے، کہ لوگوں نے انہیں پکڑا۔ قرہ صاحب نے مجھے مبارکباد دی کہ تم ساٹھ ہزار ووٹوں سے جیت رہے ہو۔ میں ذاتی طور پر خواجہ صاحب کی اس خوش فہمی میں شریک نہیں تھا، لیکن خواجہ صاحب کی تردید کرنا آسان نہیں۔ اس لیے میں نے دبی زبان سے صرف یہ کہا، ساٹھ ہزار تو نہیں، ہاں پانچ چھ ہزار ووٹوں سے جیت جاؤں گا۔ خواجہ صاحب نے میری اس گستاخی کا بُرا مان کر دعویٰ کیا، کہ اگر آپ پچاس ہزار سے زیادہ ووٹوں سے نہیں جیتے، تو میں آئندہ لفظ ''سیاست'' زبان پر نہیں لاؤں گا خواجہ صاحب کے لہجے میں اِس

درجہ اعتماد اور ان کے اندازے میں اتنی قطعیت تھی، کہ میں نے خاموشی سے ان کے دعویٰ کو تسلیم کر لیا، لیکن اب یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ آخری لمحے تک مجھے ان کی بات کا یقین نہیں آیا۔ حالاں کہ بیلٹ بکسوں نے ان کا اندازہ سو فیصدی صحیح ثابت کر دیا تھا۔ اب کی بار چوں کہ ووٹوں کی گنتی ایک ہفتہ بعد ہونا تھی، اس لیے اب دوسرا مرحلہ یہ تھا، کہ ہفتے بھر کے لیے ٹریجری میں بیلٹ بکسوں کی حفاظت کیوں کر کی جائے۔ یوں تو خزانہ (ٹریجری) سب سے زیادہ محفوظ جگہ سمجھی جاتی ہے۔ لیکن میرا حریف چوں کہ بخشی غلام محمد تھا، اس لیے سب سے محفوظ جگہ بھی میرے لیے غیر محفوظ تھی۔ بخشی صاحب نے اپنے دور میں بیلٹ بکسوں کی ہی نہیں، ٹریجری کے تقدس کی بھی بے حرمتی کی ہے۔ اور عام لوگوں کو ٹریجری کی حفاظت پر بھی اعتماد نہیں رہا ہے۔ اس لیے فیصلہ یہ ہوا کہ ٹریجری کی پورے چوبیس گھنٹے نگہداشت کی جائے اور یہ کام باری باری سب لوگ انجام دیں گے۔ طے یہ ہوا کہ دن بھر کچھ منتخب لوگ دروازے پر بیٹھے رہیں اور رات کو میں خود پہرہ دوں۔

۵ مارچ کو بخشی صاحب نے اخباری نمائندوں کو اپنے ہاں مدعو کر کے انہیں یہ اطلاع دی کہ وہ پارلیمانی الیکشن میں بھاری اکثریت سے جیت رہے ہیں۔ انہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ ''یہ لڑائی دراصل ہندوستان اور پاکستان کی لڑائی تھی اور اس میں پاکستان کو عبرتناک شکست ہوئی ہے۔ اور اب پاکستان کو رائے شماری کے لیے کشمیر کی بجائے کوئی دوسرا علاقہ منتخب کرنا چاہیے۔'' اس انتخابی مقابلے کو ہندوستان اور پاکستان کی جنگ کیوں کر

کہا جا سکتا ہے۔ یہ بات بہت سے لوگوں کے سمجھ میں نہیں آئی، لیکن جو لوگ بخشی صاحب کی سیاست سے واقف ہیں۔ انہیں فوراً اندازہ ہو گیا کہ اس بیان بازی سے ان کا مقصد کیا ہے۔ وہ دراصل مرکزی حکومت پر یہ واضح کر دینا چاہتے تھے۔ کہ اگر اِس انتخابی مقابلے میں انہیں شکست ہو گئی، تو اِس ریاست میں ہندوستان کے کاز کو سخت نقصان پہنچے گا۔ اس لیے مرکزی حکومت کو ریاستی حکومت پر دباؤ ڈال کر بخشی صاحب کو ''جوں توں'' کر کے کامیاب کرانے کی کوشش کرنا چاہیے۔ اپنی کامیابی کا اعلان کر کے وہ دراصل اپنے ساتھیوں کا حوصلہ بلند رکھنا چاہتے تھے۔ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ سرکاری سطح پر ضرور کوئی ایسی کاروائی کی جائے گی کہ جس سے ان کی شکست فتح میں تبدیل کی جا سکے اور اسی لیے وہ بار بار ہندوستان اور پاکستان کا ہوا کھڑا کر رہے تھے!

بخشی صاحب کی اِس پریس کانفرنس نے ہماری صفوں میں اچھی خاصی مایوسی پیدا کر دی اور سب لوگ یہ سوچنے لگے، کہ انہیں جب تک اپنی کامیابی کا پورا یقین نہ ہوتا، وہ اس طرح اعلان نہیں کرتے۔ صرف خواجہ غلام محی الدین قرہ اور مولانا مسعودی اس اعلان سے پریشان نہیں تھے۔ وہ چوں کہ بخشی صاحب کو اچھی طرح سے جانتے اور پہچانتے ہیں۔ اس لیے انہیں اس ''دیدہ دلیری'' پر کوئی حیرت یا تعجب نہیں ہوا۔ انہیں اب بھی میری کامیابی کا سو فیصد یقین تھا۔

☆

(۹)

یوں تو ووٹ ڈالنے کے بعد انتخابی معرکے کا سب سے اہم اور فیصلہ کن مرحلہ طے ہو جاتا ہے۔ لیکن ریاست جموں و کشمیر میں نتائج کا اعلان ہونے تک کوئی بات آخری اور قطعی نہیں سمجھی جاتی، ہمارے گزشتہ سولہ سترہ برسوں میں ایک نہیں کئی بار کامیاب امیدواروں کو ناکام اور ناکام امیدواروں کو کامیاب قرار دینے کی روایت موجود ہے اور اس لیے مجھے بخشی صاحب کی ناکامی کا یقین ہوتے ہوئے بھی اپنی کامیابی کی امید نہیں تھی۔ عام طور پر یہی خیال کیا جاتا تھا کہ مرکزی حکومت بخشی صاحب کو ہر قیمت پر کامیاب کرانے کی کوشش کرے گی، اور اِن کوششوں میں آخری مرحلے ان کی کامیابی کا ناجائز اعلان بھی شامل ہو سکتا ہے۔ بخشی صاحب نے ہندوستان کی فتح اور پاکستان کی شکست کا ہوا کھڑا کر کے ان 'اقدام' کے لیے زمین بھی ہموار کر دی تھی۔ ریٹرننگ افسر آغا افتخار احمد چوں کہ بخشی صاحب کے قریبی رشتہ دار ہیں۔ اس لیے سب سے پہلے ان ہی کی طرف رجوع کیا گیا، اور انہیں ''گڑبڑ'' کرنے کے لیے آمادہ کرنے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔ ایک اطلاع کے مطابق ان سے یہ کہا گیا، کہ وہ خزانے میں محفوظ بیلٹ بکسوں میں ہیرا پھیری کرنے میں تعاون کریں، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو

پھر اس بات کا یقین دلائیں، کہ وہ بہر حال بخشی صاحب ہی کی کامیابی کا اعلان کر دیں گے، آغا افتخار احمد نے خدا اور خلق خدا کے خوف سے اِن دونوں تجویزوں کو ٹھکرا کر بخشی صاحب کا آلہ کار بننے سے انکار کر دیا۔ اور جب دباؤ ناقابلِ برداشت ہو گیا، تو وہ چھٹی لے کر بیٹھ گئے۔ اِدھر شہر میں طرح طرح کی افواہیں اڑنے لگیں۔ اور عام لوگوں میں تشویش اور بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ ایک اطلاع کے مطابق میونسپلٹی کے ایڈمنسٹریٹر معراج الدین پنجابی اور عمر جان اسسٹنٹ کمشنر نے (یہ دونوں صاحبان اسسٹنٹ ریٹرننگ افسر تھے) بخشی صاحب کو یقین دلایا تھا کہ وہ آغا افتخار احمد کی غیر موجودگی میں انہیں ''ممنون احسان'' کریں گے۔ یہ افواہ کچھ اِس زوروں سے پھیل گئی کہ شہر کے مختلف حلقوں میں فوراً ہی پنجابی صاحب کے خلاف نعرے لگنے شروع ہو گئے اور جب تک ووٹوں کی گنتی شروع ہوئی، پنجابی صاحب اور عمر جان کے خلاف عام لوگوں کی بدظنی برقرار رہی۔ مجھے ذاتی طور پر اِس بات کا یقین ہے کہ اِس افواہ میں کوئی صداقت نہیں تھی، لیکن شہر کا ماحول بخشی صاحب کی ''شہرت'' اور آغا افتخار کا عین وقت پر چھٹی لے لینا، اس قسم کی ہر افواہ کو حقیقت بنانے کے لیے کافی تھا۔ ٹھیک ان ہی دنوں بخشی صاحب نے انسپکٹر جنرل پولیس کے نام ایک خط میں یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ ووٹ شماری کے دن ہزاروں لوگ سیاحوں کے استقبالیہ مرکز (جہاں ووٹوں کی گنتی ہونا تھی) پر جمع ہو کر پر امن طریقے پر ووٹوں کی گنتی ناممکن بنائیں گے۔ اِس خطرے کے پیشِ نظر انہوں نے انسپکٹر جنرل پولیس سے مناسب حفاظتی

اقدامات کی درخواست کی یہ تجویز اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کی ایک بالواسطہ ترکیب تھی، کہ جس کا بخشی صاحب کی کامیابی کے ناجائز اعلان سے پیدا ہو جانے کا امکان تھا۔ غرض بخشی صاحب نے بہر حال، بہر طور اپنی کامیابی کا اعلان کرانے کے لیے تمام تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ لیکن یہ سب کچھ صادق صاحب کی رضامندی اور ان کی اجازت کے بغیر ممکن نہ تھا۔ اس لیے انہیں اس منصوبے میں شریک کرنے کے لیے بخشی صاحب کے ایک بہت ''قریبی رشتے دار'' کو ان کے پاس جموں بھیجا گیا۔ ستم ظریفی ملاحظہ کیجیے، کہ بخشی صاحب کا یہ بہت قریبی رشتے دار، صادق صاحب کا ماتحت ہونے کے علاوہ میرا بھی بہت ہی عزیز دوست ہے (تھا)۔ حالات کی سازش اور زمانے کی گردش نے میرے اِس دوست کو ایک ایسی منزل پر کھڑا کر دیا تھا، کہ جہاں دوستی اور دشمنی کی حدیں گڈمڈ ہو کر رہ گئی تھیں۔ میرے دوست نے صادق صاحب کو اِس ناپاک منصوبے میں شریک کرنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن اُسے مایوس لوٹنا پڑا۔ صادق صاحب کی سرد مہری نے بخشی صاحب کو قطعی مایوس کر دیا اور ان کا بنا بنایا کھیل بگڑتا ہوا نظر آنے لگا۔ ادھر جب صادق صاحب کو بخشی صاحب کے ارادوں کا علم ہوا، تو انہوں نے ریٹرننگ افسر آغا افتخار احمد کو ٹیلی فون کیا۔ آغا صاحب نے انہیں بتایا کہ وہ دو دِن سے چھٹی پر ہیں اور انہوں نے ساری ذمہ داری اسسٹنٹ ریٹرننگ افسر کو سونپ دی ہے۔ صادق صاحب کو یقیناً حیرت ہوئی ہوگی۔ اُنہوں نے چھٹی کی وجہ پوچھی تو آغا صاحب نے انہیں ساری صورت حال سے آگاہ

کردیا۔ صادق صاحب نے انہیں فوراً چھٹی منسوخ کر کے اپنی ذمہ داری سنبھالنے کا حکم دیا۔ اِس دوران میں صادق صاحب کو معلوم ہوا کہ ڈویژنل کمشنر احمد سعید قادری بھی چھٹی پر جموں جا رہے ہیں۔ اُنہوں نے قادری صاحب کو بھی چھٹی منسوخ کر کے اپنے فرائض سنبھالنے کی تاکید کی۔ یہ ووٹوں کی گنتی سے قبل ایک دن کا واقعہ ہے۔ اسی روز میں نے چیف الیکشن کمشنر مسٹر سین ورما سے ٹیلیفون پر بات کر کے انہیں اپنے خدشات سے آگاہ کیا۔ مسٹر سین ورما کو بتایا کہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق ووٹوں کی گنتی میں سخت گڑبڑ کی جانے والی ہے۔ میرے بہت سے ووٹ ناجائز طور پر رد کیے جائیں گے اور میرے حریف کو سرکاری مشینری کی مدد سے ہر ممکن طور پر کامیاب کرانے کی کوشش کی جائے گی۔ سین ورما نے مجھے یقین دلاتے ہوئے کہا کہ وہ گنتی کی دیکھ بھال کے لیے کمیشن کے ایک افسر کو کل سرینگر بھیج رہے ہیں۔ میں نے جب انہیں بتایا کہ ریٹرننگ افسر چھٹی پر ہے، توانہیں بے حد حیرت ہوئی اور اُنہوں نے کہا کہ وہ ریٹرننگ افسر سے خود بات کریں گے۔ سین ورما نے آغا صاحب سے بات کی یا نہیں، میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ آغا صاحب اپنی چھٹی منسوخ کر کے اپنے دفتر میں آگئے ہیں۔

۱۰ مارچ کو سیاحوں کا استقبالیہ مرکز ایک فوجی ہیڈ کوارٹر دکھائی دیتا تھا۔ چاروں طرف مشین گن لگے ہوئے تھے اور قدم قدم پر مسلح پولیس پہرہ دے رہی تھی۔ کسی شخص کو سنٹر کے سامنے سے گزرنے کی اجازت نہیں تھی اور سارا

ٹریفک مولانا آزاد روڈ کی طرف Divert کر دیا گیا تھا۔ ۹ مارچ کی شام کو مولانا محمد سعید مسعودی اور خواجہ غلام محی الدین قرہ نے خانقاہ معلیٰ میں شہر کے تمام لوگوں کو تلقین کی تھی، کہ وہ سیاحوں کے استقبالیہ مرکز پر جمع نہ ہوں۔ اور اپنے اپنے گھروں میں انتخابی نتیجے کا انتظار کریں۔ اِس احتیاط کی ضرورت اس لیے پیش آئی، کہ شہر کے لوگ اِس تاریخی مقابلے کا نتیجہ سننے کے لیے اس قدر بے چین اور بیقرار تھے، کہ اگر انہیں مرکز پر جمع ہونے سے روک نہ دیا جاتا۔ تو وہاں چالیس پچاس ہزار لوگوں کا اجتماع ہو جاتا اور اتنے بڑے مجمع کو قابو میں رکھنا یقیناً مشکل ہوتا، اس کے باوجود ہزاروں لوگ علی الصبح میرے گھر پر جمع ہو گئے اور ٹھیک تین دن تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

قاعدے کی رو سے ہر امیدوار کو ایک ایک میز کے لیے ایک ایک ایجنٹ مقرر کرنے کی اجازت تھی اور مرکزی ہال میں چوں کہ ووٹوں کی گنتی کے لیے آٹھ میزیں لگا دی گئی تھیں، اس لیے ہر امیدوار کو آٹھ کاؤنٹنگ ایجنٹوں کی فہرست مہیا کر دینے کے لیے کہا گیا تھا، لیکن ہمیں جلد ہی معلوم ہو گیا کہ بخشی صاحب نے ایک ایک میز کے لیے تین تین ایجنٹ مقرر کر دیے ہیں یہ کیسے ممکن ہو سکا یہ روداد بھی سُن لیجیے۔ میرے اور بخشی صاحب کے علاوہ اِس مقابلے میں پیارے لال کول وکیل، غلام احمد میر، غلام محمد بخشی اور جن سنگھ کے تریلوکی ناتھ در بھی امیدوار تھے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا، کہ پیارے لعل، غلام احمد میر اور غلام محمد بخشی ووٹنگ سے پہلے ہی مقابلے سے دستبردار ہو جائیں گے، لیکن غیر متوقع طور پر یہ تینوں صاحب آخری وقت.

تک ڈٹے رہے۔ غلام احمد میر اور پیارے لال کول نے اپنے گنتی کے ایجنٹوں کی اتھارٹی بخشی صاحب کے ہاتھوں بیچ دی تھی۔ دوسرے الفاظ میں غلام محمد میر اور پیارے لال کے ایجنٹوں کی جگہ بخشی صاحب کے ایجنٹوں نے لی تھی اور اس طرح پورے ہال میں میرے کل آٹھ اور بخشی صاحب کے ۱۲۴ ایجنٹ موجود تھے۔ ووٹ شماری کے دوران بخشی صاحب کے ایجنٹوں نے جو ہلڑ بازی روا رکھی، اُس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ بخشی صاحب نے ''غیر معمولی'' اور ''غیر متوقع'' صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے خصوصی انتظامات کیے ہیں۔ ایجنٹوں کی زیادہ تعداد بخشی صاحب کے بھائیوں، بھتیجوں اور ان کے بہت قریبی دوستوں پر مشتمل تھی۔ اور یہ لوگ ایک اشارے پر گڑبڑ کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ ممبران اسمبلی میں سے صرف چرار شریف کے عبدالقیوم کو بخشی صاحب نے اپنا ایجنٹ بنانے کی سعادت بخشی تھی۔ اور قیوم صاحب نے اِس میدان میں بھی اپنے ''جوہر'' دکھانے کی مقدور بھر کوشش کی۔ کاؤنٹنگ ایجنٹوں کو ''ضروری ہدایات'' دینے کے لیے بخشی صاحب کے برادر بخشی عبدالمجید مقرر تھے۔ اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو بخشی عبدالرشید کے علاوہ بخشی خاندان کا ہر بالغ مرد بطور کاؤنٹنگ ایجنٹ کے کاؤنٹنگ ہال میں موجود تھا۔ ووٹ شماری یوں تو صبح نو بجے شروع ہونا تھی لیکن جو لوگ زبردستی بیلٹ بکسوں کے ساتھ داخل ہوئے تھے اب وہ باہر جانے کے لیے موقع کی تلاش میں تھے، کنگن نے ان کے ساتھ دھوکا کیا تھا۔

☆

(۱۰)

جب حلقہ انتخاب کنگن کے ووٹوں کی گنتی مکمل ہوگئی، تو میں بخشی صاحب کے مقابلے میں چار ہزار ووٹوں سے آگے تھا، شام چھ بجے کے قریب حلقہ خان صاحب کے بیلٹ بکس کھلنا شروع ہو گئے، اور رات کے گیارہ بجے تک ووٹوں کی گنتی جاری رہی۔ اس حلقے میں بھی مجھے اپنے قریبی حریف سے تقریباً دو ہزار ووٹ زیادہ ملے تھے۔ یعنی پہلے دن کی گنتی کے مطابق میں بخشی صاحب کے مقابلے میں چھ ہزار ووٹ سے جیت رہا تھا، لیکن ووٹ شماری کی رفتار اتنی سست تھی، کہ بارہ گھنٹوں میں صرف دو حلقہ انتخاب کے ووٹوں کی گنتی ممکن ہو سکی تھی۔ اس غیر معمولی تاخیر کی ایک وجہ یہ بھی تھی، کہ نتائج کی غیر متوقع "رو" کے پیش نظر بخشی صاحب کے حامیوں نے اپنی حکمت عملی بدل دی تھی۔ شروع شروع میں جب انہیں کامیابی کا یقین تھا، تو وہ جلد از جلد ووٹوں کی گنتی کر کے اپنی فتح و نصرت کا اعلان سننا چاہتے تھے۔ لیکن اب جب کہ بیلٹ بکسوں نے ان کے اندازے غلط ثابت کر دیے تھے تو وہ قدم قدم پر مزاحمت کرنے لگ گئے۔ ایک ایک بیلٹ بکس پر اعتراضات ہونے لگے۔ اس بکس کی مہر توڑ دی گئی ہے۔ اس بکس کا پیپر اکاؤنٹ نہیں ہے۔ فلاں بکس کی مہر پر

پریذائڈنگ افسر کے دستخط نہیں ہیں۔فلاں بکس میں سے دو ووٹ زیادہ اور فلاں میں سے چار ووٹ کم نکلے ہیں۔یہ ''قانونی'' اعتراضات اٹھانے کے لیے بخشی صاحب نے شہر کے ایک بھاری بھرکم وکیل تلکِ راج بھسین کی خدمات حاصل کرلی تھیں۔ریٹرننگ افسر آغا افتخار اس صورت حال سے بے حد پریشان تھے۔ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا، کہ وہ کیا کریں اُنہوں نے اِس مشکل سے نجات پانے کے لیے ہر متنازعہ بیلٹ بکس کے ووٹوں کی گنتی ملتوی کردی اور اِس طرح تقریباً بارہ بکس متنازعہ قرار دے کر الگ رکھے گئے۔آغا صاحب بے حد شریف آدمی ہیں۔اور وہ فریقین میں سے کسی کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔ادھر بخشی صاحب کے وکیلوں اور ان کے ایجنٹوں کے غل غپاڑے سے وہ کافی مرعوب بھی ہو گئے تھے۔دوسرے دن ووٹوں کی گنتی دوبارہ شروع ہوگئی تو بخشی صاحب کے ساتھیوں کا رویہ بالکل ہی مختلف تھا۔وہ بات بات پر دنگہ فساد کرنے کے لیے تیار نظر آتے تھے۔اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ صرف بہانے کی تلاش میں ہیں۔بخشی صاحب کے برادر بخشی عبدالمجید صاحب نے ہال کا پورا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور وہ اس طرح ہال میں دندناتے پھرتے تھے، کہ جیسے وہی ریٹرننگ افسر ہوں۔ایسا معلوم ہورہا تھا کہ بخشی صاحب کے رشتے دار ریٹرننگ افسر کے رویے سے مطمئن نہیں ہیں۔اس لیے وہ ان پر رعب جما کر انہیں خوفزدہ کرنا چاہتے تھے۔لیکن آغا صاحب ایسا کوئی موقع ہی نہیں دے رہے تھے۔بالآخر بخشی صاحب کے چیف ایجنٹ پنڈت روگھناتھ کول نے ایک ایسا

موقع نکال ہی لیا۔ حلقۂ حبہ کدل کی ووٹوں کی گنتی کا کام ہو رہا تھا، کہ ریٹرننگ افسر آغا افتخار احمد کچھ لمحوں کے لیے ہال سے باہر آ گئے۔ وہ جب ہال کے اندر آئے، تو کول صاحب نے ان کے باہر جانے پر اعتراض کیا اور کہا کہ ہم لوگوں کو شبہ ہے، کہ آپ باہر جا کر بیلٹ بکسوں کی نئی مہریں تیار کرواتے ہیں۔ آغا صاحب جیسا بے حد شریف اور دبا ہوا آدمی بھی اپنی یہ توہین، برداشت نہیں کر سکا اور انہوں نے انتہائی غصے کے عالم میں کول صاحب کو تمیز سے بات کرنے کا مشورہ دیا اور اس کے ساتھ ''گیٹ اوٹ'' کا لفظ بھی استعمال کیا۔ بس پھر کیا تھا، پورے ہال میں ایک طوفان بدتمیزی برپا ہوا اور بخشی صاحب کے سبھی رشتے دار اور دوست احباب اس زور زور سے چلانے لگے، کہ خدا کی پناہ! یہ سب لوگ اپنی اپنی نشستوں پر کھڑے ہو کر آغا افتخار کے خلاف تقریریں جھاڑنے لگے۔ ایک کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا، اور تیسرے کے بعد چوتھا۔ بخشی عبدالمجید نے فرمان جاری کر دیا، کہ جب تک ریٹرننگ افسر معافی نہیں مانگے گا۔ ہم ووٹوں کی گنتی نہیں ہونے دیں گے۔ ہم سب لوگ خاموشی کے ساتھ یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ پورے ایک گھنٹے تک ہال میں یہ ہلڑ بازی ہوتی رہی۔ آغا صاحب معافی مانگنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اور بخشی خاندان ان کی معافی کے بغیر ووٹوں کی گنتی پر تیار نہ تھا۔ بالآخر آغا صاحب کو یہ کہنا پڑا، کہ ان کا مقصد کول صاحب کی توہین کرنا نہ تھا، بلکہ وہ جو کچھ کہہ گئے تھے، غصے میں کہہ گئے ہیں۔ اس اظہار کے بعد ووٹوں کی گنتی دوبارہ شروع ہو گئی۔ لیکن صرف کچھ دیر کے لیے! بخشی

صاحب کے حامیوں کو اِس ''فتح'' نے اتنا مغرور بنا دیا تھا کہ اب وہ بات بات پر دنگہ فساد کی دھمکی دینے لگے تھے۔ اور ذرا سی بات پر سب لوگ فوراً کھڑے ہو جاتے تھے۔ اس دن مجھے یہ اندازہ ہوا، کہ اگر اس خاندان کو ایک بار پھر اقتدار نصیب ہو، تو اِس شہر میں شریف لوگوں کے لیے زندہ رہنا کتنا مشکل ہو گا۔ یہ ووٹ شماری کا دوسرا دن تھا۔ لیکن اس دن بھی ہم صرف دو حلقہٗ انتخابات کے ووٹوں کی گنتی مکمل کر سکے تھے، اس حساب سے ووٹوں کی گنتی میں کم از کم ایک ہفتہ لگ جانے کا اندیشہ تھا۔ ادھر شہر میں اس غیر معمولی تاخیر سے بے چینی اور اضطراب بڑھ رہا تھا۔ اور عام لوگ طرح طرح کے اندیشوں میں مبتلا ہونے لگے تھے۔ انہیں یہ شبہ ہو رہا تھا، کہ بخشی صاحب کی شکست کو فتح میں بدلنے کے لیے کوئی خطرناک منصوبہ تیار ہو رہا ہے، اندر کی صورتحال کا میں نے کچھ تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

باہر کی حالت کا احوال ۱۲ مارچ کے روزنامہ ''آفتاب'' کی زبانی سنئیے :-

''سرینگر کے پارلیمانی حلقے میں ووٹوں کی گنتی کا کام داستان الف لیلیٰ کی طرح پر اسرار پیچیدہ اور طویل ہوتا جا رہا ہے۔ اور اس غیر معمولی تاخیر پر لوگوں میں شک و شبہ ہیجان اور غم و غصہ پیدا ہو رہا ہے۔ ملک کے سینکڑوں انتخابی حلقوں میں نتائج کے اعلانات دھڑا دھڑ کیے گئے اور ہر حلقے میں لاکھوں ووٹوں کی گنتی صرف چند گھنٹوں میں مکمل ہو گئی، لیکن سرینگر کے پارلیمانی حلقے میں دو دن ووٹوں کی گنتی جاری رہنے کے بعد صرف پچاس ہزار ووٹ گنے جا سکے ہیں۔ اور اب تک چودہ میں سے صرف چار حلقوں کی

ووٹ شماری ہوسکی ہے.........مولانا محمد سعید مسعودی نے اِس سُست رفتاری پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس حلقے میں ووٹ شماری کا کام اس لیے سُست رفتاری سے ہورہا ہے۔ کہ یہاں کانگریسی امیدوار ہار رہا ہے"۔

جب سے ووٹوں کی گنتی کا کام شروع ہوگیا تھا۔ شہر کا سارا کاروبار معطل ہوگیا تھا۔ تمام لوگوں کی توجہ سیاحوں کے استقبالیہ مرکز پر مبذول تھی۔ ہزاروں لوگ صبح سے شام تک سڑکوں، دکانوں، گھروں، ہوٹلوں اور دفتروں میں انتخابی نتائج کے متعلق قیاس آرائیاں کرتے رہتے بہت سے لوگوں نے سوسو، پانچ پانچ سو اور ہزار ہزار روپے کی "شرطیں" بھی لگا رکھی تھیں۔ میرے دفتر پر صبح سے شام تک ہزاروں لوگوں کا اجتماع رہتا۔ ریڈیو والوں نے کانگریسی امیدوار کو ہارتے دیکھا، تو اُنہوں نے ریڈیو سے سرینگر پارلیمانی حلقے کے متعلق خبریں نشر کرنا ہی بند کردیں۔ اس سے لوگوں کی تشویش میں اور اضافہ ہوگیا۔ اس دن شام میں نے چیف الیکشن کمشنر مسٹر سین ورما کو تار بھی دیا اور ان سے ٹیلیفون پر بات بھی کی۔ میں نے انہیں بتایا کہ کس طرح کاؤنٹنگ ہال میں بخشی صاحب کے حامیوں نے ہلڑ بازی کی، اور اپنے اِس اندیشے کا بھی اظہار کیا، کہ اگر فوری طور سے کمیشن کی جانب سے کوئی نگران سرینگر نہیں آیا تو ووٹ شماری مکمل ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ مسٹر سین ورما نے مجھے بتایا کہ کل ڈپٹی چیف الیکشن کمشنر مسٹر جیکب اور کمیشن کے سکریٹری راج گوپال دونوں ہی آرہے ہیں۔ وہ خود بھی اِس

غیر معمولی ''سست رفتاری'' سے پریشان تھے۔

تیسرے دن بارہ بجے کے قریب ڈپٹی چیف الیکشن کمشنر مسٹر جیکب اور راج گوپالن سرینگر پہنچ گئے۔اب تک حلقۂ حبہ کدل اور حلقۂ چاڈورہ کی گنتی بھی مکمل ہوگئی تھی۔حبہ کدل کے متعلق بھی بخشی صاحب کو کافی خوش فہمی تھی، اور ان کے حامیوں کا خیال تھا، کہ حبہ کدل میں وہ بھاری اکثریت سے جیت جائیں گے۔لیکن کنگن ہی کی طرح حبہ کدل نے بھی دغا دی تھی۔اور یہاں بھی میں بخشی صاحب کے مقابلے میں دو ہزار ووٹوں سے آگے تھا حلقہ چاڈورہ میں بخشی صاحب میرے مقابلے میں تقریباً آٹھ سو ووٹ آگے تھے، لیکن اس کی وجہ یہ تھی، کہ اس حلقے کے کئی بیلٹ بکسوں پر بخشی صاحب کی طرف سے اعتراضات کیے گئے تھے۔اور ان کی گنتی ملتوی کردی گئی تھی۔ مسٹر جیکب کے ہال میں داخل ہوتے ہی پوری فضا بدل گئی۔ اُنہوں نے آنے کے ساتھ ہی کام کا جائزہ لینا شروع کردیا۔سب سے پہلے اُنہوں نے متنازعہ بیلٹ بکسوں کے متعلق فیصلے صادر کردیے۔کہ جن کی تعداد اب چالیس تک پہنچ گئی تھی۔مسٹر جیکب نے ان تمام اعتراضات کو رد کر کے ان ووٹوں کی فوری گنتی کا حکم دے دیا۔بخشی صاحب کے عزیزوں اور وکیلوں نے بڑی بحث کی۔لیکن وہ جیکب صاحب کو قائل نہ کرسکے۔ایک مرحلے پر جب بخشی صاحب کے ایک پہلوان تلک راج بھسین ایڈوکیٹ نے قانون کا حوالہ دے کر مسٹر جیکب کے فیصلے کو چیلنج کیا۔تو مسٹر جیکب نے انہیں بتایا کہ وہ زائد المیعاد قانون ''کا حوالہ دے رہے ہیں۔اور انہیں قانون میں تازہ ترین

ترمیم کا کوئی علم ہی نہیں ہے۔ مسٹر جیکب کے فیصلوں سے بخشی صاحب خود بھی بدحواس ہوگئے۔ اُنہوں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے مسٹر جیکب سے کہا کہ میرا نام بخشی غلام محمد ہے۔ بخشی صاحب کا خیال تھا، کہ یہ نام سُنتے ہی جیکب صاحب چونک جائیں گے، ان کی خدمت میں آداب بجالائیں گے۔ اور انہیں اپنے قریب والی نشست پر بٹھا کر ان سے راز و نیاز کی باتیں شروع کر دیں گے۔ لیکن جیکب صاحب نے صرف یہ کہا، کہ جی ہاں، میں آپ کو جانتا ہوں۔ آپ سے ۱۹۵۷ء میں ملاقات ہوئی تھی''۔ اور یہ کہہ کر اپنے کام میں مشغول ہوگئے۔ اب بخشی صاحب نے مایوس ہو کر کہا کہ ''میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں''۔ ضرور کہیئے''۔ مسٹر جیکب نے جواب دیا ''لیکن پہلے مجھے اپنے کام سے فارغ ہونے دیجیے''۔

اب بخشی صاحب کو یہ اندازہ ہوگیا، کہ مسٹر جیکب کی موجودگی میں ان کی دال نہیں گل سکتی اور انہوں نے گڑبڑ اور ہلڑ بازی کا جو منصوبہ تیار کیا ہے، وہ کامیاب نہیں ہوگا، اس لیے انہوں نے میدان چھوڑ کر بھاگ جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ مسٹر جیکب کے آنے سے پہلے میرے تقریباً چار ہزار ووٹ ریٹرننگ افسر نے ناجائز طور پر رد کر دیے تھے۔ مسٹر جیکب کے آنے سے فوری طور یہ فائدہ ہوگیا، کہ اب میرا کوئی ووٹ ناجائز طریقے پر رد نہیں ہو رہا تھا، کیوں کہ وہ ہر ووٹ کی خود جانچ پڑتال کیا کرتے تھے۔ ان کے آنے سے پہلے ووٹ کے جائز یا ناجائز ہونے کا فیصلہ زیادہ تر بخشی عبدالمجید کی ہدایت پر ہوتا تھا، لیکن اب مجید صاحب کچھ خاموش

خاموش سے نظر آنے لگے۔ ایک مرحلے پر بخشی صاحب نے بہ نفسِ نفیس کچھ بیلٹ بکسوں کے متعلق اعتراضات کیے اور مسٹر جیکب نے اِن اعتراضات کو غیر متعلق اور بے معنی قرار دے کر رد کر دیا تو بخشی صاحب بڑے جلال میں آ گئے لیکن یہ ایک ہارتے ہوئے آدمی کا غصہ تھا، جیتنے والے امیدوار کا جلال نہ تھا۔ جیکب صاحب کے جانبدار رویہ کے خلاف احتجاج کے طور پر انہوں نے ووٹ شماری کا بائیکاٹ کرنے کا اعلان کیا۔ اور اپنے تمام ایجنٹوں کو ہال سے باہر جانے کا حکم دیا۔ خس کم جہاں پاک، ان کے جانے سے ہال میں سکون ہو گیا اور ووٹوں کی گنتی کا کام مسٹر جیکب کی نگرانی میں بڑے اطمینان سے جاری رہا۔ لیکن ابھی پندرہ منٹ بھی نہ ہوئے تھے، کہ بخشی صاحب کے بہت سے عزیز دوبارہ ہال میں داخل ہوتے دکھائی دیے۔ معلوم ہوا کہ بخشی صاحب نے صرف اپنے ''ایجنٹوں'' کو بائیکاٹ کا حکم دیا تھا۔ لیکن غلطی سے پیارے لعل کول اور غلام احمد میر کے ایجنٹ بھی باہر آ گئے تھے۔ اب وہ اپنی غلطی کو محسوس کر کے لوٹ آئے تھے۔ اس دن شام دس بجے تک حلقۂ امیرا کدل، حلقۂ بیروہ، حلقۂ بڈگام، حلقۂ چرار شریف کے بغیر میں تمام حلقوں میں بخشی صاحب سے آگے تھا۔ کل ملا کر اس دن میں ۲۰ ہزار سے زائد ووٹوں سے جیت رہا تھا۔ بخشی صاحب نے کاؤنٹنگ ہال سے فرار کے بعد اخبار نویسوں کو یہ بتایا، کہ وہ ''انتخابی دھاندلیوں'' کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے دہلی جا رہے ہیں۔ اُنہوں نے مقامی پولیس افسروں پر بھی جانبداری کا الزام عائد کیا اور کہا کہ ایک پولیس افسر ٹیکا خان

کی طرح لوگوں کو ڈرا دھمکا رہا تھا۔ بخشی صاحب کی طرف سے دھاندلیوں اور زیادتیوں کا الزام محض ایک بہانہ تھا اور بس...... وہ دراصل باعزت اور باوقار طور پر اپنی شکست تسلیم نہیں کرنا چاہتے تھے!

۱۳ تاریخ کو علی الصبح ووٹوں کی گنتی شروع ہوگئی اور ٹھیک رات نو بجے ریٹرننگ افسر نے میری کامیابی کا اعلان کر دیا، اس دن کے واقعات اور عوامی ردِعمل کی تفصیلات بھی معاصر ''آفتاب'' کے ۱۴ مارچ میں ملاحظہ کیجیے:۔

''چار روز کی مسلسل اور لگا تار ووٹ شماری کے بعد کل شام ضلع سرینگر کے پارلیمانی حلقے کے الیکشن کا فیصلہ ہوگیا اور آزاد ممبر شمیم احمد شمیم ۵۷۸۰۸ ہزار ووٹوں کی اکثریت سے کامیاب ہوکر اس حلقے سے لوک سبھا کے ممبر منتخب کیے گئے۔ پوری ریاست میں اس حلقے کا الیکشن موضوع بحث اور زبردست دلچسپی کا باعث بن گیا تھا، کیوں کہ حکمران کانگریس کے امیدوار اور ریاست کے سابق وزیر اعظم بخشی غلام محمد کے مقابلے میں ایک آزاد امیدوار مسٹر شمیم کو شیخ صاحب اور ان کے تمام حامیوں کی حمایت حاصل تھی۔ یہ انتخاب ضلع سرینگر کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا ایک اہم معاملہ بن گیا تھا۔ بیگم شیخ عبداللہ، مولانا محمد سعید مسعودی اور خواجہ غلام محی الدین قرہ نے مسٹر شمیم کی حمایت میں جو انتخابی مہم چلائی اُس سے اِس ضلع کی پوری آبادی متحرک ہوگئی تھی اور دوسری جانب سے ریاستی کانگریس نے بھی بخشی غلام محمد کی حمایت میں اپنا پورا زور صرف کیا تھا۔ مسٹر شمیم کی کامیابی پر سارا شہر بنگولے سر کرنے سے گونج اُٹھا اور شہر کے تقریباً ہر حلقے میں بنگولے

سر کیے گئے۔ آتش بازیاں چھوڑی گئیں اور چراغاں کیا گیا۔ امیرا کدل، ریذیڈنسی روڈ اور لال چوک میں ہزاروں لوگ نتائج کا انتظار کرتے دیکھے گئے۔ اور اس سے پہلے کبھی بھی اتنی گہما گہمی نہیں دیکھی گئی۔ کامیابی کے بعد ہزاروں لوگوں نے مسٹر شمیم، مسٹر قرہ اور مولانا مسعودی کو مبارکباد دی اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔ خواجہ غلام محی الدین قرہ نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ میں اس کامیابی کو ضلع سرینگر کے عوام کی کامیابی سمجھتا ہوں اور انہوں نے بخشی غلام محمد کو ووٹ آوٹ کر کے پورے کشمیر کی ترجمانی کی ہے۔ قرہ صاحب، مولانا مسعودی اور شمیم احمد شمیم نے کہا ہے کہ اصل میں ضلع سرینگر کے ووٹروں کی کامیابی ہے، انہوں نے اُس خلوص اور اعتماد کا شکریہ ادا کیا ہے، جو ضلع سرینگر کے ووٹروں نے مسٹر شمیم کی کامیابی کے بارے میں ظاہر کیا ہے۔ ہمارے نمائندے کا بیان ہے کہ شہر میں ہر جگہ مسرت کا اظہار کیا گیا اور کئی مقامات پر لوگ رقص کرتے دیکھے گئے۔ ڈلگیٹ میں لوگوں نے ایک سائیکل کو جو کہ مسٹر شمیم کا انتخابی نشان تھا، رنگ برنگی بتیوں سے آراستہ کر کے چراغاں کا مظاہرہ کیا۔ مائسمہ میں خواتین کو بھی رقص کرتے دیکھا گیا۔ رات گئے تک مسرت وشادمانی کا یہ سلسلہ جاری رہا۔

☆

اردو کا نیا قاعدہ

(ا)

الف سے اخبار:- اخروٹ، آلو بخارا، امیرا کدل، اخلاق، او بُرائے پلیس، ادیب۔ انت ناگ، اسلام آباد، آفتاب، آئینہ۔

تفصیل:- اخبار، کشمیر میں ہر معیار کا اخبار مقبول ہے۔ ''اخباری عوام'' کی کمی نہیں ہے۔ لیکن ''عوامی اخبار'' کی کمی ہے۔

اخروٹ:- سیاح تانگہ والوں اور ٹیکسی والوں سے تنگ آکر اسے چباتے ہیں اور ہوٹل میں بیٹھے اور امیرا کدل میں گھومتے ہوئے پوری وادی کی سیر کا لطف لیتے ہیں۔ ایک صاحب کا خیال ہے کہ اخروٹ کی لکیروں کی ترتیب درست کردی جائے تو بہت سے ناکام لیڈروں کی مجرد تصویریں بن جائیں گی۔

امیرا کدل:- صدیوں پرانا پُل۔ کہا جاتا ہے کہ آریوں اور دراوڑوں کی جنگ اسی پل پر ہوئی تھی۔ اس پُل پر بار بار بورڈ لگائے جاتے ہیں کہ بھاری سواریوں کا گزرنا منع ہے لیکن اس پر صرف بھاری سواریاں گزرتی ہیں۔

آلو بخارا:- مٹھاس پر بھی دم نکلے اور کھٹاس پر بھی۔ ایسا آلو جس سے بخار آتے آتے رک جائے اور آجائے تو جاتے جاتے رُک جائے۔ کچھ

ممبران اسمبلی کی محبوب غذا لیکن انہیں کبھی بخار نہیں آتا۔

اخلاق:- یہاں ہر منسٹر کا اخلاق جدا ہے۔ لہٰذا منسٹری کے مجموعی اخلاق پر عجیب وغریب اثرات ہوتے ہیں جب بھی کیبنٹ بنائی جائے ایک ''اخلاقی کمیشن'' بھی مقرر کیا جائے جو ہر منسٹر کے اخلاق کا ''اخلاقی جائزہ'' لیتا رہے اور جب بھی مجموعی اخلاق خطرے میں پڑ جائے تو اخلاقی کاروائی کرے۔ دن کو تارے اسی سے نظر آتے ہیں۔

اُوبرائے پلیس:- کشمیر کا تاج محل ہوٹل۔ باتھ روم اتنا صاف کہ آدمی اپنی صورت پر عاشق ہو جائے۔ جب واپس آئے تو دن رات روتا رہے اور پاگل خانے جائے اور پاگل خانے میں محسوس ہو کہ دراصل وہ ایک بڑے پاگل خانے کے باتھ روم میں پاگل ہوا تھا۔

ادیب:- کشمیر میں ہر سال جتنے سیب پیدا ہوتے ہیں اتنے ہی ادیب جنم لیتے ہیں۔ جس سال سیب کی فصل خراب ہوتی ہے۔ ''ادیب'' کی فصل خراب ہو جاتی ہے۔ (سنا ہے کہ اس سال سیب کی فصل اچھی ہے ،اللہ رحم کرے) کشمیر میں ادیب کی بہت سی قسمیں ہیں۔ اخباری ادیب، ہوٹلی ادیب، منسٹری ادیب، فری تھنکنگ ادیب اور بہت سی قسمیں، کچھ ادیب، ادیب فاضل ہوتے ہیں اور کچھ ادیب کامل، ادیب فاضل، ادیب شاعر ہوتے ہیں یا افسانہ نگار...... ادیب کامل شاعر، افسانہ نگار، خاکہ نگار، مضمون نگار، ناول نگار، تحقیق نگار، مبالغہ نگار، کالم نگار، سب کچھ ہوتے ہیں۔ وہ سائنسی تجربوں پر آئن سٹائن

کی طرح گفتگو بھی کر سکتے ہیں اور سیاست پر بخشی غلام محمد کی طرح تقریریں بھی۔ وہ پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی آسانی سے لے لیتے ہیں اور کشمیری مصالحہ بھی بنا سکتے ہیں۔

انت ناگ (اسلام آباد):- ایک ہی قصبے کے دو نام ...... کہا جاتا ہے کہ یہاں چند نادر ہستیاں پیدا ہوئی ہیں حالاں کہ اس قصبے پر نادر شاہ کا کبھی حملہ نہیں ہوا۔ بعض ہستیاں ایسی ہیں جو خود نہیں جانتیں کہ وہ کیوں پیدا ہوئی ہیں۔

آفتاب:- کتابت اور طباعت جمالیاتی۔ اداریہ معاشرتی اور معاشیاتی، طنز و مزاح حیاتی۔ آخری صفحہ چپاتی۔ خطوط جناتی ...... اشتہارات پہلے صفحہ پر زیادہ احساساتی، قابل مطالعہ اخبار خدمتِ حکومت سے زیادہ خدمت خلق کا خیال۔

آئینہ:- بیسوی صدی کے عجائب گھر میں رکھنے کی عمدہ شئے۔ جس پر گرے وہ بھی شہید اور جو اس پر گرے وہ بھی شہید ...... ایک نگار خانہ جہاں اچھی صورتیں مسخ شدہ نظر آئیں اور مسخ شدہ صورتیں پچکی ہوئی نظر آئیں۔ بے باکی ایسی کہ اقبال کا مردِ مومن کانپ جائے۔ گستاخی ایسی کہ بندۂ خدا بھی گھبرا جائے۔ ایسی دکان جہاں لال مرچ بھی ملتی اور منسٹروں کے کوٹ پتلون بھی سلتے ہوں۔ ایسا "بلیک ہال" جس میں محمود اور ایاز ایک ساتھ بند ہوں۔ ایسی سواری جو سب کے کام آئے۔ ایسا اونٹ جس کی کوئی کل سیدھی نہ ہو، زاویہ قائمہ بھی اور

مثلث بھی۔ ایسا لفظ جو ایک ہی لمحے میں شیریں بھی ہو، اور تلخ بھی۔

تالستائی کا War and peace بھی اور غالب کی خوبصورت غزل بھی۔

ب۔ سے بخشی غلام محمد۔ باقر خوانی۔ بخاری۔ بادام۔ برف باری۔ بارش۔ بس۔

تفصیل:۔

بخشی غلام محمد:۔ کشمیر کے ایک سابق وزیر اعظم جنہوں نے وزیر اعلا بننا کبھی پسند نہیں کیا اور عوام پر اپنا تن، من، دھن سب نچھاور کر دیا اور خود کو تحقیقاتی کمیشن کے حوالے کرتے ہوئے کہا" میرے پاس کیا ہے، جو کچھ ہے وہ سب کچھ جنتا کی دولت ہے۔"

اپنے عہد کے مغل اعظم جنہوں نے سگریٹ کے ڈبے پر (خالی ڈبے پر) ملازمت کے آرڈر دیے اور شام شالیمار میں تان سین کے نغمے سنے، جنہوں نے تین ہزار راجہ ٹوڈرمل جمع کیے اور ان کے لطیفوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ چار ہزار تاج محل بنائے لیکن کسی سے محبت نہیں کی۔ سانولے استالن جو ایک کالے استالن کامراج سے مات کھا گئے۔ بساط سے ہٹے تو جیل گئے، جیل سے نکلے تو سیاست کو خیر باد کہا۔ سیاست سے الگ ہوئے تو دہلی کی سیاحت کی اور سیاحت سے چھٹے تو پھر سیاست کو پسند کیا۔ خاموش بھی رہتے ہیں تو لگتا ہے، جیسے تقریر فرما رہے ہیں۔ کسی اچھے نجومی کی تلاش میں ہیں، تاکہ دونوں ہاتھوں کی لکیروں کو پڑھوا سکیں۔ جب وزیر اعظم ہوئے تھے تو

ایک نجومی نے صرف ان کے ایک ہاتھ کی لکیروں کو پڑھا تھا۔ دونوں ہاتھوں کی لکیروں کو پڑھوا کر کوئی نیک قدم اُٹھانا چاہتے ہیں۔

باقر خوانی:۔ کشمیری بسکٹ:۔ کھایئے اور ہسپتال جایئے۔ تازہ ہو تو قہوے کے ساتھ لطف لیجیے۔ باسی ہو، تو ڈاکٹر علی جان سے معائنہ کے لیے پہلے وقت لے لیجیے۔

بخاری:۔ سردیوں میں امیروں کے لیے نعمت۔ کانگڑی کا جواب الجواب! سنا جاتا ہے کمال احمد صدیقی اس پر غسل کا پانی، کھانا، چائے، ریڈیو، فیچر، اور ڈرامے سب کچھ تیار کر لیتے ہیں۔ انہوں نے اپنی مجرو تصویریں بھی بخاری پر تیار کی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی تازہ نثر نما نظمیں اسی پر تیار کر کے لائے ہیں۔

بادام:۔ بادام کا استعمال کیجیے اور صحت بنایئے، مزید معلومات خوشتر گرامی ایڈیٹر بیسویں صدی سے حاصل کیجیے۔ عوام کو بادام کے لیے بہت دام دینا پڑتا ہے۔ لہٰذا عوام اس سے دور رہیں۔ اس وقت تک جب تک کہ مہنگائی الاؤنس اور نہ بڑھ جائے۔

برف باری:۔ کشمیر میں برف باری کے موضوع پر جغرافیہ کے کسی استاد سے رجوع کریں۔ اس سلسلے میں حکومت کشمیر کی منظور شدہ جغرافیہ کی کتابیں نہ پڑھیں ورنہ برف باری کا لطف جاتا رہے گا۔ ممکن ہے کہ ان کتابوں میں یہ لکھا ہو کہ مارواڑ میں بہت برف گرتی ہے۔

بارش:۔ بہار میں برسات، خزاں میں برسات، برسات میں برسات

منسٹروں کے تیور جب زیادہ بگڑتے ہیں تو بارش زیادہ ہوتی ہے۔ وزیرِ سیر وسیاحت کو آل انڈیا کانفرنس منعقد کر کے دونوں (برسات اور منسٹر) کے تیوروں کا بخوبی جائزہ لینا چاہیے ورنہ سیاحوں کی آمد ورفت خطرے میں پڑ جائے گی۔ بمبئی میں بارش کی ضرورت ہے۔ اگر کشمیر سے برسات نہیں جاسکتی تو اپنے بگڑے ہوئے تیوروں کے ساتھ منسٹر تو جاسکتے ہیں۔

بس :- کشمیر میں ہر جگہ، ہر راستے پر، ہر کوچے میں بس دوڑتی ہے اور کبھی کبھی دیوار توڑ کر گھروں میں بھی گھس جاتی ہے اور مکان اور آدمی دونوں کو شہید کرنے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔ سائنسی اور اقتصادی نقطۂ نظر سے بس یہ ثابت کرتی ہے کہ حادثے زندگی کے لیے ضروری ہیں۔ فیملی پلاننگ سے زیادہ بسیں آبادی کو کم کر رہی ہیں۔ لُوپ یا بس! دونوں میں کسی ایک کو رکھا جائے یعنی کسی ایک کی خدمات حاصل کی جائیں......تاکہ آبادی کم سے کم تر ہو جائے۔

(باقی آئندہ)

☆

ماسٹر صاحب کے قلم سے

اُردو کا نیا قاعدہ

(۲)

بچو! الف اور ب تک تو تم پڑھ چکے ہو، آج میں تمہاری جان پہچان 'پ' سے کراؤں گا، مجھے یقین ہے کہ پچھلا سبق تم نے اچھی طرح بھلا دیا ہوگا۔ ہاں تو "پ" سے پاکستان، پاگل خانہ، پاجامہ (پتلون) پمپوش، پیار، پیارا سنگھ، پیارے لعل ہنڈو، پیسہ۔

پاکستان:- ایک اسلامی ملک جس پر بیک وقت امریکہ اور چین حکومت کرتے ہیں۔ یہاں پر جھوٹ بکثرت پایا جاتا ہے۔ اس لیے جھوٹ کے بڑے بڑے کارخانے قائم ہیں، یہاں کے حکمران جھوٹ کا بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ پچھلے اٹھارہ برس سے ملک بھر میں ایک سخت مہلک بیماری پھیلی ہوئی ہے۔ جس کا نام "کشمیر" ہے یہاں کے اکثر سیاستدان اور حکمران اس بیماری کا شکار ہیں۔ مریضوں پر کبھی کبھی ہذیان کی کیفیت بھی طاری ہو جاتی ہے۔ یہ ملک بیک وقت مشرقی اور مغربی ہے یعنی نہ گھر کا نہ گھاٹ کا! ریاست جموں وکشمیر کو فوجی طاقت کے بل بوتے پر حاصل کرنے کا خواب دیکھنا یہاں کے حکمرانوں کا محبوب مشغلہ ہے۔

پاگل خانہ:- پاگل خانہ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں پاگلوں کو رکھا جائے۔

اس لحاظ سے یہ ریاست ایک وسیع پاگل خانہ ہے۔ یہاں قسم قسم کے پاگل رہتے ہیں یعنی سیاسی پاگل، مذہبی پاگل، اخلاقی پاگل، سماجی پاگل، معدنیاتی پاگل، نباتاتی پاگل، کچھ پاگل زیادہ پاگل ہونے کی وجہ سے وزیر بھی بن گئے ہیں۔ کچھ اچھے بُرے بھلے لوگ اس پاگل خانے میں رہتے رہتے پاگل ہوگئے ہیں۔ کیوں کہ پاگل ہوئے بغیر اس پاگل خانے میں رہنا ممکن نہیں۔

پاجامہ (پتلون) :- پاجامہ اور پتلون ایک دوسرے کے ہم زلف ہیں۔ جدید تہذیب کی بدولت ان میں فرق کرنا مشکل ہوگیا ہے۔ پاجامہ پرانے وقتوں میں تن کی عریانی کو چھپانے کے لیے استعمال ہوتا تھا، آج کل یہ اُٹھتی جوانی کو نمایاں کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ پاجامے کی ایک قسم شلوار ہے۔ جو خالص تلوار ہوتی جارہی ہے۔ اسے عام طور پر لڑکیاں استعمال کرتی ہیں۔ بیوقوف اور سادہ لوح آدمی کو بھی پاجامہ کہتے ہیں۔

پمپوش :- پمپوش جھیل ڈل میں اُگنے والا ایک پھول ہے لیکن شاعروں، ہانجیوں اور ہوٹل والوں نے اسے اپنے باپ دادا کی جائیداد سمجھ لیا ہے۔ یہ پھول بہت ہی خوبصورت ہوتا ہے۔ لیکن اس کے نام سے منسوب ہونے والی ہر چیز کا انجام بُرا ہوتا ہے۔ مثلاً رسالہ پمپوش، جو صرف دو مہینے کے لیے زندہ رہ سکا۔ فلم پمپوش جس کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔ ہوٹل پمپوش، جو ایک غمگین بیوہ کی طرح اپنے

مالک کو اس کی بیچارگی کی یاد دلا رہا ہے۔

پیار:- پیار ایک عجیب و غریب بیماری کا نام ہے۔ عام طور پر نوجوانوں کو لگ جاتی ہے لیکن اس دور میں زیادہ تر عمر رسیدہ لوگ ہی اس کا شکار ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگ اس کا بیوپار بھی کرتے ہیں ہمارے ملک میں یہ بیماری، جسے اب ایک صنعت کا درجہ حاصل ہو چکا ہے بڑے زوروں پر ہے۔ یہاں کا ہر آدمی چاہے اسے دو وقت روٹی نصیب ہو یا نہیں، پیار کیے بغیر نہیں رہتا۔ سرینگر میں کچھ نوجوان پیار کرنے کے علاوہ کچھ اور کرتے ہی نہیں۔ ایسی بھی مثالیں موجود ہیں، جہاں باپ بیٹا ایک ہی لڑکی سے پیار کرتے ہیں۔ اگلے زمانے میں پیار مفت ہوتا تھا، آج کل پیار کرنے میں بڑا پیسہ صرف ہوتا ہے۔ میں بھی پیار کرتا ہوں، اب تم سے کیا چوری!

<u>پیارا سنگھ</u>:- یہ صاحب اپنے نام کے ساتھ میجر یعنی بالغ لکھتے ہیں تا کہ لوگوں کو ان کو بلاغت کا یقین آجائے۔ آدمی شریف ہے، لیکن ضرورت سے زیادہ لمبا ہے، اس لیے عقلمند ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ کہتے ہیں کہ راجپوت ہے، مگر راجپوتوں والی کوئی بات ہمیں نظر نہ آئی۔ ریاستی کابینہ میں وزیر ہے۔ لیکن نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ سب کی سنتا ہے، اس کی کوئی نہیں سنتا، معلوم ہوا ہے کہ دن بھر دفتر میں سوتا رہتا ہے۔ آئندہ پانچ سال کے لیے پھر وزیر بننا چاہتا ہے۔ لیکن بے چارے کے حالات خراب ہیں۔

پیارے لال ہنڈو:- بے انتہا پیارا آدمی ہے۔ ''ذہین اور سمجھ دار ہونے کے باوجود بے وقوف'' ہے یعنی ہر دور میں پٹتا ہے پہلے صادق صاحب کا آدمی ہونے کے ناطے بخشی صاحب کے ہاتھوں پٹتا تھا، اب صادق صاحب کے ہاتھوں بخشی صاحب کا معتمد ہونے کے جرم میں پٹتا ہے اور مجھے یقین ہے عمر بھر پٹتا رہے گا۔ آدمی پڑھا لکھا ہے لیکن صحبت جاہلوں سے رکھتا ہے۔ پیتا خوب ہے لیکن کسی کو پلاتا نہیں، اعتقاداً کمیونسٹ ہے لیکن ضد میں آ کر سامراجی ہو گیا ہے۔ رہتا اننت ناگ میں ہے لیکن ملنا ہو تو سرینگر میں مل سکتا ہے۔ بے پناہ شخص پرست اور دوست نواز ہے (مہمان نواز نہیں ہے) پیشہ سیاست لیکن کبھی کبھی وکالت کرتا ہے۔ آدمی بے انتہا مخلص اور مفلس ہے۔

پیسہ:- پیسے کے بارے میں تمہیں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ مجھے یقین ہے کہ تم اس کے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتے ہو گے۔

☆

۱۹۷۱ء

پارلیمنٹ

ایک تعارف (۱)

مارچ ۱۹۷۱ء کے وسط مدتی چناؤ کے بعد پارلیمنٹ کا نقشہ اس قدر بدل گیا ہے کہ جن لوگوں نے اس سے قبل پارلیمنٹ کی کاروائی کا مشاہدہ نہ کیا ہو، ان کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل ہوگا کہ ۱۹۶۷ء کی پارلیمنٹ موجودہ پارلیمنٹ سے کس درجہ مختلف ہے۔ میں پچھلے دس سال کے دوران جب بھی دہلی جاتا، تو اپنے وقت کا بیشتر حصہ پارلیمنٹ کی کاروائی کا مشاہدہ کرنے میں صرف کرتا۔ بعض اوقات یہ بھی ہوا ہے کہ میں صرف پارلیمنٹ کی کاروائی دیکھنے کے لیے دہلی گیا۔ خاص طور پر حکمران کانگریس کی تقسیم کے بعد پارلیمنٹ کی کاروائی سے میری دلچسپی اور زیادہ بڑھ گئی۔ اور اِس کے بعد پارلیمانی اکھاڑے میں پہلوانوں کی کشتی دیکھنا میرا محبوب مشغلہ بن گیا۔ ۱۹۶۹ء میں مسز اندرا گاندھی کو کانگریس سے خارج کرنے کے بعد رام سبھاگ سنگھ کی قیادت میں جب پہلی بار پرانی کانگریس کے ممبر مخالف بینچوں پر بیٹھے ہوئے نظر آئے، تو میں ایوان میں موجود تھا۔ اس دن سب سے پہلے حکومت کے خلاف رباط کے سوال پر عدم اعتماد کی تحریک پر بحث ہونے والی تھی۔ ایوان میں ہی نہیں پورے ملک میں ایک Suspense کی سی

کیفیت پائی جاتی تھی۔ حکمران جماعت میں اختلاف اور انتشار کے بعد یہ اندرا سرکار کی پہلی آزمائش تھی۔ اور خود مسز گاندھی کو بھی معلوم نہ تھا، کہ کیا ہونے والا ہے۔ مسلسل آٹھ گھنٹوں کی بحث کے بعد جب تحریک پر ووٹ لیے گئے، تو اندرا گاندھی نے اپنے مخالفوں پر ایک فیصلہ کن فتح حاصل کرلی اور یہ بات صاف ظاہر ہوگئی، کہ نجلنگپا کانگریس کے ساٹھ ممبروں کی بغاوت کے باوجود اندرا سرکار کو کوئی فوری خطرہ لاحق نہیں ہے۔ اس کے بعد وسط مدتی چناؤ کا اعلان ہونے تک پارلیمنٹ میں ہنگامے ہوئے اور دیکھنے والوں کے لیے اچھی خاصی تفریح کا سامان رہا۔ مخالف بینچوں پر ناتھ پائی مدھو لیمائے، پرکاش ویر شاستری پروفیسر رنگا، مسٹر مسانی، کامریڈ ڈانگے، ہیرن مکرجی، اٹل بہاری باجپائی، اشوک مہتہ، مرارجی ڈیسائی اور تارا کیشوری سنہا جیسے پارلیمنٹرین موجود تھے اور اس کے مقابلے میں سرکاری بنچوں پر کوئی ایسی قابلِ ذکر ہستی نہ تھی، کہ جسے ان کا توڑ کہا جا سکتا، خود اندرا گاندھی کی حالت بھی قابلِ رحم تھی۔ وہ زیادہ تر خاموش ہی رہتیں۔ مخالفوں نے اسے ''گونگی گڑیا'' کا خطاب دے رکھا تھا۔ اور کبھی کبھار جب وہ زبان کھول بھی لیتیں، ان پر فقرے کسے جاتے اور اتنا شور وغُل مچ جاتا، کہ کئی بار بچاری کو پوری بات کہے بغیر بیٹھ جانا پڑتا۔ حکومت تو بہر حال اندرا گاندھی ہی کر رہی تھیں، لیکن پارلیمنٹ پر مکمل طور پر مخالفوں کا قبضہ تھا۔

یہ صورتحال برابر دسمبر ۱۹۷۰ء تک قائم رہی اور پھر جنوری ۱۹۷۱ء میں پارلیمنٹ کو توڑ کر نئے چناؤ کا اعلان کر دیا گیا۔ نئے چناؤ کے نتائج نے

پورے ملک میں ایک نئی صورتحال پیدا کردی۔اور پارلیمنٹ کا نیا چہرہ ان لوگوں کے لیے تقریباً نا قابل شناخت بن گیا، کہ جو پچھلی پارلیمنٹ سے بخوبی آشنا تھے۔یہ انتخاب نہیں انقلاب تھا، اور اِس انقلاب نے اندرا گاندھی کی حکومت کو صرف استحکام ہی نہیں بخشا، اُسے پورے ملک کی تقدیر بنا دیا۔اسی انقلاب کی ایک رو نے مجھے بھی پارلیمنٹ کی وزیٹرس گیلری سے اُٹھا کر پارلیمنٹ میں بٹھا دیا اور پچھلے پانچ ماہ سے میں ساحل سے نہیں، سمندر سے طوفان کا نظارہ کر رہا ہوں!

آج پارلیمنٹ کی فضا ہی نہیں، دنیا بھی بدلی ہوئی ہے۔مخالف بینچوں پر ناتھ پائی، مدھو لیمائے ، پرکاش ویر، مسانی، تارا کیشوری سنہا، ایم، ایل سوندھی، کامریڈ ڈانگے اور اشوک مہتہ کی جگہیں خالی پڑی ہوئی ہیں۔یہ ساری توپیں حالیہ انتخاب میں کچھ اس طرح لڑھک گئیں، کہ خود ان کے مخالفوں کو بھی حیرت ہوئی، کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ناتھ پائی کا شمار ہندوستانی پارلیمنٹ کے بہترین مقرروں اور نکتہ دانوں میں ہوتا تھا، لیکن ان کے لیے انتخاب سے پہلے ہی بلاوا آ گیا۔اور وہ اپنی انتخابی مہم کے دوران ہی انتقال کر گئے جو باقی رہ گئے تھے انہیں شریمتی گاندھی نے ذبح کر کے رکھ دیا۔جن سنگھ کے بچارے بلراج مدھوک اتنے ہواس باختہ ہو گئے، کہ انہیں اس غیر متوقع اور غیر معمولی کامیابی میں کسی کیمیائی عمل کا ہاتھ نظر آنے لگا۔لے دے کے ایک اٹل بہاری باجپائی اور دوسرے مرارجی ڈیسائی بچ نکلے۔مرارجی ڈیسائی آئے بھی تو اس طرح کہ ان کا آنا، نہ آنا برابر ہے۔ان کی

کیفیت پائی جاتی تھی۔ حکمران جماعت میں اختلاف اور انتشار کے بعد یہ اندرا سرکار کی پہلی آزمائش تھی۔ اور خود مسز گاندھی کو بھی معلوم نہ تھا، کہ کیا ہونے والا ہے۔ مسلسل آٹھ گھنٹوں کی بحث کے بعد جب تحریک پر ووٹ لیے گئے، تو اندرا گاندھی نے اپنے مخالفوں پر ایک فیصلہ کن فتح حاصل کرلی اور یہ بات صاف ظاہر ہوگئی، کہ نجلنگپا کانگریس کے ساٹھ ممبروں کی بغاوت کے باوجود اندرا سرکار کو کوئی فوری خطرہ لاحق نہیں ہے۔ اس کے بعد وسط مدتی چناؤ کا اعلان ہونے تک پارلیمنٹ میں ہنگامے ہوئے اور دیکھنے والوں کے لیے اچھی خاصی تفریح کا سامان رہا۔ مخالف بینچوں پر ناتھ پائی مدھو لیمائے، پرکاش ویر شاستری پروفیسر رنگا، مسٹر مسانی، کامریڈ ڈانگے، ہیرن مکرجی، اٹل بہاری باجپائی، اشوک مہتہ، مرارجی ڈیسائی اور تارا کیشوری سنہا جیسے پارلیمنٹرین موجود تھے اور اس کے مقابلے میں سرکاری بنچوں پر کوئی ایسی قابلِ ذکر ہستی نہ تھی، کہ جسے ان کا توڑ کہا جا سکتا، خود اندرا گاندھی کی حالت بھی قابلِ رحم تھی۔ وہ زیادہ تر خاموش ہی رہتیں۔ مخالفوں نے اسے ''گونگی گڑیا'' کا خطاب دے رکھا تھا۔ اور کبھی کبھار جب وہ زبان کھول بھی لیتیں، ان پر فقرے کسے جاتے اور اتنا شور و غُل مچ جاتا، کہ کئی بار بچاری کو پوری بات کہے بغیر بیٹھ جانا پڑتا۔ حکومت تو بہر حال اندرا گاندھی ہی کر رہی تھیں، لیکن پارلیمنٹ پر مکمل طور پر مخالفوں کا قبضہ تھا۔

یہ صورتحال برابر دسمبر ۱۹۷۰ء تک قائم رہی اور پھر جنوری ۱۹۷۱ء میں پارلیمنٹ کو توڑ کر نئے چناؤ کا اعلان کر دیا گیا۔ نئے چناؤ کے نتائج نے

پورے ملک میں ایک نئی صورتحال پیدا کردی۔ اور پارلیمنٹ کا نیا چہرہ ان لوگوں کے لیے تقریباً نا قابل شناخت بن گیا، کہ جو پچھلی پارلیمنٹ سے بخوبی آشنا تھے۔ یہ انتخاب نہیں انقلاب تھا، اور اِس انقلاب نے اندرا گاندھی کی حکومت کو صرف استحکام ہی نہیں بخشا، اُسے پورے ملک کی تقدیر بنا دیا۔ اسی انقلاب کی ایک رو نے مجھے بھی پارلیمنٹ کی وزیٹرس گیلری سے اُٹھا کر پارلیمنٹ میں بٹھا دیا اور پچھلے پانچ ماہ سے میں ساحل سے نہیں، سمندر سے طوفان کا نظارہ کر رہا ہوں!

آج پارلیمنٹ کی فضا ہی نہیں، دنیا بھی بدلی ہوئی ہے۔ مخالف بینچوں پر ناتھ پائی، مدھو لیمائے، پرکاش ویر، مسانی، تارا کیشوری سنہا، ایم، ایل سوندھی، کامریڈ ڈانگے اور اشوک مہتہ کی جگہیں خالی پڑی ہوئی ہیں۔ یہ ساری توپیں حالیہ انتخاب میں کچھ اس طرح لڑھک گئیں، کہ خود ان کے مخالفوں کو بھی حیرت ہوئی، کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ ناتھ پائی کا شمار ہندوستانی پارلیمنٹ کے بہترین مقرروں اور نکتہ دانوں میں ہوتا تھا، لیکن ان کے لیے انتخاب سے پہلے ہی بلاوا آ گیا۔ اور وہ اپنی انتخابی مہم کے دوران ہی انتقال کر گئے جو باقی رہ گئے تھے انہیں شریمتی گاندھی نے ذبح کر کے رکھ دیا۔ جن سنگھ کے بچارے بلراج مدھوک اتنے ہواس باختہ ہو گئے، کہ انہیں اس غیر متوقع اور غیر معمولی کامیابی میں کسی کیمیائی عمل کا ہاتھ نظر آنے لگا۔ لے دے کے ایک اٹل بہاری باجپائی اور دوسرے مرارجی ڈیسائی بچ نکلے۔ مرارجی ڈیسائی آئے بھی تو اس طرح کہ ان کا آنا، نہ آنا برابر ہے۔ ان کی

حالت ایک ایسے پرندے کی ہے، کہ جس کے بال و پر کاٹ کر اسے اڑنے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہو۔ وہ اولاً پارلیمنٹ آتے ہی نہیں ہیں۔ آتے بھی ہیں تو ایوان کی آخری نشستوں پر کچھ دیر کے لیے بیٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ ایک اٹل بہاری باجپائی ہیں، کہ جو سنسکرت آمیز ہندی بول بول کر اپنے دل کا غبار نکال رہے ہیں۔ باجپائی جی بہت اچھے مقرر ہیں، اور ایک اچھے پارلیمنٹرین بھی، لیکن ان کی حالت اب ایک ایسے بینڈ ماسٹر کی ہے، کہ جو اکیلے بینڈ بجا رہا ہو۔ پورے ایوان میں ان کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں۔ اور ان کی اپنی جماعت میں کوئی ایسا ساتھی نہیں ہے، کہ جو ان کے ساتھ طبلے پر سنگت کر سکے! جو حال باجپائی جی کا ہے وہ تقریباً ساری اپوزیشن کا ہے۔ ساری اپوزیشن ایک ساتھ ہو کر بھی اس سیلاب کا مقابلہ نہیں کر سکتی، کہ جو سرکاری بنچوں پر بکھرا ہوا نظر آتا ہے۔ پہلے حکمران جماعت کی آواز حزب مخالف کے شور شرابے میں ڈوب جایا کرتی تھی، اب اس کے بالکل الٹ ہوتا ہے۔ اب مخالف بنچوں سے کوئی ناگوار آواز سنائی دینے لگے تو اسے حکمران جماعت کے ممبر اپنے شور وغل میں غرق کر دیتے ہیں۔ ایک تو پہلے کے مقابلے میں حزب مخالف کی تعداد کم ہے۔ دوسرے مختلف گروپوں میں اتحاد عمل کا بھی کوئی امکان نہیں۔ بہت کم ایسے مواقع آتے ہیں کہ جب ساری اپوزیشن متحد ہو کر حکومت کے خلاف صف آراء ہو جائے۔ ورنہ عام طور پر حکومت کو حزب مخالف کے کسی نہ کسی گروپ کی حمایت بھی حاصل ہو ہی جاتی ہے۔

حزب مخالف میں سب سے بڑا گروپ کمیونسٹ (مارکسسٹ) کا

ہے۔ پچھلی پارلیمنٹ میں یہ درجہ سوتنتر پارٹی کو حاصل تھا۔ اس گروپ کے لیڈر مشہور کامریڈ اے، گوپالن ہیں۔ گوپالن اچھے مقرر نہیں ہیں، وہ عام طور پر اپنی تقریر لکھ کر لاتے ہیں۔ اور پڑھتے ہیں۔ ان کی صحت بھی اچھی نہیں ہے۔ اس لیے وہ پارلیمنٹ کی کاروائی میں زیادہ حصہ بھی نہیں لیتے۔ اس کے مقابلے میں ان کی پارٹی کے جیوتی موئر باسو پارلیمنٹ کے سب سے زیادہ متحرک ممبر ہیں۔ مسٹر باسو پچھلی پارلیمنٹ کے ممبر بھی تھے اور انہیں پارلیمانی قواعد وضوابط پر پورا عبور حاصل ہے۔ وہ حکومت پر تنقید کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اور عام طور پر ان کی تنقید بڑی کڑوی ہوتی ہے۔ وہ اکثر سرکاری بنچوں کو پریشان اور مشتعل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ باسو بہت ہی نڈر اور بے خوف آدمی ہیں۔ اور وہ بعض اوقات سارے ایوان سے ٹکر لینے میں بھی جھجھک محسوس نہیں کرتے۔ بجٹ اجلاس کے شروع میں جب میں نے ممبران پارلیمنٹ سے شیخ صاحب پر پابندی ہٹائے جانے کے میمورنڈم پر دستخط کرنے کی درخواست کی، تو باسو پہلے ممبر تھے، کہ جنہوں نے نہ صرف اپنے دستخط کیے، بلکہ اپنی پارٹی کے دوسرے ممبروں سے بھی دستخط کروائے۔

دوسرا بڑا گروپ ڈی، ایم، کے کا ہے اور اس کے لیڈر کے، منوہرن ہیں۔ یہ پارٹی اب صحیح معنوں میں اپوزیشن پارٹی نہیں رہی ہے۔ یہ تمام ملکی معاملات کو تامل ناڈو کے نقطۂ نظر سے دیکھتی ہے اور عام طور پر حکمران جماعت کی حمایت کرتی ہے۔ مسٹر منوہرن بہت اچھے مقرر اور سلجھے ہوئے

سیاستدان ہیں۔ وہ کسی بات پر حکومت کی مخالفت بھی کرتے ہیں، تو اس انداز سے کہ اس پر حمایت کا گمان ہونے لگتا ہے۔ مرکزی لیڈر شپ چوں کہ ان کے ہر مطالبے کو مان لیتی ہے، اس لیے ڈی، ایم، کے کو ہنگامہ آرائی کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔ اس گروپ میں مسٹر منوہرن کے علاوہ کوئی قابلِ ذکر ممبر نہیں ہے۔ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کو جیوتی موئر باسو اور دوسرے مخالف ممبر کمیونسٹ پارٹی آف اندرا کے نام سے پکارتے ہیں، اور یہ بہت حد تک صحیح ہے۔ حکمران کانگریس میں اختلاف کے بعد جب پارٹی کے ساٹھ کے قریب ممبران حزبِ مخالف میں شامل ہو گئے، تو اس وقت کمیونسٹ پارٹی نے اندرا گاندھی کا بھرپور ساتھ دیا۔ وسط مدتی انتخابات میں بھی اندرا کانگریس اور کمیونسٹوں کا آپس میں چناؤ سمجھوتہ ہوا تھا اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ بہت حد تک آج بھی قائم ہے۔

کمیونسٹ گروپ کے لیڈر اندرجیت گپتا، پارلیمنٹ کے سب سے زیادہ سلجھے ہوئے، متوازن اور سنجیدہ گروپ لیڈر ہیں۔ اور اپنی متانت، باوقار شخصیت اور تقریر کے جادو سے مخالفوں کے دلوں میں بھی جگہ پیدا کر لی ہے۔ وہ جیوتی موئر باسو کی طرح بار بار نہیں بھڑکتے۔ اور ان کی بات کو ایوان کا ہر حصہ بڑی سنجیدگی اور احترام سے سنتا ہے۔ ابھی حال ہی میں ایس، ایم، بینر جی (جو پہلے انڈی پنڈنٹ تھے) بھی اس گروپ میں شامل ہو گئے ہیں۔ بینر جی اچھے پارلیمنٹرین ہیں۔ اور بڑے شگفتہ مزاج، وہ ہر مسئلے پر بولتے ہیں اور اکثر بولتے ہی رہتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا برجستہ فقرہ

کہہ دیتے ہیں، کہ سارا ایوان قہقہوں سے گونجنے لگتا ہے۔ پروفیسر ہیرن مکرجی بہت پرانے اور آزمودہ کار ممبر ہیں، وہ جب بولتے ہیں، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آبشار گرج رہے ہیں۔ انہیں انگریزی زبان پر بے پناہ قدرت ہے اور وہ الفاظ کے انتخاب اور اظہار کے آداب میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ وہ کسی خاص خاص موقع پر ہی بولتے ہیں۔ لیکن جب بولتے ہیں تو خاصی توجہ سے سنے جاتے ہیں! کمیونسٹ مارکسسٹ اور کمیونسٹ پارٹی کے درمیان معاصرانہ چشمک اور نظریاتی کشمکش کبھی کبھی کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ اور دونوں ایک دوسرے پر چوٹ کرنے سے نہیں چوکتے۔

کمیونسٹوں کے بعد جن سنگھ کا گروپ، اہم گروپ ہے، لیکن پہلے کے مقابلے میں اب ان کی طاقت اتنی کمزور ہے، کہ اگر اٹل بہاری باجپائی ہار گئے ہوتے، تو پھر اِس پارلیمنٹ میں جن سنگھ کا کوئی نام لیوا نہ ہوتا۔ اس گروپ میں کوئی دوسرا ایسا ممبر نہیں، کہ جو باجپائی جی کی غیر موجودگی میں اپنی جماعت کی نمائندگی کا فریضہ انجام دے۔ ایک کچھوائی جی ہیں۔ لیکن وہ بچارے اپنے ہاں کے بہت سے ممبران اسمبلی کی طرح ان پڑھ ہی دکھائی دیتے ہیں۔ وہ توڑی گئی پارلیمنٹ میں بڑا ہلڑ مچایا کرتے تھے، لیکن اب بدلے ہوئے حالات میں ان پر شریف ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ پارٹی میں کچھ مہاراجے کچھ مہارانیاں بھی ہیں۔ لیکن آج کے دور میں راجوں اور مہاراجوں کی کون سُنتا ہے۔ اس لیے لے دے کے صرف اٹل بہاری جی پر ہی نظر جاتی ہے کہ جو شدھ ہندی میں، اپنے منہ کے زاویے بنا بنا کر اپنی

بات کہہ جاتے ہیں۔

جن سنگھ کے بعد کانگریس اپوزیشن کا درجہ ہے۔اس جماعت کو اِس انتخاب میں سب سے زیادہ مار پڑی، چوں کہ مرار جی ڈیسائی اور شری کامراج کے علاوہ کوئی قابل ذکر لیڈر منتخب ہی نہ ہوسکا، اس لیے پارٹی کی لیڈر شپ شیام نندن مصرا کو سونپ دی گئی۔ مصرا جی کا کام بہت مشکل ہے۔ کیوں کہ مرار جی بھائی اور شری کامراج پارلیمنٹ سے باہر ہی رہتے ہیں۔ وہ ایوان کی کاروائی میں حصہ نہیں لیتے اور نہ ان کے آئندہ حصہ لینے کا کوئی ارادہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ پارٹی اپنی نظریاتی بنیاد کھو چکی ہے۔ اور اسے اب یہ بھی معلوم نہیں، کہ وہ حکمران کانگریس کے زیادہ قریب ہے، یا سوتنتر پارٹی کے۔ نتیجہ یہ کہ یہ پارٹی کسی بھی مسئلے پر کھل کر اپنے موقف کا اظہار نہیں کرتی۔ شیخ صاحب پر پابندی اٹھانے کے لیے ممبران پارلیمنٹ کے میمورنڈم پر دستخط کرانے کی مہم کے سلسلے میں جب میں نے شیام نندن مصرا جی سے دستخط کرنے کے لیے کہا، تو اُنہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا، کہ میں کسی میمورنڈم پر دستخط کرنے میں یقین نہیں رکھتا۔ جب میں نے مرار جی ڈیسائی سے درخواست کی تو اُنہوں نے جواب میں ایک عدد لیکچر جھاڑ دیا۔ جس کا ماحصل یہ تھا، کہ وہ شیخ صاحب کی عارضی جلاوطنی کے قائل نہیں، بلکہ انہیں مستقل طور پر ریاست بدر کرنے کے حق میں ہیں۔ مرار جی کے خیال میں کشمیر میں جمہوریت کے موجودہ ڈھانچے کو ختم کر کے ریاست پر پانچ سال کے لیے صدر جمہوریہ کا راج قائم کیا جانا چاہیے اور وہاں مخالف عناصر کو

بڑی سختی کے ساتھ کچل دینا چاہیے ان کے خیال میں کشمیر کے سبھی سیاستداں کورپٹ اور کنبہ پرور ہیں۔ ہاں بخشی صاحب کے متعلق وہ کچھ حسنِ ظن رکھتے ہیں، لیکن ان کا خیال ہے کہ مسز گاندھی نے انہیں حالیہ پارلیمانی انتخابات میں استعمال کر کے اب رد کر دیا ہے! کانگریس اپوزیشن میں سے صرف سی، سی ڈیسائی نے میمورنڈم پر دستخط کیے!

توڑی گئی پارلیمنٹ میں سوتنتر پارٹی، حزب مخالف میں سب سے بڑا گروپ تھا اور اس میں مسٹر مسانی، پروفیسر رنگا، مسٹر ڈانڈیکر اور مسٹر پیلو مودی جیسے بہترین مقرر اور پارلیمنٹرین تھے۔ اب مسٹر پیلو مودی کے علاوہ اِس پارٹی میں کوئی ڈھنگ سے بات کرنے والا بھی نہیں رہا ہے۔ پارٹی کے لیڈر مسٹر پی، کے دیو نہایت شریف آدمی ہیں۔ لیکن بچارے دو مربوط جملے بھی زبان سے ادا نہیں کر پاتے۔ بمبئی سے دوسرے ممبر مسٹر، جی، ایم، ایچ پٹیل ہیں۔ جو اس سے پہلے غالباً سرکاری ملازم تھے۔ نہایت مہذب، نہایت شریف، لیکن تقریباً گونگے، پی کے دیو اور پٹیل صاحب دونوں ہی اپنی تقریریں لکھ کر لاتے ہیں۔ پیلو مودی کا بھاری بھرکم وجود ساری پارلیمنٹ پر چھایا رہتا ہے۔ وہ بہت اچھے مقرر بے حد حاضر جواب اور بڑے ظریف آدمی ہیں۔ ان کے وجود کی طرح ان کی آواز بھی پورے ایوان پر بھاری رہتی ہے۔ اور جب وہ بولتے ہیں، تو کانگریسی ممبروں کو ان کی بات سننا ہی پڑتی ہے۔ وہ غلط بات بھی اس خوبصورتی اور زور سے کہتے ہیں کہ مزا آجاتا ہے۔ انہیں سوتنتر پارٹی کے فلسفے پر مکمل یقین ہے۔ اور وہ بڑے اعتقاد

کے ساتھ بولتے ہیں۔ جملے بازی اور فقرے کسنے میں ان کا جواب نہیں، لیکن افسوس یہ ہے، کہ وہ ہر چیز کو غیر سنجیدہ بنا دیتے ہیں۔ وہ نہایت عمدہ اور سنجیدہ بات ہی کیوں نہ کہہ رہے ہوں۔ بیچ میں ایسا مزاحیہ فقرہ یا جملہ بول جاتے ہیں کہ ساری تقریر ایک لطیفہ معلوم ہوتی ہے۔ سامعین ہنس تو لیتے ہیں، لیکن کوئی تاثر قبول نہیں کرتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پیلو مودی بہت دلچسپ آدمی ہیں۔ ان کے ایک ایک جملے میں طنز کے نشتر پوشیدہ ہوتے ہیں۔

☆

۱۹۷۱ء

پارلیمنٹ

(۲)

فرینک انتھونی ہندوستان میں اینگلو انڈین آبادی کے نمائندے ہیں۔ جو ہر پارلیمنٹ میں صدر جمہوریہ کی طرف سے نامزد کیے جاتے ہیں۔ وہ نہایت قابل وکیل اور اعلیٰ درجے کے مقرر ہیں۔ پارلیمنٹ کی بجائے اپنا زیادہ تر وقت سپریم کورٹ میں گزارتے ہیں۔ لیکن جب بھی کوئی اہم مسئلہ زیر بحث ہو، اس میں ضرور حصہ لیتے ہیں اور اپنی کمیونٹی کے مفادات کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ اینگلو انڈینوں کا مسئلہ چوں کہ ملک کی دوسری اقلیتوں کے مسائل سے وابستہ ہے، اس لیے فرینک انتھونی کو وقتاً فوقتاً مسلمانوں کی وکالت کرنا پڑتی ہے۔ پچھلی پارلیمنٹ میں احمد آباد کے فسادات کے بعد انہوں نے مسلمانوں کی بے کسی اور بے چارگی اور فرقہ پرستوں کی ریشہ دوانیوں کے متعلق جو زور دار تقریر کی تھی، اس کی وجہ سے وہ ہندوستانی مسلمانوں میں عزت واحترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں آئین میں چوبیسویں ترمیمی بل کی مخالفت کرتے ہوئے انہوں نے ایک بار پھر اقلیتوں کے حقوق کی پرزور مدافعت کی۔ مسٹر انتھونی پارلیمنٹ میں آزاد ممبروں کے ایک گروپ کے لیڈر رہیں۔

اور ایک صاحب ہیں شری شبھن لال سکسینہ، جو آئین ساز اسمبلی کے ممبر بھی رہ چکے ہیں اور ہر بار پارلیمنٹ کے لیے بطور آزاد ممبر کے الیکشن لڑتے آئے ہیں۔ صرف ۱۹۶۲ء کے الیکشن میں ہار گئے۔ اب کی بار پھر منتخب ہوئے ہیں۔ بہت بوڑھے ہو چکے ہیں۔ پارلیمنٹ میں عام طور پر سوتے رہتے ہیں اور جب سوئے نہیں ہوتے، تو اخبار پڑھتے رہتے ہیں۔ پارلیمنٹ میں سونے کی بات آئی ہے، تو آپ کو یہ بھی بتا دوں، کہ بہت سے ممبر، پارلیمنٹ کی کاروائی کے دوران اپنی نشستوں پر سوتے ہی نہیں، خراٹے بھی مارتے ہیں۔ مسٹر سکسینہ کو ہر کمیٹی کے ممبر بننے کا چسکا پڑا ہوا ہے۔ اور وہ ہر کمیٹی کے لیے کاغذات نامزدگی داخل کرتے ہیں۔ بہت ہی ترقی پسند اور انقلابی قسم کے سیاسی کارکن رہ چکے ہیں، لیکن اب بڑھاپے نے کمر توڑ دی ہے۔

پارلیمنٹ کی ایک اور چیز مسٹر سامر گوہا ہیں، گوہا صاحب پیشے کے اعتبار سے پروفیسر اور پارٹی کے اعتبار سے پرجا سوشلسٹ ہیں۔ یہ حضرت بہت بولتے ہیں۔ اگرچہ بے ربط بولتے ہیں۔ آج کل ان پر بنگلہ دیش کا جنون سوار ہے اور ہر بات پر بنگلہ دیش کو بیچ میں لائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ بہت لمبی چوڑی تقریر کرتے ہیں۔ لیکن الفاظ کے سمندر میں گوہر معانی کی تلاش بہت مشکل ہوتی ہے۔ یہ بنگالی ہیں اور انہیں دعویٰ ہے، کہ وہ شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ کام کر چکے ہیں۔ اس لیے ان کے خیال میں بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا ضروری ہے۔ پروفیسر گوہا بزعم خود بڑے آتش بیان مقرر ہیں، لیکن ان کی تقریر میں آتش ہی آتش ہوتا ہے۔ بیان کم۔ پرجا سوشلسٹ پارٹی اور

ایس ایس پی کے ادغام کے بعد اب گوہا صاحب سوشلسٹ پارٹی کے ممبر بن گئے ہیں۔

مخالف بنچوں پر آزاد ممبروں کی صف میں ایک اور قابل قدر ہستی ہیں، مسٹر کرشنا مینن، مسٹر مینن کو دیکھ کر یہ مصرع فوراً زبان پر آجاتا ہے ؎
"کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت عظیم تھی۔" وہ خاص مواقع پر ہی پارلیمنٹ کی کاروائی میں حصہ لیتے ہیں۔ اپنی باری آنے پر ایک عدد تقریر جھاڑتے ہیں۔ اور پھر کہیں گم ہو جاتے ہیں۔ ان کی تقریر میں الفاظ کی یلغار ہوتی ہے، لیکن تاثیر کا کہیں دور دور تک پتا نہیں ملتا ہے۔ یہ وہ توپ ہے کہ جو کثرت استعمال سے ناکارہ ہو چکی ہے۔

ہریانہ کے سابق وزیر اعلیٰ راؤ بریندر سنگھ، یوں تو وشال ہریانہ پارٹی کے نیتا ہیں۔ لیکن چوں کہ اس پارٹی کے صرف وہی ایک ممبر منتخب ہوئے ہیں۔ اس لیے پارلیمانی لغت میں وہ بھی آزاد ممبر ہیں۔ بڑے دلچسپ آدمی ہیں اور جب بھی بولتے ہیں، کوئی نہ کوئی شگوفہ چھوڑ جاتے ہیں۔ بنگلہ دیش سے آئے ہوئے پناہ گزینوں کے متعلق بہت سنجیدہ بحث ہو رہی تھی، اور اکثر ممبر ان کے مسائل کے بارے میں وزیر متعلقہ سے سوال پوچھ رہے تھے کہ راؤ صاحب نے دریافت کیا، کہ پناہ گزینوں کی نس بندی کے لیے کیا اقدامات کیے جا رہے ہیں؟ بڑے زور کا قہقہہ بلند ہوا، اور بحث کا رُخ بدل گیا۔ ایک بار شہری جائیداد پر حد مقرر کیے جانے کا سوال زیر غور تھا، راؤ صاحب نے مطالبہ کیا، کہ بیویوں کی تعداد پر بھی حد مقرر کی جانی چاہیے۔

سرکاری بینچوں پر بیٹھی ہوئی مقتدر شخصیات کا تعارف کرانے سے پہلے جناب سپیکر اور ڈپٹی سپیکر کا تعارف کرانا بہتر رہے گا۔

لوک سبھا کے اسپیکر ڈاکٹر جی، ایس ڈھلون توڑی گئی لوک سبھا کے بھی سپیکر تھے۔ اس سے پہلے وہ پنجاب اسمبلی کے بھی اسپیکر رہ چکے ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ پیدائشی اسپیکر ہیں۔ ڈھلون صاحب حکمران کانگریس میں تفرقے کے بعد لوک سبھا کے اسپیکر منتخب ہوئے، وہ اندرا کانگریس کے نامزد اُمیدوار تھے، اس لیے گزشتہ پارلیمنٹ میں ان کا کام انتہائی مشکل اور نازک تھا۔ ہر وقت ہنگامہ بپا رہتا تھا۔ چوں کہ حکمران جماعت کے مقابلے میں حزب مخالف کی تعداد بہت زیادہ تھی، اس لیے مخالف جماعتیں اکثر اسپیکر پر دباؤ ڈالنے میں کامیاب ہو جاتیں، لیکن یہ بات مسٹر ڈھلون کے حق میں کہی جاسکتی ہے، کہ وہ انتہائی صبر، ضبط اور تحمل سے ایوان کی کارروائی چلانے کی کوشش کرتے رہتے اور اس کوشش میں اکثر کامیاب رہتے۔ ڈھلون صاحب کا Sense of Humour ان کے کام آتا، اور وہ بہت سی سنجیدہ اور رنجیدہ باتوں کو مذاق میں ٹال دیتے۔ موجودہ پارلیمنٹ میں اسپیکر کا کام بہت آسان ہے۔ اور اب انہیں شاذ و نادر ہی کسی طوفان یا بحران کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حکمران جماعت کی بھاری اکثریت ہر نازک مرحلے پر ان کے آڑے آجاتی ہے اور پھر خود ان کے دلچسپ فقرے تناؤ اور کھچاؤ کی کیفیت دور کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اور حزب مخالف کا کوئی ممبر حد سے تجاوز کرنے لگتا ہے، تو ڈھلون صاحب اسے یاد دلاتے ہیں کہ یہ پچھلی

پارلیمنٹ نہیں، نئی پارلیمنٹ ہے، اس بات کا خیال رکھیے، اس وارننگ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ زیادہ بک بک کی تو ایوان سے باہر نکال دیے جاؤ گے۔ ڈھلون صاحب نہایت ہی خوش مزاج، خوش مذاق اور دلچسپ آدمی ہیں پارلیمانی قواعد وضوابط سے بخوبی واقف اور غیر معمولی قوت حافظہ کے مالک، آپ کو یہ سن کر شاید تعجب ہو کہ انہیں پارلیمنٹ کے سوا پانچ سو ممبروں میں سے تقریباً چار سو ممبروں کے نام زبانی یاد ہیں۔ اور جب بھی وہ انہیں پکارتے ہیں۔ ان کے پہلے نام سے پکارتے ہیں۔ پچھلی پارلیمنٹ میں انہیں پانچ کے پانچ سو ممبروں کے نام یاد تھے۔

ڈپٹی اسپیکر مسٹر جی، ایس، سیول میگھالیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ڈپٹی اسپیکر ہونے سے پہلے یہ پارلیمنٹ کے ایک آزاد ممبر تھے اور اپنی علمیت، قابلیت اور صلاحیتوں کی بناء پر ان کا شمار پارلیمنٹ کے ممتاز ترین ممبروں میں ہوتا تھا، گزشتہ پارلیمنٹ میں انہوں نے رباط کے سوال پر مخالف جماعتوں کی طرف سے پیش کی گئی عدم اعتماد کی تحریک پر بحث میں حصہ لیتے ہوئے ایک نہایت عالمانہ تقریر کی۔ اور اندرا سرکار کی بہت موثر وکالت کی۔ بعد میں مسٹر سیول حکمران کانگریس اور مخالف جماعتوں کی حمایت سے ڈپٹی اسپیکر منتخب ہوئے۔ قد وقامت کے اعتبار سے نہایت ہی مختصر سے آدمی ہیں۔ لیکن شرافت، اخلاق اور شائستگی نے ان کے مختصر سے قد کو بہت سی بلند قامت شخصیتوں سے بھی بلند بنا دیا ہے۔

سرکاری بنچوں پر بیٹھی ہوئی شخصیات میں وزیر اعظم شریمتی اندرا

گاندھی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں، یہ نئے انقلاب کی خالق بھی ہیں اور بلاشرکت غیرے مالک بھی۔ جن لوگوں نے انہیں پچھلے سات آٹھ برسوں میں دیکھا ہے انہیں اندازہ ہوگا، کہ پچھلے دو تین سالوں میں یہ کتنی بدل گئی ہیں۔ لال بہادر شاستری کی موت کے بعد جب مسز گاندھی وزیراعظم منتخب ہوئیں تو وہ وزیراعظم ہونے کے باوجود ایک ڈری ہوئی، سہمی ہوئی عورت لگ رہی تھیں۔ وہ تقریر کرنے کے لیے کھڑی ہو جاتیں تو ان کی زبان میں لکنت آجاتی، انہیں بروقت اور برمحل کوئی فقرہ ہی نہیں سوجھتا اور ایسا معلوم ہوتا کہ اس عورت میں کبھی خوداعتمادی پیدا نہیں ہوسکتی۔ مخالفوں کی یلغار دیکھ کر وہ کبھی کبھی گھبرا جاتیں، اور اکثر پارلیمنٹ میں لکھی ہوئی تقریر پڑھ لیتیں۔ جن سنگھ اور ایس ایس پی کے ممبر، جن میں خاص طور پر رام منوہر لوہیا کا نام قابل ذکر ہے، انہیں سخت پریشان کرتے۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے یہ عورت اتنا بدل گئی، کہ آج اسے پہچاننا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ صدر جمہوریہ کے انتخاب پر جب حکمران کانگریس میں پھوٹ پڑ گئی، تو مسز اندرا گاندھی کو اپنے اصل جوہر دکھانے کا موقع مل گیا اور وہ ایک بالکل نئے روپ میں ظاہر ہوگئی۔ اپنے مخالفوں کو قدم قدم پر شکست دے کر وہ اس طوفانی رفتار سے آگے بڑھنے لگیں، کہ ان کے دشمن بدحواس ہوگئے۔ پے در پے کامیابیوں نے ان میں غیر معمولی اعتماد اور حوصلہ پیدا کردیا، اور دیکھتے ہی دیکھتے "گونگی گڑیا" اتنی تیز اور طرار نظر آنے لگیں، کہ بڑے بڑے بولنے والوں کی بولتی بند ہوگئی گزشتہ پارلیمنٹ کے آخری ایام میں مسز گاندھی نے لکھی ہوئی تقریریں

پڑھنا چھوڑ دیں تھیں۔ اور اپنے مخالفوں پر برجستہ اور برمحل فقرے کسنا شروع کر دیے تھے۔

وسط مدتی انتخابات میں ان کی جماعت کی غیر متوقع اور غیر معمولی کامیابی نے مسز گاندھی کو ایک بالکل نئی شخصیت عطا کی ہے۔ اب ان کی ایک ایک ادا سے اعتماد اور وقار ٹپکتا ہے اور وہ وزیر اعظم سے زیادہ ایک حکمران ملکہ دکھائی دیتی ہیں۔ اب وہ پارلیمنٹ میں خاص خاص مواقع پر آتی ہیں اور جب آتی ہیں تو ساری نگاہیں انہی پر جمی رہتی ہیں۔ مخالفوں میں اب کسی کو انہیں ٹوکنے کی ہمت نہیں پڑتی اور حکمران جماعت کے بنچوں پر بیٹھے ہوئے بڑے بڑے جغادری بھی ان سے یوں خوف کھاتے ہیں کہ جیسے پرائمری سکول کے بچے اپنے ہیڈ ماسٹر سے۔ ان کی تقریر میں بڑی روانی آگئی ہے۔ اور بڑی حاضر جواب ہوگئی ہیں۔ وہ جب بولتی ہیں، تو ایوان پر مکمل سکوت چھا جاتا ہے، صرف چند سال پہلے ان کا تمسخر اڑانے والے ممبروں کو بھی اس بات کا اعتراف ہے، کہ مسز گاندھی اپنے باپ سے بھی زیادہ ہوشیار اور باحوصلہ عورت ثابت ہوئی ہیں۔ حکمران جماعت کے تقریباً سبھی ممبروں کو یہ احساس ہے، کہ حالیہ انتخابات میں ان کی کامیابی مسز اندرا گاندھی کی مقبولیت کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ ہے۔ خود مسز گاندھی کو بھی اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ وسط مدتی انتخابات میں کانگریس کی کامیابی ان کی ذاتی کامیابی ہے! اس احساس نے اندرا گاندھی کی طاقت کو بہت بڑھا دیا ہے۔ اور وہ جائز طور پر اپنے آپ کو ہندوستان سمجھنے لگی ہیں۔ مسز گاندھی کے

بارے میں یہ تاثر عام ہوتا جا رہا ہے۔ کہ وہ انتہائی بے رحم اور بے اصول عورت ہیں اور اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے وہ کسی کو بھی قربان کر سکتی ہیں۔ وہ جب کسی سے بدظن ہو جاتی ہیں، تو شرافت، مروت اور دوستی کے تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر اسے قعرِ ذلت میں دھکیل دیتی ہیں۔ ابھی ایک سال پہلے مہاراجہ دنیش سنگھ کے بارے میں یہ خیال تھا کہ وہ مسز گاندھی کے بہت قریب ہیں۔ مسز گاندھی ان سے کسی بات پر ناراض ہو گئیں، تو انہیں نہ صرف وزارت سے محروم کر دیا، بلکہ اب آئے دن ہر ایرا غیرا نتھو خیرا کانگریسی ممبر دنیش سنگھ کی "مزاج پُرسی" کرتا رہتا ہے۔ یہی حال اور بہت سے سابق دوستوں کا بھی ہے۔ افواہ ہے، کہ مسٹر چوان اور جگ جیون رام جیسے سینئر کانگریس لیڈر بھی مسز گاندھی کے سامنے سہمے ہوئے رہتے ہیں، کہ خدا جانے کب ان کی باری آتی ہے۔ بہرکیف، یہ بات طے ہے کہ ۱۹۷۱ء کے انتخابات نے مسز گاندھی کو غیر معمولی توقیر اور استحکام بخشا ہے اور ہندوستان میں جمہوریت کا مستقبل اس بات پر منحصر ہے، کہ مسز گاندھی اس طاقت کو کس طرح اور کس مقصد کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ وہ ہندوستان کی واحد لیڈر ہیں، کہ جنہیں اقلیتوں کا اعتماد حاصل ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ اس اعتماد کو قائم رکھ سکیں گی یا نہیں؟

(باقی آئندہ)

☆

پارلیمنٹ

(۳)

مرکزی کابینہ میں پچاس کے قریب وزیر، وزرائے مملکت اور نائب وزیر ہیں۔ اوران سب سے متعارف ہونا تو الگ رہا، ان کے نام یاد رکھنا بھی مشکل ہے، بہت سے ممبران پارلیمنٹ کو بہت سے وزرائے مملکت اور نائب وزراء سے ملنے یا متعارف ہونے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ اوراس طرح سے یہ پانچ سال کے لیے ایک دوسرے کے لیے اجنبی بنے رہتے ہیں۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں، کہ جو وزیر نہ بھی ہوں، تب بھی اہم ہوتے ہیں اور ہوں تو تب بہت اہم ہوتے ہیں۔ جگ جیون رام اور وائی بی چوان کا شمار ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔

جگ جیون رام موجودہ کابینہ میں وزیر دفاع ہیں۔ اور یہ گردھاری لعل ڈوگرہ کی طرح کم وبیش پچھلے چوبیس سال سے برابر وزیر ہیں۔ انہیں عام طور پر بابو جی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بابو جی بڑے کایاں آدمی ہیں۔ شکل وصورت سے یہ اندازہ ہوتا ہے، کہ بڑے سیدھے اور بھولے آدمی ہیں۔ لیکن سیاسی جوڑ توڑ، داؤ پیچ اور کرتب بازی میں ابھی تک ان کا کوئی ثانی پیدا نہیں ہوا ہے۔ پچھلے چوبیس سال سے ہریجنوں کے نام پر اقتدار سے وابستہ ہیں، اور ہر وزیر اعظم کو ان کی طاقت کا احساس رہتا ہے۔ بابو جی کبھی ہندوستان کے وزیر اعظم بن سکیں گے یا نہیں میں نہیں کہہ سکتا لیکن ہندوستان

کے ہر وزیر اعظم کو بابو جی کی حمایت کی ہمیشہ ضرورت محسوس ہو گی، مسز گاندھی کو جگ جیون رام کی قوت کا احساس ہی نہیں، اندازہ بھی ہے۔ اور اس لیے وہ انہیں ناراض کرنے کی ہمت نہیں کر سکتیں۔ حالاں کہ بہت سے لوگوں کا خیال ہے، کہ وزیر اعظم ان سے پہلے کی طرح بہت خوش نہیں ہیں۔ پارلیمنٹ کے ہریجن ممبروں کے علاوہ بہت سے دوسرے کانگریسی ممبروں پر بھی جگ جیون رام کا بہت اثر ورسوخ ہے۔ اور بہت سے لوگ انہیں مسز گاندھی کے بعد نمبر ایک کا درجہ دیتے ہیں۔ وہ ایک اچھے پارلیمنٹیرین اور اچھے مقرر ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے، کہ انہیں غصہ نہیں آتا۔ آپ کتنی ہی اشتعال انگیزی کیوں نہ کیجیے، وہ مشتعل نہ ہوں گے۔ ان میں ایک ہی بُرائی ہے، کہ وہ اپنے ٹیکس ادا کرنا بھول جاتے ہیں۔ یوں سمجھ لیجیے کہ کل ہند پیمانے پر گردھاری لعل ڈوگرہ ہیں، لیکن فرق یہ ہے، کہ بابو جی بہت قابل، معاملہ فہم اور مردم شناس آدمی ہیں۔ اور گردھاری لعل ڈوگرہ بے حد خود غرض، مطلب پرست اور چار سو بیس آدمی ہے۔

مسٹر چوان وزیر دفاع اور وزیر داخلہ رہ چکے ہیں، اور اب وزیرِ خزانہ ہیں۔ وہ نہایت سنجیدہ اور متوازن سیاستدان ہیں۔ ان کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ ان کا دماغ اندرا گاندھی کے ساتھ اور دل کہیں اور ہے۔ صدارتی انتخابات کے نازک مرحلے پر انہوں نے کچھ دیر کے لیے نجلنگا پا کا ساتھ دیا تھا، لیکن صرف کچھ دیر کے لیے پھر حالات کی نبض دیکھ کر اُنہوں نے مسز اندرا گاندھی کا دامن تھام لیا۔ اور اب وہ ان کے زمرۂ خاص

میں شامل ہیں۔ پورے ملک میں عزت واحترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ وہ غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک اور ایک کامیاب ایڈمنسٹریٹر ہیں۔ ہندوستان میں خزانے کا محکمہ اگرچہ وزرائے خزانہ کی شہرتوں کا قبرستان سمجھا جاتا ہے، لیکن مسٹر چوان نے نہایت مشکل حالات میں بھی اپنی شہرت ابھی تک برقرار رکھی ہے، وہ سوشلسٹ نقطۂ نگاہ کی وجہ سے پارلیمنٹ میں نوجواں سوشلسٹوں کے قائد سمجھے جاتے ہیں۔ میں ذاتی طور پر چوان صاحب کے عقائد سے زیادہ ان کی دِل آویز شخصیت اوران کے حسنِ اخلاق سے متاثر ہوں۔ اور میں ان لوگوں میں شامل ہوں، کہ جوانہیں اندرا گاندھی کے بعد وزیراعظم کے منصب کا اہل سمجھتے ہیں۔

فخرالدین علی احمد عمر اور صحت دونوں کے اعتبار سے ''چراغِ سحری'' ہیں۔ اور وہ اپنی اس منزل پر پہنچ گئے ہیں، کہ جہاں وفادار وزیروں کو گورنر بنا کر جبری طور پر سیاست سے ریٹائر کردیا جاتا ہے۔ مسٹر احمد نے نازک ترین دور میں مسز اندرا گاندھی کا ساتھ دے کر مرکزی کابینہ میں اپنی نشست محفوظ کرالی، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ اب مسز گاندھی کو ان کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ غالباً اسی لیے معین الحق چودھری کو ان جگہ groom کیا جارہا ہے۔ فخرالدین علی احمد آج کل وزیرخوراک ہیں۔ اوراس سال خوراک کے محاذ پر ملک کو غیر معمولی فتوحات حاصل ہوئی ہیں، لیکن اسے مسٹر احمد کی بجائے اچھے موسم کا کرشمہ سمجھا جاتا ہے۔ وہ کابینہ میں ہندوستانی مسلمانوں کی نمائندگی کررہے ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ نہایت مشکل

حالات میں بھی اُنہوں نے اپنا فرض نبھانے کی کوشش کی ہے، لیکن موجودہ حالات میں ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہے!

سردار سورن سنگھ وزیر خارجہ ہیں، اور مرکزی کابینہ کے بہت پرانے ممبر، جس طرح مسلمانوں نے ابھی تک فخرالدین علی احمد سے بہتر اور موزوں نمائندہ پیدا نہیں کیا ہے، اسی طرح سکھوں نے بھی سورن سنگھ جیسا ''سپوت'' ابھی تک پیدا نہیں کیا ہے۔ یہ مسلمان اور سکھ دونوں فرقوں کی قابلیت اور اہلیت پر ایک خاموش، مگر مایوس کُن تبصرہ ہے۔ سردار سورن سنگھ میں غیر معمولی ذہانت یا فطانت کے کوئی آثار نہیں دکھائی دیتے، لیکن صبر وضبط، قوت برداشت اور ثابت قدمی میں ان کا کوئی جواب نہیں۔ ان کے ہونٹوں پر ہر وقت ایک مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے، جو داڑھی کے پردوں کو چیر کر اپنے وجود کا اعلان کرتی ہے۔ انہیں آپ گالیاں بھی دیجیے، تو وہ مسکراتے رہیں گے۔ غالباً ان کی اِسی خصوصیت کی بنا پر انہیں وزیر خارجہ مقرر کیا گیا ہے۔ سردار سورن سنگھ بہت باتیں کرنے اور کچھ نہ کہنے کے فن میں بھی بڑے ماہر ہیں۔ وہ گھنٹوں تقریر کرتے ہیں، لیکن گھوم پھر کر ایک ہی بات کرتے ہیں۔ ان سے ایک نہیں سو سوال پوچھیے، کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اور وہ اپنی بات پر قائم رہیں گے۔ پارلیمانی بحث ومباحثے میں بعض اوقات ایسے نازک لمحات بھی آتے ہیں، کہ جب کوئی شریف آدمی اپنے غصے پر قابو نہیں پا سکتا۔ لیکن سردار صاحب کی زندگی میں ابھی ایسا لمحہ آنا باقی ہے۔ ہندوستان کی خارجہ پالیسی ایک ایسا معمّہ ہے، کہ جسے ابھی تک کوئی حل

کرنے میں کامیاب نہیں ہوا ہے۔ یہ بیک وقت جانبدارانہ اور غیر جانبدارانہ دوستانہ اور دشمنانہ، ترقی پسند اور رجعت پسند ہے۔ سردار سورن سنگھ کی قیادت میں یہ پالیسی جوں کی توں قائم ہے اور جب تک وہ وزیر خارجہ رہیں گے، یہ اِسی نہج پر قائم رہے گی!

ڈاکٹر کرن سنگھ وزیر ہونے کے باوجود بنیادی طور پر مہاراجہ ہی ہیں۔ جہاں تک ان کے محکموں کا تعلق ہے، ڈاکٹر صاحب نے ان کی تنظیم اور ترتیب میں کافی دلچسپی لی ہے۔ اور انہیں ایک نئی شکل دی ہے۔ پارلیمنٹ میں ان کی کارکردگی قابل تعریف ہی نہیں، قابل تقلید بھی ہے۔ انہیں زبان پر بے پناہ قدرت حاصل ہے اور وہ نہایت خوبصورتی کے ساتھ ہر سوال کا جواب دیتے ہیں۔ ڈاکٹر کرن سنگھ سیاحت اور شہری ہوابازی کے وزیر ہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ ابھی تک انہیں اپنے اصلی جوہر دکھانے کا موقع نہیں ملا ہے اور وہ اس سے زیادہ اہم محکموں کے ساتھ انصاف کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب میں ایک برائی ہے، کہ وہ کسی کے کام نہیں آسکتے۔ وہ اپنے آپ پر اس بُری طرح عاشق ہیں، کہ انہیں کسی اور کی طرف دیکھنے کی فرصت نہیں ملتی۔ وہ نرگسیت کا شکار ہیں!

نئے وزراء میں سدھارتھ شنکر رے اور کمارا منگھلم کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان دونوں وزیروں نے آئین کے چوبیسویں ترمیمی بل پر بحث کے دوران اپنی وکالت کا سکہ جمایا۔ دونوں بہت اچھے وکیل ہیں۔ اور دونوں کو مسز گاندھی کا اعتماد حاصل ہے۔ سدھارتھ شنکر رے کو مغربی بنگال کی مملکت

سونپ دی گئی ہے اور کمارا منگھلم کو فولاد کی، اب دیکھیے کہ ترقی پسندوں کی یہ ’’جوڑی‘‘ اپنی اپنی ’’سلطنتوں‘‘ میں کون سا انقلاب بپا کرتی ہے۔

وزرائے مملکت میں شری، کے، سی، پنت، اندر کمار گجرال اور شری اوم مہتہ کا بڑا نام ہے۔ یہ تینوں ۱۹۷۱ء سے پہلے بھی وزیر مملکت تھے۔ شری کے، سی، پنت، گووند ولبھ پنت کے صاحبزادے ہیں، اور ان پر ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات والی مثل صادق آتی ہے۔ بہت ذہین، سلجھے ہوئے اور خوش اخلاق آدمی ہیں۔ ان میں مخالفوں کے حملے کا مقابلہ کرنے، اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے، غلط بات کو صحیح ثابت کرنے اور صحیح بات کو منوانے کی قوت اور صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ میرا اپنا اندازہ ہے، کہ پنت جی بہت آگے جائیں گے۔

اندر کمار گجرال کانگریس کے باضابطہ دو گروہوں میں بٹ جانے کے وقت مسز اندرا گاندھی کے دستِ راست تھے اور اُنہوں نے صدارتی انتخاب کے ہنگامے کے دوران شاندار رول ادا کیا ہے۔ انہیں مسز گاندھی کے کیمپ میں بڑی اہم جگہ حاصل تھی اور بہت سے لوگ ان کے اِس عروج پر رشک کیا کرتے تھے۔ مسٹر گجرال ایک اعلا پائے کے دانشور اور بہترین مقرر ہیں۔ اُنہوں نے کانگریس کے بحران کو ایک نظریاتی اساس عطا کرنے میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ اور وہ ایک اچھے وکیل کی طرح مسز گاندھی کی ہر غلط اور صحیح بات کو قانونی، اخلاقی اور نظریاتی جواز بہم کرتے۔ لیکن ۱۹۷۱ء کے وسط مدتی انتخاب کے بعد مسز گاندھی اتنی مستحکم ہو گئیں، کہ انہیں اپنی طاقت کو

برقرار رکھنے کے لیے کسی نظریاتی یا اخلاقی جواز کی ضرورت ہی نہیں رہی اس لیے اندر کمار گجرال جیسے ساتھی بے کار ہو گئے۔ نئی کابینہ میں مسٹر گجرال کو وزیرِ مملکت تو نامزد کر دیا گیا، لیکن انہیں اطلاعات کے محکمے کی بجائے ہاؤسنگ کا غیر دانشورانہ محکمہ سونپ دیا گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی مسز گاندھی نے انہیں اپنے ''زمرۂ خاص'' سے نکال کر عام وزیروں کی صف میں بٹھا دیا۔ غالب کا ایک شعر اس صورتحال کا بہت اچھا ترجمان ہے۔

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی
سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں

گجرال صاحب غیر معمولی قابلیت اور صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ وہ نوجوان وزیروں میں غالباً سب سے زیادہ پڑھے لکھے اور باشعور وزیر ہیں۔ مسز اندرا گاندھی کے باوجود ان کا مستقبل شاندار ہے۔ مسٹر اوم مہتہ نہ دانشور ہیں، اور نہ اچھے مقرر، لیکن اس کے باوجود انہوں نے حیرت انگیز ترقی کی ہے، وہ بے حد محنتی اور بہت مخلص آدمی ہیں اور انہیں اپنے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ وہ ہر کسی کے کام آتے ہیں۔ اور انہیں لوگوں کی مشکلات اور مسائل حل کرنے میں ایک روحانی سکون محسوس ہوتا ہے۔ مرکز میں ریاست جموں و کشمیر کے تین وزیر ہیں۔ ڈاکٹر کرن سنگھ، اوم مہتہ اور محمد شفیع قریشی۔ لیکن شری اوم مہتہ کے علاوہ کوئی وزیر کسی ریاستی باشندے کو منہ نہیں لگاتا اور شری مہتہ سو کام چھوڑ کر جموں اور کشمیر کے مجبوروں کی مدد کرتے ہیں۔ وزیر مملکت برائے پارلیمانی امور کی حیثیت سے وہ بہت کامیاب ہیں اور

پارلیمنٹ کے اکثر ممبران انہیں اپنا دوست سمجھتے ہیں۔ پارلیمنٹ کے ممبروں کے متعلق عام لوگوں کو بہت سی غلط فہمیاں ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ انہیں پندرہ سو روپے ماہوار تنخواہ، مفت مکان، مفت ٹیلی فون اور ایک عدد سرکاری گاڑی کے علاوہ درجنوں ایسی سہولیات ملتی ہیں، کہ جو جاگیردارانہ نظام میں راجوں، مہاراجوں کو حاصل ہوا کرتی تھیں۔ پارلیمنٹ کا ممبر بننے سے قبل، میں خود بھی اسی غلط فہمی کا شکار تھا۔ اصل صورتحال یہ ہے، کہ ممبر پارلیمنٹ کو ماہانہ صرف پانچ سو روپے تنخواہ ملتی ہے اور سیشن کے دوران ۵۱ روپے یومیہ الاؤنس اسے مکان، بجلی، پانی اور فرنیچر کا کرایہ خود ادا کرنا ہوتا ہے۔ اسے ٹیلی فون کا کرایہ تو نہیں دینا پڑتا، لیکن ایک مقررہ حد سے زیادہ ٹیلی فون کال کرنے کے لیے اُسے اپنی جیب سے پیسے دینا پڑتے ہیں۔ ممبر پارلیمنٹ کو ملک بھر میں ریلوے کے ذریعے مفت سفر کرنے کی مراعت حاصل ہے اور وہ پارلیمنٹ کے اجلاس کے دوران ہوائی جہاز سے بھی سفر کرسکتا ہے۔ ان تمام سہولیات اور مراعات کے باوجود پارلیمنٹ کا ممبر اگر دیانتداری سے اپنے فرائض انجام دینا چاہے، تو موجودہ آمدنی میں اس کا گزارہ یقیناً مشکل ہوگا۔ کم از کم میرا ذاتی تجربہ ہے کہ پارلیمنٹ کا ممبر، سماج کے کم آمدنی والے طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ اور پارلیمنٹ کی ممبری ذریعۂ عزت ہو تو ہو ذریعۂ آمدنی نہیں ہے!

☆

اگر

کہتے ہیں کہ اگر قلوپطرہ کی ناک ۲/۱ انچ چھوٹی ہوتی، تو دنیا کی تاریخ اس سے قطعاً مختلف ہوتی جو ہے۔ اسی طرح تاریخ کا سارا ڈھانچہ ''اگروں'' اور ''مگروں'' پر قائم ہے۔ جموں کے حالیہ واقعات کو ہمارے کالم نویس نے اس ''اگر'' کے پس منظر میں دیکھا ہے.................ادارہ

اگر خدائے قدوس نے شری ترلوچن دت کو سب کچھ دینے کے بعد دو بیٹے نہ دیے ہوتے۔

اگر ان دونوں بیٹوں کو اپنے باپ کے وزیر ہونے کا شدید احساس نہ ہوتا۔

اگر انہیں اس بات کا علم نہ ہوتا کہ جموں و کشمیر موٹر کارپوریشن لاکھوں روپے کی مالک ہے بالفاظ دیگر اگر انہیں یہ معلوم نہ ہوتا کہ ان کے پاس سیاسی اقتدار بھی ہے اور دولت بھی اور اس طرح وہ عوام الناس کو بخشی عبدالرشید اور ان کے حواریوں کی یاد نہ دلاتے۔

اگر پچھلے مہینے وہ ایک فیصلہ کن دن ایک مقامی چرچ کے اندر ناجائز طور پر گھس کر وہاں بیٹھے ہوئے کچھ طالب علموں کو نہیں پیٹتے۔

اگر ملک کا عام قانون حرکت میں آ کر ان سے وہی سلوک کرتا جس کے وہ مستحق تھے۔ یعنی اُنہیں گرفتار کر کے سزا دی جاتی۔

اگر پولیس نے ان کے ساتھ وہی کچھ کیا ہوتا، جو وہ عام طور پر ایسے مجرموں کے ساتھ کرتی ہے۔

تو ستمبر کا وہ سانحہ رونما نہ ہوا ہوتا، جس میں کچھ طالب علموں نے اپنے غم وغصہ کا اظہار کرنے کے لیے جموں وکشمیر موٹر کارپوریشن کی کار جلائی اور پولیس پر پتھراؤ نہیں ہوا ہوتا۔

اگر اس مرحلے پر حکومت نے لوگوں کے جذبات، ان کے مزاج اور ان کے بگڑے ہوئے تیوروں کا اندازہ کر کے شری دت اور ان کے صاحبزادوں کو کانگریس سیکولرازم کی علامت اور طالب علموں کو جن سنگھ اور بخشی غلام محمد کا آلہ کار قرار دینے سے احتراز کیا ہوتا۔

اگر کسی جاہل سیکریٹری نے سب کام چھوڑ کر ایگریکلچر گریجویٹوں کی تنخواہوں کا اسکیل تبدیل کرنے کی سفارش نہ کی ہوتی۔

اگر شری ترلوچن دت نے اپنا استعفیٰ پیش کرتے ہوئے یہ نہ کہا ہوتا کہ وزیر اعلا اور ان کے درمیان شدید اختلافات ہیں بلکہ یہ کہا ہوتا کہ وزیر اعلا نے ان سے مستعفی ہونے کے لیے کہا ہے۔

اگر شری دت کا فرضی استعفیٰ وزیر اعلیٰ تک پہنچنے دیا جاتا اور وہ اسے فوری طور منظور کر لیتے اور اس کی بجائے یہ اعلان نہ کیا گیا ہوتا۔ کہ شری دت کو اپنا استعفیٰ واپس لینے کے لیے رضامند کیا گیا ہے۔

توجموں نے وہ خونین ڈرامہ نہ دیکھا ہوتا، جو ۱۷اور ۱۸/ اکتوبر کو وہاں کھیلا گیا۔

اگر ۱۷/ اکتوبر کو مولانا آزاد کالج کے طالب علموں کو آل انڈیا اسٹوڈنٹس ڈیمانڈس ڈے کے سلسلے میں مظاہرہ کرنے کی اجازت دی گئی ہوتی۔

اگر توی پُل پار کرنے کی اجازت دے کر گاندھی میموریل کالج میں ان کا تعاقب نہ کیا جاتا۔ جہاں کہ وہ مزید طالب علموں کو مشتعل کرنے میں کامیاب ہوئے۔

اگر جیول ٹاکیز کے قریب اس نالے کے پاس اس مشتعل ہجوم کو نہ روک دیا جاتا۔ جہاں بے شمار پتھر جمع تھے۔

اگر قانون اور امن عامہ کے محافظوں نے اس مرحلے پر ذرا سے تدبر، صبر اور تحمل سے کام لیا ہوتا۔

تو نہتے طالب علموں پر فائرنگ کا سیاہ داغ حکومت کے دامن پر نہ لگتا۔

اگر اس خون خرابے کے بعد متعلقہ حکام بدحواس ہو کر اہم سرکاری عمارات کو غیر محفوظ حالت میں نہ چھوڑتے۔

اگر طالب علموں نے ایک لمحے بھر کے لیے بھی یہ سوچا ہوتا کہ سرکاری عمارات جلا کر امن عامہ میں خلل ڈال کر اور قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر وہ دراصل کس کی مدد کر رہے ہیں۔

اگر انہیں اس بات کا احساس ہوتا کہ سرحدوں سے صرف چند میل کے فاصلے پر اس طوفان بدتمیزی کو دیکھ کر کس کے لیے گھروں میں گھی کے چراغ

جلائے جاتے ہیں۔

اگر نوجوان طالب علموں نے چھمب، جوڑیاں، سیالکوٹ اور لداخ کی بلندیوں پر جوانوں اور افسروں کی وہ قربانیاں یاد رکھیں ہوتیں جن کی بدولت آج ہندوستان کا سر فخر سے اونچا ہے۔

اگر انہیں ان مسائل کا ذرہ بھر بھی احساس ہوتا جو آج ملک کو درپیش ہیں تو جموں کے ناخوشگوار حالات کو بڑی آسانی سے ٹالا جا سکتا تھا۔

☆

یہ دلچسپ بات ہے کہ جب تک ہم لوگ پاکستان کی مخالفت اور دوقومی نظریے کی بُرائی کرتے رہتے ہیں، ہم ترقی پسند، سیکولر اور انسان دوست قرار پاتے ہیں۔ لیکن اگر کبھی ہم ہندوستانی مسلمانوں کی حالت زار یا کشمیری مسلمانوں کے ساتھ کی جانے والی ناانصافیوں کا ذکر کرتے ہیں، تو ہمیں فوراً فرقہ پرست، تنگ نظر، متعصب اور پاکستانی قرار دیا جاتا ہے۔ بہرکیف اس میں صرف کشمیری پنڈتوں کا ہی قصور نہیں، یہ سارے ملک کی ذہنیت بن گئی ہے اور اس میں عبدالکریم چھاگلہ جیسے مسلمانوں نے بھی اپنا حصہ ادا کیا ہے۔